بسلسلہ خطبات نور جلد دوم
مکتبۃ الفہیم
خطباء، دعاۃ اور مبلغین کے لئے ایک گراں قدر علمی تحفہ
جمعہ کے خطبے
تالیف
مولانا نورالعین سلفی
استاد حدیث کلیۃ فاطمۃ الزہرا الاسلامیۃ۔ مئو
مکتبۃ الفہیم
مئوناتھ بھنجن یوپی

ISBN. NO:

نام کتاب : جمعہ کے خطبے

تالیف : مولانا نور العین سلفی

طابع وناشر : مکتبۃ الفہیم مئوناتھ بھنجن یوپی

کمپوزنگ : ایاز احمد عالی فہیم کمپیوٹر، مئو

تعداد اشاعت : ایک ہزار ایک سو

سال اشاعت : مئی ۲۰۱۴ء

صفحات : 352

ملنے کا پتہ

مکتبۃ الفہیم ریحان مارکیٹ، ڈھوبیا املی روڈ، صدر چوک مئوناتھ بھنجن

القرآن پبلیکیشنز سری نگر	اسلام ورلڈ بنگلور، چار مینار بک سنٹر بنگلور
اسلامک بک سروس سری نگر	مکتبہ دار السلام سری نگر، مکتبہ مسلم سری نگر
سلفیہ بک شاپ سری نگر، امین بک سینٹر نوگڑھ	مکتبہ المعارف ممبئی، عمری بک ڈپو ممبئی
ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس حیدر آباد	حافظ عبد الخالق صاحب عالیاوی ناندیڑ
دکن ٹریڈرس مغل پورہ حیدر آباد	مکتبہ دار السلام اننت ناگ کشمیر
محفوظ بک ڈپو مالیگاؤں، خیر بک ڈپو ڈمریا گنج	اسلامک بک سینٹر، بنر گٹا، بنگلور
کوہ نور انٹرپرائزز اورنگ آباد	اسلامک انفارمیشن سینٹر کرلا ممبئی

فہرست

☆☆☆

لا إله إلا الله محمد رسول الله

عرض مؤلف

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین وعلیٰ آله وأصحابه أجمعین۔ أما بعد:

مجھ ناچیز پر اللہ کے بے شمار احسانات میں سے اس کا ایک عظیم احسان ہے یہ کہ جمعہ کے خطبوں کا یہ دوسرا مجموعہ! ''جمعہ کے خطبے'' آپ کے ہاتھوں میں ہے اس سے قبل ''خطبات نور'' کے نام سے خطبوں کا ایک مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں آ چکا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ بہت جلد ''خطبات نور'' کو مقبولیت حاصل ہوگئی اور ایک سال کے عرصہ میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ فللّٰہ الحمد اولاً و آخراً

اس دوران احباب اور مخلصین کے گرانقدر مشورے حاصل ہوتے رہے، اکثر احباب نے ''خطبات نور'' کی دوسری جلد کا تقاضا کیا۔ کچھ مخلصین نے ''خطبات نور'' میں چھوٹے ہوئے بعض اہم معاشرتی مسائل اور موضوعات کی طرف توجہ دلائی۔ بعض احباب نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ ''خطبات نور'' کے بعض موضوعات مزید تفصیل اور تشریح کے طالب ہیں۔

یہ مشورے کیا تھے سچ پوچھئے تو ناچیز کی ہمت افزائی تھی۔ اس لئے کہ شائقین کے مشوروں کے بعد ہی یہ اندازہ ہوا کہ کتاب پڑھی جارہی ہے اور قابل لحاظ باتیں نوٹ کی جارہی ہیں۔ تمام احباب کے نیک مشوروں کے احترام کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس علمی اور دینی خیر خواہی پر اجر عظیم اور صحت وعافیت سے نوازے۔ آمین

''مکتبہ الفہیم'' مئو کے ذمہ داران پہلے ہی سے دوسری جلد کے لئے تقاضا کررہے تھے۔ اس تشجیع پر ہمت ہوئی، اللہ نے توفیق بخشی اور کام کی بسم اللہ ہوئی اور یہ دوسرا مجموعہ! ''جمعہ کے خطبے'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ انداز بیان اور اسلوب وہی ہے جو ''خطبات نور'' میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ موضوع کا اثبات قرآن کریم کی آیات اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر قسم قسم کے تکلفات کتنی تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں۔ جو بوجھ اللہ کے نبی ﷺ نے ہماری گردنوں سے اتارا تھا اسے ہم نے شوقِ خودنمائی میں اپنی گردنوں میں ڈال لیا۔ دعوتوں کا اہتمام اور باراتیوں کی مہمان نوازی مسابقت فی الاسراف کی حد کو پہونچی ہوئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب وسنت کا صحیح دین عصر حاضر میں تیزی کے ساتھ پھیلا ہے لیکن ساتھ ہی قسم قسم کی بدعات اور خرافات نے بھی اسی رفتار سے اپنے دست وبازو پھیلائے ہیں۔ اس لئے معاشرے اور عقائد کی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ کی گئی ہے۔

آپ سے گزارش ہے کہ خالی الذہن ہوکر خالص دینی اور منہجی نکتۂ نظر سے مطالعہ کریں۔ ان شاء اللہ تسلی اور تشفی ہوگی۔ صواب اللہ کی جانب سے اور خطا نفس کی جانب سے، لغزشوں پر اطلاع شکریہ کا باعث ہوگی۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ان تمام محسنین کا شکریہ نہ ادا کیا جائے جنھوں نے اس علمی سفر میں کسی بھی طرح کا تعاون اور حوصلہ دیا۔ خصوصاً معروف ومشہور علمی شخصیت شیخ صلاح الدین مقبول کا شکرگزار ہوں کہ موصوف نے اپنے مصروف اور قیمتی اوقات میں سے کچھ وقت نکال کر ''خطبات نور'' کا مطالعہ کیا اور اپنی وقیع تقریظ کے ذریعہ کتاب کو عزت بخشی۔ یہ تقریظ ''خطبات نور'' کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔

''مکتبہ الفہیم'' مئو کو کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے، جس کی علمی سرپرستی نے کتنی دبی ہوئی چنگاریوں کو کریدا، کتنے سوتوں کو جگایا اور کتنی زنگ آلود صلاحیتوں کو جلا بخشی، یہ مجموعۂ خطبات بھی اسی کی کرم فرمائیوں کا رہینِ منت ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ذمہ داران مکتبہ کو منہج سلف پر ثبات اور نیتوں میں اخلاص عطا فرمائے اور ناچیز کی اس حقیر علمی اور دینی خدمت کو شرف قبولیت بخشے اور اس کو میرے لئے، میرے والدین کے لئے اور میرے اساتذہ کے لئے صدقۂ جاریہ وذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

نور العین سلفی
استاد کلیۃ فاطمۃ الزہراء مئو

۱۹/۳/۲۰۱۴ء
۱۷/۵/۱۴۳۵ھ

ایک وضاحت

یہ وضاحت بعض احباب کے مشورے پر ان حضرات کے لئے دی جا رہی ہے جو خود تو خطیب اور عالم نہیں ہیں لیکن کسی عالم کے نہ ہونے کی وجہ سے کتاب دیکھ کر مجبوراً وہ خطبۂ جمعہ کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔

اس علمی بیداری کے زمانے میں بھی یہ شکایت سنی جاتی ہے کہ بعض دیہاتوں میں جمعہ کا خطبہ دینے والے نہیں ملتے، اگر گاؤں میں علماء ہیں بھی تو وہ اپنی ملازمت اور روزی، روٹی کے سلسلہ میں گاؤں سے باہر رہتے ہیں۔ اس لئے مجبوراً خطبۂ جمعہ کی ذمہ داری کسی معمولی اردو خواں کو دیدی جاتی ہے وہ کسی طرح اردو عبارت جو لکھی ہوتی ہے اسے سنا کر خطبہ کا کام نکال لیتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خطبہ کیسے شروع کیا جائے اور کیسے ختم کیا جائے۔ جمعہ میں دو خطبہ ہوتا ہے اس لئے دونوں خطبوں میں ابتداء اور انتہاء کا مسئلہ ہوتا ہے۔ عام طور سے اردو میں جو خطبات کے مجموعے پائے جاتے ہیں ان میں ابتداء اور انتہاء کے بتانے اور لکھنے کا التزام نہیں کیا جاتا۔ ہاں مناظر اسلام مولانا محمد صاحب جوناگڈھی نے ''خطبات محمدی'' میں اور مولانا عبدالسلام صاحب بستوی نے ''اسلامی خطبات'' میں اس کا التزام کیا ہے۔ (رحمہما اللہ) کم پڑھے لکھے لوگوں کو اس سے کچھ آسانی تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن کتاب کی ضخامت بہت بڑھ جاتی ہے اور بار بار چند عبارتوں کا اعادہ لازم آتا ہے اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ کتاب کے شروع میں خطبہ کی ترتیب اور ابتداءِ خطبہ وانتہاءِ خطبہ کے کچھ کلمات اور اذکار لکھ دیئے جائیں۔ تاکہ کتاب سے دیکھ کر خطبہ پڑھنے والوں کو آسانی ہو۔

صحیحین میں اور صحیحین کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں میں کثرت سے روایتوں میں اس کا ذکر تو ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے یا منبر پر بیٹھے پھر

اللہ کی حمد وثناء بیان کی۔ لیکن حمد وثناء کے کیا کلمات تھے اس کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف خطبۂ حاجت میں اس کا ذکر ملتا ہے، اس کے بھی کلمات میں کافی فرق ہے۔ اس لئے ایسا کوئی بھی ذکر جو اللہ کی حمد وثناء پر مشتمل ہو اس سے خطبہ کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ قابل اعتماد بات یہی ہے۔ آگے ہم خطبۂ حاجت کے کلمات سنن ابن ماجہ کے حوالہ سے نقل کریں گے۔ خطبہ کے شروع میں اس کو پڑھا جا سکتا ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ خطبہ کن کلمات پر ختم کیا جائے تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنا خطبہ استغفار پر ختم کرتے تھے۔ (زاد المعاد ج۱ص ۱۸۷)

اس لئے کسی بھی ایسے ذکر پر خطبہ ختم کیا جا سکتا ہے جو دعاء اور استغفار پر مشتمل ہو۔ چند اختتامی اذکار آگے آ رہے ہیں۔

جمعہ میں دو خطبہ ہوتا ہے۔ اس کی دو شکل ہے۔ ایک تو یہ کہ پہلے خطبہ میں صرف خطبۂ حاجت اور سورۂ ق کی تلاوت پر اکتفاء کریں اس کے بعد دعاء اور استغفار کر کے بیٹھ جائیں، تھوڑی دیر بعد دوسرے خطبہ کے لئے کھڑے ہوں اور حمد وثناء کے بعد کتاب کے اندر لکھے ہوئے خطبوں میں سے کوئی خطبہ پڑھیں۔ اور اخیر میں دعاء اور استغفار کے بعد منبر سے نیچے آ جائیں اور بعد اقامت نماز جمعہ ادا کریں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے خطبہ میں خطبۂ حاجت اور سورۂ ق کی تلاوت کے بعد کتاب میں لکھے ہوئے خطبوں میں سے کوئی خطبہ پڑھیں اور کسی نکتہ پر خطبہ بند کر کے بیٹھ جائیں اس کے بعد پھر کھڑے ہوں اور حمد وصلوٰۃ کے بعد حسب ضرورت خطبہ کا باقی حصہ سنائیں اور اخیر میں دعاء اور استغفار کے بعد منبر سے نیچے اتر جائیں اور بعد اقامت نماز جمعہ ادا کریں۔

اب اخیر میں خطبے کی پوری ترتیب ملاحظہ فرمائیں:

پہلا خطبہ

(۱) خطبۂ حاجت۔

(۲) اس کے بعد سورۂ ق کی تلاوت۔

(۳) اس کے بعد اردو خطبہ اور دعاء اور استغفار یا صرف دعاء اور استغفار۔

(۴) اس کے بعد تھوڑی دیر بیٹھنا۔

دوسرا خطبہ

(۱) خطبۂ حاجت یا حمد وصلوٰۃ پر مشتمل کوئی مختصر خطبہ۔

(۲) اردو خطبہ جو باقی رہ گیا ہے۔

(۳) اخیر میں دعاء اور استغفار۔

خطبۂ حاجت مع سورہ ق

"إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ.

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُم مُّسْلِمُوْنَ﴾ (سورہ آل عمران ۱۰۲)

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُم مِّنْ نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَاءً وَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ، إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً﴾ (سورہ نساء:۱)

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْداً، يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيْماً﴾ (سورۃ الأحزاب:۷۰-۷۱) (سنن ابن ماجہ/۱۸۹۲)

أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهُدٰى هُدٰى مُحَمَّدٍ ﷺ وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ" (صحیح مسلم:۸٦۷)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ﴿١﴾ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿٢﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴿٣﴾ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَ عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴿٤﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ﴿٥﴾ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ﴿٦﴾ وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ﴿٧﴾ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿٨﴾ وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ ﴿٩﴾ وَ النَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴿١٠﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿١١﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ﴿١٢﴾ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿١٣﴾ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿١٤﴾ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿١٥﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿١٦﴾ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿١٧﴾ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿١٨﴾ وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿١٩﴾ وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿٢٠﴾ وَ جَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ ﴿٢١﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿٢٢﴾ وَ قَالَ

قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿٢٣﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ﴿٢٥﴾ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿٢٦﴾ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَ لٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ﴿٢٧﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَ قَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿٢٨﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَ مَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿٢٩﴾ يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿٣٠﴾ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿٣١﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿٣٢﴾ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ﴿٣٣﴾ اِدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿٣٤﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿٣٥﴾ وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٣٦﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ ﴿٣٧﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿٣٨﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿٣٩﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿٤٠﴾ وَ اسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٤١﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿٤٢﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ اِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿٤٣﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿٤٤﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿٤٥﴾

اختتامی اذکار

دعاء اور استغفار کے کچھ اذکار نیچے لکھے جارہے ہیں ان میں سے کوئی ایک پڑھ کر پہلا خطبہ ہے تو بیٹھ جائیں اور دوسرا خطبہ ہے تو منبر سے نیچے اتر جائیں۔

۱۔ أَقُولُ قَوْلِي هَذَا ، أَسْتَغْفِرُ اللهَ لِي وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ.

۲۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ، رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُونَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَّحِيْمٌ .

۳. يَغْفِرُ اللهُ لَنَا وَلَكُمْ، وَاللّٰهُ أَعْلٰى وَ أَجَلُّ، وَاللّٰهُ أَعْلٰى وَ أَجَلُّ، وَاللّٰهُ أَعْلٰى وَ أَجَلُّ.

۴. اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَلِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَلِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَلِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَالسَّلَامُ عَلَيكم وَرَحمةُ الله .

۵. إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِيْ الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ، أُذْكُرُوا اللهَ يَذْكُرْكُمْ وَادْعُوْهُ يَسْتَجِبْ لَكُمْ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَعْلٰى وَأَزْكٰى وَأَعَزُّ وَ أَهَمُّ وَأَكْبَرُ.

۶. اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنْ، مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنْ، وأَسْتَغْفِرُ اللهَ، وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيم.

۷. أَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُؤْمِنِيْن، إِنَّه تَعَالٰى جَوَادٌ مَلِكٌ بَرٌّ رَّحِيم. وَالسَّلَامُ عَلَيكم وَرَحمةُ الله وَبركاته.

نوٹ: یہ ساتوں اختتامی اذکار ''خطبات محمدی'' سے ماخوذ ہیں۔

خطباء اور سامعین کی ذمہ داریاں

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بنو تمیم کا جو وفد آیا تھا اس میں عمرو بن اھتم تمیمی بھی تھے، یہ بڑے پائے کے فصیح و بلیغ اور برجستہ گو خطیب تھے، اپنی حاضر جوابی اور جادو بیانی سے بات کا رخ موڑ دیتے تھے، رسول اللہ ﷺ سے جب انھوں نے سحر انگیز گفتگو کی تو آپ ان کی زور بیانی سے بہت متاثر ہوئے اور آپ نے فرمایا: ''إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحراً'' بیشک بعض بیان جادو ہوتا ہے۔ (صحیح بخاری، نکاح/۳۱۴۶)

اس میں شک نہیں کہ جہاں تلوار کام نہیں کرتی وہاں جادو بیانی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ زور خطابت سے ہواؤں کا رخ موڑا جاسکتا ہے، افکار و خیالات کو نیا رنگ دیا جاسکتا ہے۔ گرم کو نرم اور نرم کو گرم کیا جاسکتا ہے۔ زور کلام کی یہ جادوگری اگر خیر کے لئے ہے تو قابل تعریف اور باعث ثواب ہے اور اگر شر کے لئے ہے تو قابل مذمت اور باعث عذاب ہے۔

انبیاء کرام کی زندگی کا اصل مقصد قوم کی رہنمائی، اللہ کے احکامات کی تبلیغ اور تزکیۂ نفس ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ انھیں فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی کا وافر حصہ عطا فرماتا تھا، ان کی ہر بات دل کی آواز ہوتی تھی، ان کی نیتوں میں اخلاص اور سچائی ہوتی تھی، ریاء اور تصنع سے وہ مبرا ہوتے تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں زور اور تاثیر ہوتی تھی۔

علماء کرام اور خطباء عظام انبیاء کرام کے جانشیں اور وارث ہوتے ہیں اس لئے ان کی تقریروں اور خطبوں میں بھی وہی اوصاف ہونے چاہئیں جو انبیاء کرام کے

ہوا کرتے تھے۔ ذیل میں کچھ اوصاف دیئے جارہے ہیں جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں۔

۱۔ خطیب کو خود قدوہ اور نمونہ ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ قول وفعل میں تضاد ہو، کہے کچھ اور کرے کچھ۔

۲۔ نیتوں میں اخلاص اور سچائی ہو، بات دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔

۳۔ ہر بات کتاب وسنت کی روشنی میں ہو اور صحت کے معیار سے گری نہ ہو۔

۴۔ انداز بیان جاذب اور پُر کشش ہو لیکن لفاظی اور موضوعات سے اجتناب ہو۔

۵۔ خطبہ علمی اور پُر مغز ہو، تیاری کے بعد ہوتا کہ ہر ہفتہ قوم کے سامنے کوئی مخصوص پیغام جائے۔

۶۔ خطبہ سامعین کی اصلاح اور تزکیہ کے لئے ہوتا ہے اس لئے ہمیشہ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ سامعین ہمارے مدعو ہیں حریف نہیں ہیں۔

۷۔ خطیب کو متحمل مزاج اور حلیم الطبع ہونا چاہئے، سامعین میں موافق، مخالف ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اگر خطیب میں قوت برداشت نہیں ہوگی تو تنقیدات کو سن کر ذہنی انتشار کا شکار ہو جائے گا اور خطبہ کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

۸۔ تنقید اور تبصرہ سے کوئی بچتا نہیں ہے، سب کو اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے، ایسے وقت میں جہاں صبر وتحمل سے کام لینا ہے وہیں عزم وہمت سے بھی کام لینا ہے، اگر عزیمت واستقامت سے کام نہ لیا جائے تو دعوت وتبلیغ جو انبیاء کرام کا مشن ہے وہ ٹھپ ہو جائے گا۔

۹۔ خطبہ کا موضوع مقتضائے حال کے مطابق ہونا چاہئے۔ یعنی موقع محل اور حالات وضروریات کی پوری رعایت ہو۔

۱۰۔ وقت کا خاص لحاظ رکھا جائے اور محدود وقت میں موضوع کا حق ادا کر دیا جائے۔ ایجاز مخل اور اطناب ممل سے بچنا چاہئے۔

سامعین کی ذمہ داریاں

جیسے علماء اور خطباء کی ذمہ داریاں ہیں ایسے ہی عوام اور سامعین کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ذیل میں بعض ذمہ داریوں کو بیان کیا جا رہا ہے۔ دھیان دیں اور عمل کریں۔

۱۔ جمعہ کے لئے مسجد میں آنے سے پہلے غسل کر لیں، اچھا اور صاف ستھرا کپڑا زیب تن کر لیں، اگر میسر ہو تو تیل یا خوشبو استعمال کر لیں۔

۲۔ جمعہ کے لئے مسجد میں سویرے اذان سے پہلے آئیں تاکہ زیادہ ثواب پائیں۔ خطیب کے ممبر پر بیٹھنے کے بعد آئیں گے تو فرشتوں کے رجسٹر میں آپ کا نام درج نہیں ہوگا۔ اور سویرے آنے کے مخصوص ثواب سے آپ محروم ہو جائیں گے۔

۳۔ دوران خطبہ سامعین کو امام کی طرف رخ کر کے بیٹھنا چاہئے اور پوری توجہ سے خطیب کی بات سننی چاہئے۔

۴۔ خطبہ کے دوران خاموشی سے خطبہ سننے کا حکم ہے، بات کرنا سخت منع ہے یہاں تک کہ اگر کوئی بات کر رہا ہو تو اس کو چپ کرانے کو بھی لغو کام کہا گیا ہے۔

۵۔ اگر دوران خطبہ کوئی آئے تو ہلکی سی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کے بعد بیٹھنے کا حکم ہے۔ نبی ﷺ ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے دوران خطبہ ایک شخص آیا اور سنت پڑھے بغیر بیٹھ گیا تو نبی ﷺ نے اس کو اٹھا کر دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا۔ اس

سے مسئلہ کی اہمیت سمجھی جا سکتی ہے۔

٦۔ گردنیں پھاند کر آگے جانے سے پرہیز کرنا چاہئے اور ساتھ بیٹھے ہوئے دو آدمیوں میں سے کسی کو ہٹانا نہیں چاہئے۔

٧۔ اگر اذان ہو رہی ہو تو آنے والا رک کر اذان کا جواب دے گا، دعاء پڑھے گا۔ اس کے بعد دو رکعت (تحیۃ المسجد) پڑھے گا۔ اس کے بعد بیٹھے گا۔

٨۔ پہلے آنے والوں کو آگے بیٹھنا چاہئے تاکہ بعد میں آنے والوں کے لئے جگہ خالی رہے۔

٩۔ اگر امام کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تو تنقید کا دروازہ نہ کھولئے، سنجیدگی سے افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کریں۔

١٠۔ دعوت دین ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے، اس لئے آپ خطبۂ جمعہ میں جو سنیں اسے اپنے اہل و عیال اور دوست و احباب تک پہنچانے کی کوشش کریں۔

☆☆☆☆

اللہ پر توکل

نکات:

(۱) توکل کی فضیلت

(۲) توکل کب؟

(۳) توکل کی مثالیں اوراس کا ثمرہ

توکل کی فضیلت

اللہ پر توکل اوراعتماد انسانی طبیعت کا ایک ایسا خاصہ ہے کہ جب تک اللہ پر بھروسہ نہ کرلیا جائے اس وقت تک چین اور سکون حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے قرآن پاک میں اوراحادیث رسول میں بار بار توکل کا حکم دیا گیا ہے اور توکل کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

ترجمہ: آپ لوگوں سے مشورہ کرلیا کریں اور مشورے کے بعد جب ارادہ پکا ہوجائے تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اور قدم بڑھایئے بے شک اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَاناً وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾ (الانفال:۲)

ترجمہ: حقیقت میں مومن تو وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان

میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد کرتے ہیں۔

﴿وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجاً، وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْراً﴾ (۶۵/۲،۳)

ترجمہ: جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے چھٹکارے کی شکل پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اس کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے گا تو اللہ اس کو کافی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کر کے رہے گا۔ بے شک اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

﴿قُلْ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ﴾ (الزمر: ۳۹/۳۸)

ترجمہ: اے نبی ﷺ آپ ان سے کہیں، اچھا یہ تو بتاؤ اللہ کو چھوڑ کر جنھیں تم پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کے نقصان کو دور کر سکتے ہیں یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنے کا ارادہ فرمائے تو کیا یہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں؟ آپ کہہ دیں کہ اللہ مجھے کافی ہے، توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں۔

توکل کی فضیلت میں بہت ساری آیتیں قرآن پاک کے اندر ہیں ان میں سے صرف چار آیتیں آپ کو سنائی گئی ہیں۔ پہلی آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے، دوسری آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ پر اعتماد کرنا ایمان کی علامت اور پہچان ہے۔ تیسری آیت میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ جو لوگ اللہ پر توکل کرتے ہیں، اللہ ان کو کفایت کرتا ہے اور ان کی مشکلات کو دور فرماتا ہے۔ چوتھی آیت کے اندر اللہ پر توکل کی ترغیب اور تعلیم

دی گئی ہے۔

اب لیجئے آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کی ایک صحیح حدیث سنائی جارہی ہے سماعت فرمائیں اور توکل کی اہمیت پر غور کریں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حدیث کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میری امت کے ستر ہزار لوگ جنت میں بغیر کسی حساب اور عذاب کے داخل ہوں گے آپ یہ فرما کر اٹھے اور گھر کے اندر چلے گئے آپ کے جانے کے بعد صحابۂ کرام آپس میں تبصرہ کرنے لگے کہ یہ ستر ہزار کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ ستر ہزار وہ لوگ ہوں گے جن کو صحابیت کا شرف حاصل ہوا۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اسلام کی حالت میں پیدا ہوئے نہ کفر وشرک کا زمانہ پایا اور نہ کفر وشرک کیا۔ ان کے علاوہ بھی تبصرے ہوئے۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ نکل کر باہر آ گئے اور فرمایا کیا تبصرہ ہو رہا ہے؟ لوگوں نے بتایا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا! یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ خود جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور نہ کسی سے کرواتے ہیں اور نہ کسی طرح کی بدفالی لیتے ہیں، بس اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ (یہ فضیلت سن کر) عکاشہ بن محصن کھڑے ہوئے اور کہا اللہ کے رسول دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے انھیں لوگوں میں کر دے، آپ نے فرمایا! تم انھیں لوگوں میں سے ہو۔ پھر ایک اور آدمی کھڑا ہوا اور کہا! اللہ کے رسول دعا فرما دیں اللہ تعالیٰ مجھے بھی انھیں لوگوں میں سے کر دے آپ نے فرمایا! عکاشہ تم سے بازی مار لے گئے۔

(صحیح بخاری، طب، باب من اکتوی/۵۷۰۵)

قرآن کی آیات کے ذریعہ یا دعاء ماثورہ کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرنا جائز ہے لیکن اللہ پر توکل اور اعتماد کرنا اس سے اونچا اور افضل مقام ہے اس لئے اللہ پر توکل اور اعتماد کرنے والے کو اور ان لوگوں کو جو بدفالی اور بدشگونی سے پرہیز کرتے

ہیں۔بغیر حساب وکتاب جنت میں جانے کی خوشخبری دی گئی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا جارہا تھا تو انھوں نے یہ دعا پڑھی تھی۔"حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل" ہمیں اللہ کافی ہےاور وہ بہترین کارساز ہے۔ اور یہی دعا نبی ﷺ نے اس وقت پڑھی تھی جب آپ کو ڈرانے کے لئے کافروں نے کہلا بھیجا تھا کہ آپ سے مقابلے کے لئے دشمن بڑی تعداد میں جمع ہیں۔ لہٰذا ان سے ڈریئے۔لیکن آپ اور آپ کے صحابہ ڈرے نہیں بلکہ ان کے ایمان میں مزید پختگی پیدا ہوگئی اور آپ کی زبان مبارک سے یہی دعا نکلی"حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل" مجھے اللہ کافی ہےاور وہ بڑا اچھا کارساز ہے۔(صحیح بخاری،تفسیر سورہ آل عمران۴۵۶۴)

توکل کب؟

ابھی تک آپ کو کتاب وسنت کی روشنی میں توکل کی اہمیت اور فضیلت بتائی جارہی تھی اب آیئے آپ کو بتایا جائے کہ توکل کا مطلب کیا ہے۔اگر کوئی آدمی دوڑ، دھوپ نہ کرے، ہاتھ پاؤں اور عقل ودماغ استعمال نہ کرے اور اپنی اس سستی اور کاہلی کو اللہ پر توکل سے تعبیر کرے۔تو کیا اس کو توکل کہا جائے گا؟ ظاہر ہے یہ توکل نہیں ہے، یہ سستی، کاہلی، لاپرواہی اور غیر ذمہ داری ہے اور یہ اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ حدیث سنئے۔

آیت کریمہ "حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل" کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے مسند احمد، سنن ابوداؤد اور سنن نسائی کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے راوی عوف بن مالک ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے دو آدمیوں کے بیچ ایک فیصلہ کیا تو جس کے

خلاف فیصلہ ہوا تھا اس نے جاتے ہوئے کہا "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ" نبی ﷺ نے کہا! اس آدمی کو واپس بلاؤ (جب آیا تو) آپ نے کہا! ابھی تم نے کیا کہا تھا؟ اس نے کہا میں نے "حسبی اللّٰه ونعم الوکیل" کہا تھا۔ نبی ﷺ نے اس سے کہا: سنو! اللہ تعالیٰ عجز پر ملامت کرتا ہے۔ پہلے اپنی عقل استعمال کرو اس کے بعد اگر مجبور ہو جاؤ (اور اپنا کام نہ کر سکو) تب کہو "حسبی اللّٰه ونعم الوکیل"

جامع ترمذی کی ایک اور روایت سماعت فرمائیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا! اللہ کے رسول توکل کا کیا مطلب ہے؟ پہلے اپنی اونٹنی باندھوں اس کے بعد اللہ پر توکل کروں یا اونٹنی کھلی چھوڑ دوں اور اللہ پر بھروسہ کروں؟ آپ نے فرمایا "اعقلها وتوكل" پہلے باندھو پھر توکل کرو۔ (جامع ترمذی، ابواب القیامۃ، باب نمبر ۲۲ حدیث نمبر ۲۶۳۶)

دو حدیثیں آپ کو سنائی گئی ہیں۔ دونوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پہلے اپنی صلاحیت استعمال کی جائے گی اللہ نے اپنے فضل سے ہمیں عقل اور دماغ، احساس اور شعور عطا فرمایا ہے اس لئے اپنے تمام مسائل میں ہم عقل وشعور کو استعمال کریں گے اور ضرورت پڑنے پر اصحاب الرائے سے اپنے احباب سے مشورہ بھی لیں گے، تمام انسانی وسائل اختیار کرنے کے بعد جب ارادہ کسی ایک معاملہ پر پختہ ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کر کے عملی قدم اٹھائیں گے۔ مستقبل کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس طریق عمل کا نام توکل ہے۔ توکل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ہاتھ پاؤں باندھ کر بیٹھے رہیں اور انتظار کریں کہ لقمہ میرے منہ میں آ جائے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ جانور کھلا چھوڑ دیا جائے گا تو کہیں بھی بھاگ سکتا ہے، گم ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود آپ جانور کھلا چھوڑ کر رکھیں اور کہیں اللہ مالک ہے میں نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے غائب نہیں ہوگا۔ یہ توکل نہیں یہ حماقت اور عجز ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح کے عجز کو پسند

نہیں کرتا۔

اللہ نے دنیا میں اسباب، وسائل اور ذرائع پیدا کئے ہیں اور آپ کو اللہ نے ہاتھ پاؤں اور عقل ودماغ عطا کیا ہے، آپ اسباب ووسائل کو اور اپنے دماغ کو استعمال کریں گے تو اللہ کی سنت جاریہ پر عمل کرنے والے ہوں گے اور اگر اللہ کی سنت سے انحراف کریں گے تو نقصان اور خسارہ اٹھائیں گے اور اللہ کی مدد سے محروم رہیں گے۔ توکل کا یہ مفہوم واضح ہوجانے کے بعد اب ہم آپ کو توکل کی مثالیں دینا چاہیں گے جن سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ اللہ پر توکل کا نتیجہ کیا ہے اور اس کا فائدہ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔

توکل کی مثالیں اور اس کا ثمرہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حدیث کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے بنواسرائیل کے ایک آدمی کا ذکر فرمایا کہ اس نے ایک آدمی سے ایک ہزار دینار بطور قرض طلب کیا۔ اس آدمی نے کہا ٹھیک ہے (قرض دوں گا) لیکن کوئی گواہ لاؤ جو ضرورت پڑنے پر گواہی دے۔ تو قرض مانگنے والے آدمی نے کہا "کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیدًا" اللہ کی گواہی کافی ہے (کیا کروگے کوئی گواہ بناکر) اس نے کہا چلو ٹھیک ہے لیکن کوئی ضامن پیش کرو (کہ ضرورت پڑنے پر میں اس سے طلب کروں) قرض مانگنے والے نے کہا "کَفٰی بِاللّٰہِ کَفِیلًا" اللہ سے بڑھ کر کون ضامن ہوسکتا ہے۔ اس نے کہا صحیح کہتے ہو۔ اس کے بعد اس نے ایک ہزار دینار قرض اس کو دے دیا اور قرض ادائیگی کی ایک مدت مقرر کردی۔ مستقرض کو (تجارت کی غرض سے) سمندر کا سفر کرنا تھا۔ وہ سفر کر کے گیا اور جب قرض ادا کرنے کا وقت آیا تو وہ روپیہ لے کر سمندر کے پاس آیا لیکن وقت پر اس کو کوئی کشتی نہیں مل سکی۔ اور وعدے کا

وقت آ گیا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک لکڑی تلاش کی اور اندر سے اس کی کھدائی کر کے سوراخ کر دیا اور اسی سوراخ میں ایک ہزار دینار اور اپنا ایک خط رکھ کر اچھی طرح بند کر دیا۔ وہ مہر بند لکڑی لے کر سمندر کے پاس آیا اور کہا! اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَعْلَمُ أَنِّي كُنْتُ تَسَلَّفْتُ فُلَاناً أَلْفَ دِينَارٍ فَسَأَلَنِي كَفِيلًا فَقُلْتُ كَفٰى بِاللّٰهِ كَفِيلًا فَرَضِي بِكَ۔ وَسَأَلَنِي شَهِيداً فَقُلْتُ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيداً فَرَضِي بِكَ"

اے اللہ! تو جانتا ہے کہ فلاں شخص سے میں نے ایک ہزار دینار قرض مانگا تھا تو اس نے مجھ سے کہا ضامن پیش کرو، میں نے کہا اللہ سے بڑھ کر ضامن کون ہوسکتا ہے ضمانت کے لئے اللہ کافی ہے وہ تیری ضمانت پر راضی ہوگیا پھر اس نے گواہ طلب کیا، میں نے کہا اللہ کی گواہی کافی ہے وہ اس پر راضی ہوگیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی کشتی مل جائے تا کہ میں اس کا قرض اس کو ادا کردوں لیکن کام نہیں چل سکا۔ دیکھ اس کی امانت تیرے حوالے کرتا ہوں "وَإِنِّي أَسْتَوْدِعُكَهَا" یہ کہہ کر وہ لکڑی جس میں روپیہ اور خط تھا سمندر میں پھینک دیا اور واپس آ گیا۔

چونکہ قرض واپسی کا وقت آ گیا تھا اس لئے قرض دینے والا آدمی بھی انتظار میں تھا کہ شاید کوئی کشتی اس کا روپیہ لے کر آ جائے۔ اسی انتظار میں وہ سمندر کے پاس آیا وہاں نہ کشتی ملی نہ کوئی آدمی ملا اتفاق سے کیا دیکھتا ہے ایک لکڑی بہتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اسی لکڑی میں اس کا روپیہ تھا۔ (لیکن اس کو معلوم نہیں تھا) خیر اس نے جلونی سمجھ کر لکڑی نکال لی۔ جب لکڑی کو چیرا تو اس میں اس کا پیسہ اور ایک خط ملا۔ (اس نے رکھ لیا) پھر کچھ دنوں کے بعد جب کشتی ملی تو وہ آدمی جس نے قرض لیا تھا آیا۔ اور ایک ہزار دینار لے کر قرض دینے والے کے پاس گیا اور بطور معذرت کہا کہ بھائی دیکھئے میں مسلسل کوشش کرتا رہا کہ کوئی کشتی مل جائے اور میں آپ کا قرض واپس کردوں لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا وقت پر نہیں آ سکا۔ جیسے کشتی ملی ہے فوراً آیا ہوں۔

قرض دینے والے نے کہا! اچھا یہ بتاؤ! تم نے میرے پاس کچھ بھیجا ہے؟ اس نے (ہاں کہنے کے بجائے) پھر معذرت کی کہ کشتی نہیں ملی اس لئے وقت پر نہیں آسکا، ملی ہے اور فوراً آیا ہوں۔

خیر قرض دینے والے نے کہا تم نے لکڑی میں بھر کر جو قرض اللہ کے حوالے کیا تھا اللہ نے اسے پہنچا دیا تمہارا قرض ادا ہو گیا۔ چنانچہ وہ ایک ہزار دینار جو دینے کے لئے اس کے پاس آیا تھا، لے کر واپس چلا گیا۔ (صحیح بخاری، کفالہ:۲۲۹۱)

اس حدیث میں بڑے فوائد ہیں، کفالت اور گواہی کا مسئلہ، تجارت اور سمندری سفر کا مسئلہ، ایفاء وعدہ اور ایمان داری کا مسئلہ یہ سارے مسائل قابل توجہ ہیں لیکن سب کو چھوڑ کر ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی اللہ پر توکل اور اعتماد۔

آپ نے سنا کہ قرض دینے والے نے ضابطے کے مطابق کفیل اور گواہ طلب کئے لیکن نہ ملنے پر اللہ پر اعتماد کیا اور اللہ کی کفالت اور گواہی پر راضی ہو گیا۔ ممکن ہے مستقرض کے پاس گواہ اور ضامن نہ رہے ہوں اس لئے اس کی مجبوری تھی اللہ کو گواہ اور کفیل بنا دیا۔ اسی طرح اس نے وقت آنے پر کوشش کی کہ کوئی کشتی مل جائے اور جا کر میں وعدے کے مطابق قرض ادا کر دوں لیکن کشتی نہ ملنے پر اللہ پر اعتماد کیا اور روپیہ لکڑی میں بھر کر سمندر میں پھینک دیا۔ دونوں نے پہلے اسباب، وسائل، اصول، ضابطہ اور عقل استعمال کی۔ اس کے بعد اللہ پر اعتماد کر کے ایک نے قرض دیا اور دوسرے نے اللہ پر اعتماد کر کے روپیہ سمندر میں ڈال دیا۔ اور اللہ نے اسے منزل تک پہنچا دیا۔ جب آدمی کے اندر ایمان ہو، اخلاص ہو، دیانت اور امانت ہو، سچ مچ اللہ پر اعتماد اور بھروسہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسے ہی کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے جیسے بنو اسرائیل کے مذکورہ دونوں شخصوں کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

دوسری حدیث سماعت فرمائیں: نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی

اللہ عنہ کی ہجرت کا مشہور واقعہ حدیث کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے۔ ہجرت کا سفر آپ کے لئے نہایت دشوار اور پر خطر تھا دشمنوں نے آپ کو پکڑنے اور گرفتار کرنے کی ہر تدبیر اختیار کر لی تھی۔ اعلان کر دیا گیا تھا کہ جو آپ کو اور ابو بکر کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو ایک گردن پر سو اونٹ انعام میں دیا جائے گا۔ سنا آپ نے الٹا فیصلہ اور الٹا اعلان سو اونٹ مقتول کی دیت ہے اور یہاں مقتول کو نہیں قاتل کو سو اونٹ انعام دینے کا اعلان ہو رہا ہے۔ بھلا سو اونٹ کی لالچ میں آپ کو قتل کرنے اور آپ کو گرفتار کرنے میں کوئی کسر چھوڑی جا سکتی ہے؟ جس سے جتنا ہو سکا آپ کو تلاش کیا۔ ادھر آپ نے بھی بچنے کی ہر تدبیر اختیار کی۔ رات میں مکہ سے نکلے، تین دن آپ غار ثور میں چھپے رہے اس بیچ عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن ابو بکر آپ کے پاس آتے جاتے رہے لیکن کفار سے بچ بچا کر رات میں آتے اور رات ہی میں سویرے چلے جاتے کسی کو احساس نہیں ہونے دیا کہ یہ لوگ رات کہاں گذارتے ہیں؟ ان ساری تدبیرات کو اختیار کرنے کے باوجود ایک دن کفار مکہ تلاش کرتے کرتے اس غار کی چھت پر آ گئے جس غار میں آپ دونوں چھپے ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کچھ گھبرا گئے اور کہا ''یَا رَسُولَ اللّٰهِ لَو أَنَّ اَحَدَهُم نَظَرَ تَحتَ قَدَمَيه لَأَبصَرنَا، فَقَال ''مَاظَنُّكَ يَا اَبَابَكرٍ بِإِثنَينِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا (متفق علیہ)

اے اللہ کے رسول ﷺ اگر ان میں کا کوئی اپنے قدموں کے نیچے تاک دے گا تو ہم کو دیکھ لے گا۔ آپ نے فرمایا! ابو بکر تمہارا ان دو لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہے''۔

میرے بھائیو! آپ کو بتایا گیا کہ کفار نے ہر تدبیر اختیار کر لی تھی آپ کو گرفتار کرنے کی اور نبی کریم ﷺ نے ہر تدبیر اختیار کر لی تھی اپنے بچنے کی۔ لیکن ساری تدبیر اختیار کرنے کے باوجود کفار آپ کے پاس پہنچ ہی گئے، جہاں ساری تدبیریں ناکام

ہو جاتی ہیں وہاں پر اللہ کا توکل کام کرتا ہے۔ چنانچہ ہوا یہی کہ پہنچنے کے بعد بھی کفار آپ کو نہیں دیکھ سکے اور نہیں پا سکے۔ "وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ"

ایک اور حدیث سماعت فرمائیں! حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ غزوہ ذات الرقاع سے واپس آ رہے تھے، سخت دھوپ اور گرمی کا زمانہ تھا۔ دوپہر میں ہم لوگ ایک وادی میں پہنچے وہاں ببول وغیرہ کے بہت سارے درخت تھے، رسول اللہ ﷺ ایک سایہ دار درخت دیکھ کر وہاں اتر گئے اور اپنی تلوار ایک درخت سے لٹکا کر آرام کرنے لگے۔ دشمن گھات میں تھا۔ چپکے سے آپ کے پاس آیا اور آپ کی تلوار لے لیا اور آپ سے کہتا ہے "مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي" آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے کہا "اللہ" آپ کا یہ کہنا تھا کہ وہ کانپنے لگا اور اس کی تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی، آپ نے فوراً تلوار اٹھالی اور اب آپ نے کہا بتاؤ تم کو مجھ سے کون بچائے گا "مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي" اس کو اللہ پر ایمان تو تھا نہیں کہ اللہ کا نام لے۔ اس نے کہا "كُنْ خَيْرَ آخِذٍ" بھلائی سے پیش آیئے۔ کچھ عہد و پیمان کے بعد آپ نے اس کو معاف کر دیا۔

دیکھئے آپ ایک محفوظ مقام پر تھے وہاں آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری فوج تھی کوئی خوف اور خطرہ نہیں تھا۔ سب لوگ آرام کر رہے تھے آپ بھی آرام کر رہے تھے لیکن گھاتی دشمن اچانک آ گیا۔ اب ایسے وقت میں اللہ پر توکل کام کرتا ہے اور ہوا وہی۔ اللہ کا نام لیتے ہی دشمن کانپنے لگا اور تلوار چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ اللہ پر توکل اپنا کام کر گیا۔

میرے بھائیو! آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اللہ پر توکل کے بغیر قلبی سکون اور اطمینان کبھی نہیں حاصل ہو سکتا لیکن توکل کا مرحلہ تدبیر اور وسائل کے اختیار کرنے کے بعد ہے۔ زندگی میں کبھی ایسا مرحلہ بھی پیش آ جاتا ہے جہاں کوئی حکمت،

تدبیر، کوشش اور ظاہری وسیلہ کام نہیں کرتا ایسے نازک وقت میں اعمال صالحہ کے وسیلے سے دعا کی جاتی ہے اور اللہ پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ حدیث سماعت فرمائیں یہ حدیث، حدیث غار کے نام سے مشہور ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس حدیث کے راوی ہیں۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ گزشتہ زمانے میں تین آدمی (ایک ساتھ جا رہے تھے) اچانک بارش ہونے لگی، بارش سے بچنے کے لئے تینوں ایک غار میں گھس گئے، اوپر سے چٹان گری اور غار کا منہ بند ہو گیا، (اور یہ تینوں اسی غار میں بند ہو گئے) تینوں آپس میں کہنے لگے اس وقت صرف سچائی اور اخلاص ہی ہم کو اس مصیبت سے نجات دے سکتا ہے، لہٰذا ہر کوئی اپنے عمل صالح کے واسطے سے اللہ سے دعا کرے (تاکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نجات دیدے) ان میں سے ایک نے اس طرح دعا شروع کی کہ اے اللہ تو جانتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے چند کیلو دھان پر ایک مزدور رکھا تھا، اس نے کام کیا مگر مزدوری چھوڑ کر چلا گیا، میں نے کیا کیا کہ وہ دھان بو دیا اور اس میں آہستہ آہستہ اتنی برکت ہوئی کہ دھان بیچ کر گائیں خرید لیں، ایک زمانے کے بعد وہ اپنی مزدوری لینے آیا تو میں نے اس سے کہا! دیکھو وہ گائیں سب کی سب تمہاری ہیں انہیں لے جاؤ، اس نے کہا نہیں صرف چند کیلو دھان میرا تمہارے پاس ہے (مجھ سے مذاق مت کرو) میں نے پھر اس سے کہا! یہ سب گائیں تمہاری مزدوری کی ہیں انھیں لے جاؤ۔ خیر وہ انہیں لے کر گیا۔ اے اللہ یہ نیکی اگر میں نے تیرے خوف سے کی تھی تو یہ چٹان یہاں سے ہٹا دے، فوراً چٹان تھوڑی سی سرک گئی۔

دوسرے نے کہا اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میرے والدین بہت بوڑھے ہو گئے تھے، اور میں روزانہ شام کو اپنی بکریوں کا دودھ انہیں سب سے پہلے پلاتا تھا، ایک دن مجھے بکریوں کو گھر لانے میں تاخیر ہو گئی جب میں گھر آیا تو والدین سو گئے

تھے، اور میرے بال بچے بھوک سے شور مچا رہے تھے لیکن میرا معمول یہ تھا کہ اپنے والدین کو دودھ پلانے کے بعد ہی بچوں کو پلاتا تھا، چونکہ اس دن والدین سو چکے تھے اس لئے ان کو جگانا میں نے مناسب نہیں جانا۔ اور نہ پلانا بھی میں نے مناسب نہیں جانا اس لئے کہ اس طرح وہ اور کمزور ہو جائیں گے، لہٰذا میں (دودھ کا پیالہ لے کر ان کے سرہانے ان کے جگنے کا) انتظار کرنے لگا اور اسی انتظار میں صبح ہو گئی۔ اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ یہ نیکی میں نے تیری اطاعت اور تیرے خوف سے کی ہے تو یہ چٹان ہم سے ہٹا دے چٹان اتنی سرک گئی کہ آسمان نظر آنے لگا۔

اس کے بعد تیسرے نے کہا اے اللہ تو جانتا ہے کہ میری ایک چچا زاد بہن تھی اور وہ مجھے بے حد محبوب تھی، میں نے اس کو بہکانا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا اور مجھ سے ایک سو دینار کا مطالبہ کیا، میں نے کسی طرح ایک سو دینار حاصل کر لیا اور لے جا کر اس کو سو دینار دے دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنا نفس میرے حوالے کر دیا۔ پھر جب میں اس کے بیچ بیٹھا (اور زنا کرنا چاہا) تو اس نے کہا "اِتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تَفُضَّ الْخَاتَمِ إِلَّا بِحَقِّهِ" اللہ سے ڈرو اور مہر کو ناحق نہ توڑو (جب اس نے کانپتی زبان سے یہ کہا) تو میں فوراً اٹھ گیا اور سو دینار بھی چھوڑ دیا، اے اللہ! بے شک تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام تیرے خوف اور تیری اطاعت میں کیا ہے۔ لہٰذا تو ہم سے یہ چٹان ہٹا دے۔ اللہ نے ان کی دعا سن لی چٹان ہٹ گئی اور سب لوگ نکل گئے۔ (صحیح بخاری، الانبیاء ۳۴۶۵)

اس حدیث سے جہاں عزت کی حفاظت، زنا سے احتراز، اللہ کا خوف، والدین کی اہمیت اور اضطرار کی حالت میں دعا کی قبولیت جیسے مسائل کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں آدمی ہاتھ پاؤں نہ مار سکے، عقل اور دماغ کام نہ آ سکیں، تمام ظاہری وسائل اور اسباب منقطع ہو جائیں تو وہاں اعمال صالحہ کا وسیلہ اور

اللہ پر توکل کام آتا ہے آپ نے سنا کہ تینوں آدمی غار کے اندر ایسا بند ہو گئے تھے کہ وہاں کوئی حکمت اور کوئی تدبیر نہیں کام کر سکتی تھی اس مجبوری اور اضطراری حالت میں تینوں نے اللہ کی رحمت، شفقت اور لطف وعنایات پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے اعمال صالحہ کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور اللہ نے ان کو مصیبت سے نجات دے دی تینوں غار سے باہر آ گئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اعمال صالحہ کی توفیق دے، ہمارے دلوں میں اپنا خوف اور خشیت پیدا کرے اور ان لوگوں میں حشر فرمائے جو اللہ پر [illegible] اور توکل کرتے ہیں۔ آمین

☆☆☆

وقوعِ قیامت

نکات:

(۱) قیامت کیا ہے؟

(۲) قرآن کریم کا طریقۂ استدلال۔

(۳) عدل کا تقاضا۔

(۴) اللہ کا نظام عدل۔

(۵) ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔

(۶) خلاصۂ کلام۔

قیامت کیا ہے؟

اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے:

﴿يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ، فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ، وَخَسَفَ الْقَمَرُ، وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ، يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ، كَلَّا لَا وَزَرَ، إِلَى رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ، يُنَبَّأُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ، بَلِ الْإِنسَانُ عَلَى نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ، وَلَوْ أَلْقَى مَعَاذِيرَهُ﴾ (القیامۃ: ٦۔١٥)

ترجمہ: (انسان) سوال کرتا ہے قیامت کب آئیگی، (سنو:) جب آنکھیں پتھرا جائیں گی، اور چاند گہنا جائیگا، اور سورج اور چاند جمع کردیے جائیں گے، اس دن انسان کہے گا: آج بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ نہیں: پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہے، آج تو تیرے رب کے پاس ہی ٹھکانہ ہے، آج انسان کو اس کا اگلا پچھلا (عمل) بتادیا جائیگا،

بلکہ انسان خود اپنے آپ کو جانتا ہے اگر چہ وہ معذرتیں پیش کرے۔

کفار مکہ قیامت کا انکار کرتے تھے وہ کہتے تھے مرنے کے بعد ہم سڑ، گل جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے؟ ہماری عقل اسے قبول نہیں کرتی اللہ عزوجل کا ارشاد ہے ﴿أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَاباً ذَلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ﴾ (ق/۳) کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے (تو زندہ کئے جائیں گے) یہ لوٹنا تو (عقل) سے بعید ہے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے استعجاب کا ذکر فرمایا ہے اور پھر اس کا جواب بھی دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ (مومنون/۱۱۵)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے۔

غور کریں تو آسانی سے سمجھ میں آجائیگا کہ ایک شخص پوری زندگی نیکی کرتا رہا، اللہ کے بندوں پر احسان کرتا رہا، کبھی کوئی برائی نہیں کی، ظلم نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود زندگی بھر عسرت اور تنگی میں مبتلا رہا۔ ظالموں کے ظلم کا شکار رہا اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ایک دوسرا شخص ہے جو زندگی بھر برائیاں کرتا رہا۔ کمزوروں پر ظلم کرتا رہا اس کے باوجود زندگی بھر عیش کرتا رہا، تنگی، مصیبت، دکھ اور غم اس نے جانا ہی نہیں کسے کہتے ہیں؟

آپ نے سنا کہ ایک پوری زندگی نیکی کرتا رہا لیکن زندگی بھر وہ نہیں جان پایا کہ آرام کسے کہتے ہیں؟ دوسرا پوری زندگی برائی کرتا رہا اور زندگی ختم ہو گئی لیکن یہ نہیں جان سکا کہ تنگی اور دکھ کسے کہتے ہیں؟ کیا کسی انسان کی عقل یہ ماننے کیلئے تیار ہے کہ نیک کو نیکی کا اور برے کو برائی کا بدلہ نہ ملے؟ اگر یہ مان لیا جائے تو لازم آئیگا کہ دنیا کا

ہر کام اور انسان کا ہر فعل بامعنی اور بامقصد ہو اس لئے کہ انسان کوئی کام بے مقصد نہیں کرتا۔ لیکن بحیثیت مجموعی دنیا کا پورا وجود بے معنی، بے مقصد اور عبث ہو، بحالت ہوش وحواس کوئی انسان نہیں مان سکتا کہ دنیا کا ہر چھوٹا بڑا معاملہ تو بامعنی ہو اور پوری دنیا کا وجود بحیثیت مجموعی عبث اور بے معنی ہو۔ اس لئے یہ ماننا ہی پڑے گا کہ نیکیاں کر کے جو دنیا سے چلا گیا اور اس کو کوئی صلہ نہیں ملا، اس کیلئے کوئی اور دنیا ہو جہاں اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا جائے۔ اسی طرح وہ ظالم جو زندگی بھر زمین کی چھاتی پر دندناتا رہا، غریبوں اور مسکینوں کو مشق ستم بناتا رہا لیکن دنیا سے اپنا وقت پورا کر کے چلا گیا اور اس کو کوئی سزا نہیں ملی، اس کے لئے بھی ایک اور دنیا ہو جہاں اس سے اس کے ظلم کا بدلہ پورا پورا لے لیا جائے۔ یہی عدل اور عقل کا تقاضا ہے۔ اسی کو اللہ پاک نے نہایت جامع لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور کیا تم جزاء اور سزا کے لئے ہمارے پاس نہیں لوٹائے جاؤ گے؟ بلاشبہ ہر شخص اللہ کے حضور پیش کیا جائیگا۔ اسی کا نام قیامت اور آخرت ہے۔

وقوع قیامت کو یقینی بنانے کے لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں کثرت سے اس موضوع کو اختیار فرمایا ہے اور مختلف پیرائے سے اس کو واضح کیا ہے۔ صرف لفظ ''قیامت'' کو مختلف مناسبات سے کم از کم ستر جگہ قرآن پاک میں ذکر فرمایا ہے اس کے علاوہ قیامت کے مفہوم کی تعبیر کیلئے دوسرے کلمات بھی استعمال فرمائے ہیں، مثلاً، ساعة، واقعة، قارعة، حاقة، غاشية، صاخّة، غد، وغیرہ۔

ان کلمات میں بعض ایسے ہیں جو قیامت کی لرزہ خیزی اور ہولناکی کا پتہ دیتے ہیں، قیامت کی ہولناکی کو قرآن پاک میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پڑھئے سورہ عبس کی یہ آیتیں:

﴿فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ، يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ، وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ، وَصَاحِبَتِهِ

وَبَنِيهِ، لِكُلِّ امْرِءٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ﴾ (عبس:۳۳-۳۷)

ترجمہ: پس جبکہ کان بہرہ کر دینے والی (قیامت) آ جائیگی، اس دن آدمی اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا، ان میں سے ہر ایک کو اس دن ایسی فکر (لاحق) ہوگی جو اس کو دوسروں سے بے نیاز کر دے گی۔

سورہ معارج میں اللہ نے قیامت کا نقشہ یوں بیان فرمایا ہے۔

﴿يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ، وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ، وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيماً، يُبَصَّرُونَهُمْ، يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ، وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ، وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ، وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً ثُمَّ يُنجِيهِ، كَلَّا إِنَّهَا لَظَى، نَزَّاعَةً لِّلشَّوَى﴾ (معارج/۸-۱۶)

ترجمہ: (یاد کرو اس دن کو) جس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا، اور پہاڑ رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے، اور کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا، (حالانکہ) ایک دوسرے کو دکھا دیئے جائیں گے، مجرم پسند کرے گا کہ اس دن کے عذاب کے بدلے فدیہ میں دیدے اپنے بیٹوں کو اپنی بیوی اور اپنے بھائی کو اور اپنے کنبے کو جو اس کو پناہ دیتا تھا۔ اور دنیا کے سارے لوگوں کو تا کہ وہ نجات دلا دیں۔ مگر ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ وہ بھڑکنے والی آگ ہوگی اور کھال کھینچ لے گی۔

سورہ عبس اور معارج کی آیات کو بار بار پڑھیئے، دنیا میں جنھیں آپ اپنا سمجھتے ہیں جن کے لئے آپ جان نچھاور کرتے ہیں، ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، بھائی، بہن، بیوی، بچے، کنبہ اور قبیلہ دوست واحباب سب آپ کو نظر آئیں گے لیکن کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا سب پر نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر بھاگیں گے، آپ دنیا کی زندگی میں بھی اس کا تجربہ کر رہے ہوں گے جب کوئی آفت اور مصیبت

آجاتی ہے تو سب کنی کترانے لگتے ہیں کوئی نہیں تاکتا۔ یہی حال اور بڑے پیمانے پر قیامت کے دن ہوگا۔ ہر کوئی پسند کرے گا کہ اپنے باپ، ماں اور دوست، احباب کو فدیہ میں دے دوں اور خود عذاب سے نجات پا جاؤں۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا، وہاں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

قیامت کی تباہی اور ہولناکی کا اندازہ کرنا ہو تو آپ سورہ حج، سورہ تکویر، سورہ انفطار، سورہ انشقاق، کا مطالعہ کیجئے ترجمہ اور تفسیر پڑھئے مزید معلومات ہو جائے گی۔

ہم یہ بتا رہے تھے کہ قیامت کی تعبیر کیلئے اللہ تعالی نے مختلف الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں بعض اس کی ہولناکی کو بتاتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اس کے وقوع کو یقینی بناتے ہیں مثلاً قیامت مستقبل میں آنے والی ہے مگر اس کو ماضی کے صیغے سے بیان کیا گیا تاکہ مخاطب یہ نہ سوچے کہ آنیوالی ہے تو پتہ نہیں آئے گی یا نہیں؟ ماضی کا صیغہ استعمال کر کے اس وہم کو دور کر دیا گیا اور یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ نہ سوچو کہ آئے گی بلکہ اس کا آنا اتنا یقینی ہے کہ سمجھو آ چکی ہے۔ یا مثلاً لفظ ''غد'' سے تعبیر کرنا یہ بھی یقین پر دلالت کرتا ہے ''غد،، کا معنی ہوتا ہے کل آئندہ۔ جس طرح کل کا آنا یعنی جمعہ کے بعد سنیچر کا آنا یقینی ہے اسی طرح قیامت کا آنا بھی یقینی ہے۔ ارشاد ہے:'' وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ '' (الحشر/۱۸) ہر شخص دیکھ لے کہ کل (قیامت) کیلئے اس نے کیا ذخیرہ کیا ہے۔ ''سَيَعْلَمُونَ غَداً مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ،، (القمر:۲۶) کل (قیامت کے دن) انھیں معلوم ہو جائیگا کہ کون جھوٹا اور متکبر ہے۔

قرآن کریم کا طریقۂ استدلال:

کسی عقیدے کے اثبات میں قرآن کریم نظری طریقہ نہیں اختیار کرتا بلکہ

بدیہی اور مسلماتی طریقہ اختیار کرتا ہے یعنی ایسا طریقہ جسے سب مانتے ہوں چنانچہ وقوع قیامت کو سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلماتی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً دنیا یہ مانتی ہے کہ بارش کے قطرے جہاں زمین پر پڑے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، جہاں گھاس اور پودے نہیں تھے وہاں بارش ہوتے ہی زمین ہری بھری ہو جاتی ہے قسم قسم کے پودے اور گھاس نکل آتی ہے اور ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ مردہ زمین کو زندہ ہونے میں کوئی محنت مشقت نہیں کرنی پڑتی، بارش کے چھینٹے پڑتے ہی اپنے آپ سارے پودے نکل آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ٹھیک اسی طرح جب قیامت قائم ہوگی تو انسان بھی اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور ان سب کا ایک ساتھ زندہ کرنا اللہ پر آسان ہے۔ آیت کریمہ سماعت فرمائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْراً بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّى إِذَا أَقَلَّتْ سَحَاباً ثِقَالاً سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاء فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ كَذَلِكَ نُخْرِجُ الْموْتَى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (۷:۵۷)

ترجمہ: وہ اللہ ہی ہے جو اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بطور خوشخبری بھیجتا ہے، وہ ہوائیں (پانی سے) بوجھل بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں پھر ہم اس بادل کو کسی مردہ زمین کی طرف ہنکا لے جاتے ہیں پھر اس سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل پیدا کرتے ہیں، اسی طرح ہم مردوں کو نکال کھڑا کریں گے (یہ مثال اس لئے دی جا رہی ہے) تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔

دیکھئے کتنے واضح الفاظ میں اللہ تعالیٰ ایک مسلمہ قانون کے ذریعہ احیاءِ موتیٰ کے مسئلہ کو سمجھا رہا ہے۔ جہاں بارش ہوئی قسم قسم کے پھل، پودے، غلہ، اناج، چارہ اور گھاس خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی چیز ہے جس کے سمجھانے اور

بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسی پر مردوں کی زندگی کو بھی قیاس کر لینا چاہئے۔
دوسری جگہ ارشاد ہے۔

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ، إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَى، إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (۴۱/۳۹)

ترجمہ: اللہ کی نشانیوں میں سے (ایک نشانی یہ بھی ہے) کہ تم زمین کو خشک (بنجر) دیکھتے ہو پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو وہ حرکت کرتی ہے اور پھول جاتی ہے، بیشک جس نے اس کو زندہ کیا وہی مردوں کو بھی زندہ کرنیوالا ہے بلاشبہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

سورہ زخرف میں اللہ عز وجل کا ارشاد ہے۔

﴿وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ، فَأَنشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتاً، كَذَلِكَ تُخْرَجُونَ﴾ (۴۳/۱۱)

ترجمہ: اور وہ اللہ ہی ہے جس نے ایک اندازہ کے مطابق آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے مردہ شہر (زمین) کو زندہ کیا، اسی طرح تم بھی (قبروں سے) نکالے جاؤ گے۔

سورہ ق میں اسی معنی کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكاً فَأَنبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ. وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ. رِزْقاً لِّلْعِبَادِ، وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتاً، كَذَلِكَ الْخُرُوجُ﴾

ترجمہ: اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا اور اس سے باغات اور کٹنے

والے کھیت کے غلے پیدا کئے اور کھجوروں کے لمبے لمبے درخت جن پر تہ بتہ خوشے ہیں بندوں کی روزی کے لئے۔ اور ہم نے پانی سے مردہ شہر (زمین) کو زندہ کیا اسی طرح (قبروں سے) نکلنا ہوگا۔

ہم نے آپ کو چار آیتیں سنائی ہیں ان چاروں آیتوں میں اللہ تعالی نے احیاء موتی کو ایسی مثال سے سمجھایا ہے جس کا ہم ہمیشہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ کافر، مشرک، مسلم، مومن سب اس حقیقت کو جانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ ہم بدیہی طور پر جانتے ہیں کہ بارش مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے، جہاں ہریالی نہیں ہے وہاں پانی پڑتے ہی زمین ہری ہو جاتی ہے اور اس عمل میں کوئی محنت اور مشقت نہیں ہوتی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ پودوں کو زمین سے نکالتا ہے ٹھیک اسی طرح اللہ تعالی ایک دن مردوں کو ان کی قبروں سے نکالے گا۔ اسی کا نام قیامت ہے۔ اور اللہ پر یہ نہایت آسان ہے۔

اللہ تعالی نے احیاء موتی کے اثبات میں ایک اور مسلماتی طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ یہ کہ آسمان، زمین، چاند، سورج، سمندر اور پہاڑ جیسی عظیم مخلوقات کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اتنی عظیم مخلوقات کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو انسان جس کی حیثیت ان مخلوقات کے مقابلہ میں چیونٹی کی ناک کے برابر بھی نہیں ہے اسکو پیدا کرنے پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے۔ سورہ احقاف کی آیت کریمہ سماعت فرمائیں:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلَى أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَى بَلَى إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (احقاف:۳۳)

ترجمہ: کیا لوگوں نے جانا نہیں کہ وہ اللہ جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے وہ تھکا نہیں وہ مردوں کے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ کیوں

نہیں؟ بلاشبہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

سنا آپ نے! صرف ایک سوال کر کے اللہ تعالیٰ نے احیاء موتی کے مسئلہ کو سمجھا دیا۔ کیا اس سے بہتر اور اس سے زیادہ دل کو اپیل کرنے والی کوئی دلیل ہو سکتی ہے؟

آخرت کی زندگی اور قیامت کے وقوع پر قرآن پاک میں ایک اور مسلماتی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جسے ہم سب جانتے ہیں۔

وہ یہ کہ کسی چیز کا نقش ثانی نقش اول سے آسان اور بہتر ہوتا ہے۔ کوئی کام ایک بار کر لینے کے بعد دوبارہ کرنا آسان ہو جاتا ہے، کفار مکہ دوسری زندگی کا انکار کرتے تھے۔ کہتے تھے جب ہم سڑ گل جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ پیدا کیے جائیں گے؟ یہ بات عقل سے دور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا پہلی بار پیدا کرنا آسان ہے یا دوسری بار؟ ظاہر بات ہے ہماری آنکھوں کے سامنے جتنی زندگیاں ہیں وہ سب اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں اگر اللہ تعالیٰ پہلی بار ان زندگیوں کے پیدا کرنے پر قادر ہے تو دوسری بار بدرجہ اولیٰ قادر ہوگا، ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ پہلی بار پیدا کرنے پر قادر تھا اس کے بعد دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز ہو گیا۔ ارشاد ہے:

(۱) ﴿أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ﴾ (ق:۱۵)

ترجمہ: کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے؟ بلکہ یہ لوگ نئی پیدائش کی طرف سے شک میں ہیں۔

(۲) ﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ (۳۰/۲۷)

ترجمہ: وہ اللہ ہی ہے جو پہلی بار مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ تو اس پر بہت ہی آسان ہے۔

(۳) ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ

يَسِيْرٌ﴾ (۱۹/۲۹)

ترجمہ: کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے مخلوق کی ابتداء کس طرح کی ہے۔ پھر وہ اس کا اعادہ بھی کرے گا۔ اور یہ لوٹانا اللہ پر بہت ہی آسان ہے۔

یہ تین آیتیں آپ کو سنائی گئی ہیں ان کے علاوہ بھی متعدد آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے ایک مسلّم حقیقت کی روشنی میں دوسری زندگی کو سمجھایا ہے۔ جب پہلی بار اللہ تعالی ساری مخلوق کو پیدا کرنے پر قادر تھا تو دوبارہ پیدا کرنے پر بدرجہ اولی قادر ہو گا۔ دیکھئے کتنے سیدھے سادھے لفظوں میں اللہ تعالی نے قیامت اور اخروی زندگی کو ثابت کر دیا۔

وقوع قیامت کے اثبات کیلئے اللہ تعالیٰ نے ایک چوتھا طریقہ بھی اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ نے جوڑے جوڑے پیدا کی ہے اور اللہ کا یہ طریقۂ تخلیق خود اس بات کا متقاضی ہے کہ دنیا کی زندگی کا بھی کوئی جوڑ ہو اور وہ آخرت کی زندگی ہے۔ آیت کریمہ سماعت فرمائیں۔

﴿وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (۵۱/۴۹)

ترجمہ: اور ہر چیز کو ہم نے جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں محترم حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں۔

یعنی ہر چیز کو جوڑا جوڑا، نر اور مادہ یا اس کی مقابل اور ضد کو بھی پیدا کیا ہے، جیسے روشنی اور اندھیرا، خشکی اور تری، چاند اور سورج، میٹھا اور کڑوا، رات اور دن، خیر اور شر، زندگی اور موت، ایمان اور کفر، شقاوت اور سعادت، جنت اور دوزخ، جن وانس وغیرہ، حتی کہ حیوانات (جاندار) کے مقابل، جمادات (بے جان) اس لئے

ضروری ہے کہ دنیا کا بھی جوڑا ہو یعنی آخرت، دنیا کے بالمقابل دوسری زندگی، (تفسیر احسن البیان سورہ ذاریات)

آپ اپنے اعضاء جسم پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ یہاں بھی اللہ نے جوڑے کا نظام رکھا ہے۔ دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھ، دو ناک دو کان، اور دو ہونٹ، ہاں جو اعضاء رئیسہ ہیں انھیں ایک رکھا ہے۔

اور ان کو ایک رکھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حاکم اور سردار ایک ہو گا لہٰذا حاکموں کا حاکم یعنی ''اللہ،، بدرجہ اولی ایک ہے، ہمارے جسم کی معجزاتی ترکیب قیامت کے وقوع اور اللہ کی توحید کی دلیل ہے۔

عدل کا تقاضا:

پہلے ایک خبر سنئے: ''ممبئی (ایجنسی) ۲۶/۱۱ معاملے کی سماعت کر رہی خصوصی عدالت نے آج یہاں کلیدی دہشت گرد مجرم اجمل عامر قصاب کو سزائے موت (پھانسی) دیئے جانے کا حکم صادر کیا ہے۔ ممبئی کے آرتھر روڈ جیل میں بنی سخت حفاظت والی عدالت میں اس معاملے پر اپنا حتمی فیصلہ صادر کرتے ہوئے خصوصی جج ایم ایل تہلیانی نے قصاب کی سزا میں تخفیق (تخفیف) اور سزائے موت کے بجائے سزائے عمر قید دی جانے والی عرضداشت کو مسترد کرتے ہوئے اپنے حکم میں کہا کہ سپریم کورٹ نے سزائے موت تجویز کرتے ہوئے جو رہنمایانہ اصول مرتب کئے ہیں ان اصولوں کے مطابق قصاب کو یہ سزا تجویز کی جا رہی ہے۔

سپریم کورٹ کے مختلف فیصلوں کا ذکر کرتے ہوئے جج تہلیانی نے اپنے حکم میں مزید کہا کہ ''۲۶/۱۱ ممبئی دہشت گردانہ حملے میں کل ۱۷۷/ افراد ہلاک ہوئے تھے

اور متعدد افراد زخمی ہوئے تھے۔ نیز یہ اپنی نوعیت کا نادر معاملہ ہے لہذا ملک کی سب سے بڑی عدلیہ کی ہدایات کے مطابق قصاب سزائے موت کا مستحق ہے۔ جج تہلیانی نے اجمل عامر قصاب کو پانچ معاملات میں سزائے موت تجویز کی۔ جبکہ دیگر پانچ معاملات میں اسے مختلف سزائیں تجویز کی گئیں جن میں چھ ماہ تک کی قید سے لیکر سزائے عمر قید تک شامل ہیں، یہ سزائیں ایک ساتھ جاری کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جج نے سو روپئے سے لیکر دس ہزار روپئے تک مختلف جرائم پر جرمانہ بھی عائد کیا ہے۔ (۷رمئی ۲۰۱۰ جمعہ، بمطابق ۲۱ جمادی الاول ۱۴۳۱۔ راشٹریہ سہارا۔ گورکھپور)

یہ ایک مجرم کی سزا ہے جو ہمارے ملک کی فاضل عدالت نے تجویز کی ہے۔ مجرم کے پانچ معاملات ایسے ہیں جنکی سزا سزائے موت ہے دیگر پانچ جرم ایسے ہیں جن کی سزا چھ ماہ سے لیکر سزائے عمر قید تک شامل ہے، تاوان الگ ہے اور ساری سزائیں ایک ساتھ جاری کرنے کا حکم ہے۔ اب آپ غور کریں کہ کیا پانچ جرم کی سزائے موت اس دنیا میں ممکن ہے؟ بلاشبہ ناممکن ہے۔ ایک ہی جرم کی سزا میں جب اس کی موت ہوگئی تو چار جرم کی سزائے موت اس کے ذمہ باقی رہ گئی۔ عدالت اور جج کے عدل اور انصاف کا تقاضا ہے کہ اس کو پانچ بار موت کی سزا دی جائے لیکن یہ سزا دنیا کی محدود زندگی میں ناممکن ہے یہاں سزائے موت کے ساتھ سزائے عمر قید بھی ہے جب زندگی ہی نہیں رہی تو عمر قید کی سزا کیسے دی جائیگی؟ یہ بھی ناممکن ہے۔

آپ نے سنا عدالت کے انصاف کا تقاضا ہے کہ جرم کے اعتبار سے آدمی کو سزا دی جائے جیسا جرم ہو ویسی سزا۔ ایک قتل کی سزا ایک پھانسی اور ایک سزائے موت لیکن اگر کسی نے پانچ قتل کیا ہے تو پانچ سزائے موت ہوگی عدالت یہی فیصلہ کرے گا۔ لیکن موجودہ دنیا میں عملاً یہ ممکن نہیں۔ اگر کسی جرم کی سزا دس سال ہے، اور مجرم نے

اس کا ارتکاب بیس بار کیا ہے۔ جرم ثابت ہو جانے کے بعد جج فیصلہ کرے گا اس مجرم کو دو سو سال کی سزا دی جائے۔ جرم کی سزا۔۲۰۰ سال ہے اور آدمی کی عمر ۶۰ سال ہے۔ ظاہر ہے آدمی کو جو سزا ہونی چاہئے وہ دنیا میں ناممکن ہے۔ قتل ہے، چوری ہے، زنا ہے، دہشت گردی ہے، بغاوت ہے، غداری ہے، جرائم کی کوئی انتہا نہیں۔ آدمی ایک بار ماخوذ ہوا جبکہ بار ہا اس جرم کا وہ مرتکب رہ چکا ہے اور پکڑا نہیں گیا۔ آخر وہ جرم جس پر پردہ پڑا رہا اس کا مواخذہ ہونا چاہئے یا نہیں؟ آپ کی عقل کیا کہتی ہے؟ دنیا میں تو نہیں پکڑا گیا۔ میرے بھائیو! عقیدۂ آخرت اسی خلا کو پُر کرتا ہے۔ اس خلا کا تقاضا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ ایک ایسی وسیع تر دنیا ہو جہاں آدمی کو طویل، لامحدود زندگی حاصل ہو اور وہاں انصاف کے ساتھ ہر عمل کا پورا پورا بدلہ چکا دیا جائے۔

اللہ کا نظام عدل

کسی مجرم کو یا اس کے جرم کو کیسے پکڑا جائے؟ اس موضوع پر بحث کرنے کی دور حاضر میں کوئی ضرورت نہیں رہ گئی ہے، سٹیلائٹ، جاسوسی طیارے، سی سی کیمرے، ٹیپ، موبائیل، سچ اگلوانے والی مشین اور نہ جانے کتنے ایسے آلات اور مشینیں تیار ہو گئی ہیں جنھیں عام آدمی جانتا بھی نہیں ہے۔ ان مشینوں کے ذریعہ مجرم کو پکڑا جا سکتا ہے، جھوٹ اور سچ میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہم یہاں ان اختراعات اور ایجادات سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتے، ہم آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عدل و انصاف قائم کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے کیا انتظام فرمایا ہے؟ اسے سنئے ارشاد ہے:

(۱) ﴿الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (۳۶/۶۵)

ترجمہ: آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ بات کریں گے اور انکے پاؤں گواہی دیں گے ان کاموں کی جو وہ کرتے تھے۔

(۲) ﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ، مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (۵۰:۱۷،۱۸)

ترجمہ: جب دو لینے والے لے رہے ہوتے ہیں جو دائیں اور بائیں بیٹھے رہتے ہیں۔(انسان) کوئی بات نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک نگہبان تیار رہتا ہے۔

(۳) ﴿حَتَّى إِذَا مَا جَاؤُهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (۴۱:۲۰،۲۱)

ترجمہ: یہاں تک کہ جب وہ جہنم کے بالکل قریب آ جائیں گے تو ان کے خلاف گواہی دیں گے ان کے کان، ان کی آنکھیں، اور ان کی کھالیں، ان اعمال کے بارے میں جن کو وہ (دنیا میں) کرتے تھے۔اور یہ لوگ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے ہمیں اس اللہ نے قوت گویائی عطا کی جس نے ہر چیز کو بولنے کی طاقت بخشی ہے اسی نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔

(۴) ﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (نور:۲۴)

ترجمہ: اس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف ان کے عمل کی گواہی دیں گے۔

آیئے ہم آپ کو صحیح بخاری کی ایک حدیث سناتے ہیں تا کہ مفہوم سمجھنے

میں آسانی ہو۔ حدیث کے راوی سعید بن جبیر ہیں حدیث لمبی ہے، ہم صرف اس کا وہ جز سنا رہے ہیں جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے سعید بن جبیر تابعی ہیں اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص (نافع بن ازرق) نے عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن پاک کی چند آیات کے بارے میں اعتراض کیا ان میں ایک اعتراض یہ تھا کہ قرآن پاک کی ایک آیت ہے ''وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثاً ''، (۴/۴۲) یعنی قیامت کے دن کفار اللہ سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے دوسری آیت ہے۔ ''وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ''، (۶/۲۳) کفار کہیں گے قسم اللہ کی، ہمارے رب کی، ہم مشرک نہیں تھے۔ (حالانکہ مشرک تھے) دو آیتیں ہیں اور دونوں میں بظاہر تعارض ہے ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین قیامت کے دن کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ بول کر اپنے شرک کو چھپا لیں گے۔ پوچھنے والے نے اس تعارض کا جواب پوچھا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباسؓ نے اس کو اس طرح جواب دیا کہ دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، وضاحت اس کی یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مومنوں اور موحدین و مخلصین کے گناہوں کو معاف کر دے گا اور وہ جنت میں چلے جائیں گے تو مشرکین آپس میں مشورہ کریں گے کہ چلو ہم لوگ بھی اللہ کے پاس چلتے ہیں اور کہیں گے کہ ہم لوگ بھی شرک نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی معاف کر دے گا۔ جب یہ لوگ اپنی زبان سے جھوٹ بولیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں کو بند کر دے گا۔ اور ان کے ہاتھ، پاؤں اور چمڑے بولنا شروع کر دیں گے اور شرک کا اعتراف کر لیں گے۔ گویا یہ لوگ اللہ کے پاس جھوٹ بول کر اپنے شرک کو چھپانا چاہیں گے لیکن چھپا نہیں پائیں گے۔ اس لئے کہ زبان سے چھپانا چاہیں گے لیکن ہاتھ پاؤں گواہی دیدیں گے۔ ہم آپ کو

یہ سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہر قول وفعل اور نقل وحرکت کا ریکارڈ تیار کرنے کیلیئے کائنات کے ذرے ذرے میں جذب وانجذاب کا ایسا نظام قائم کر رکھا ہے کہ ہم کوئی کام چھپانا چاہیں اور وہ چھپارہ جائے یہ ناممکن ہے ایک نہ ایک دن اسے ظاہر ہونا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالی نے ہمارے اعضاء جسم ہاتھ، پاؤں اور چمڑے میں بھی ریکارڈنگ کا مادہ رکھا ہے اور قیامت کے روز جب کوئی مجرم، مشرک جھوٹ بولکر بچنا چاہے گا تو جس اللہ نے زبان کو قوت گویائی بخشی ہے وہی اللہ ہاتھ، پاؤں اور چمڑے کو قوت گویائی عطا کردے گا اور وہ حقیقت حال کھول کر رکھ دیں گے۔

میرے بھائیو! قیامت کا دن بڑا کٹھن دن ہوگا جس ہاتھ، پاؤں اور نفس کو آرام اور لذت پہنچانے کے لئے ہم گناہیں کرتے ہیں۔ دوسروں کا حق دبا کر عیش کرتے ہیں، کمزوروں پر ظلم کر کے لذت محسوس کرتے ہیں یہ سارا کیا دھرا، اور کچا چٹھا قیامت کے دن وہی ہاتھ پاؤں کھول کر رکھ دیں گے اور ہم حسرت کے ساتھ تاکتے رہ جائیں گے۔ اس لئے کچھ کہنے اور کرنے سے پہلے انجام کو سوچ لیجئے۔ دنیا کی زندگی عارضی اور چندروزہ ہے اور قیامت کی زندگی دائمی ہے۔ دنیا کی چندروزہ زندگی سے دھوکہ نہ کھائیں۔

ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا

یہ دنیا کی عدالت نہیں ہے جہاں ظلم وزیادتی، ناانصافی اور بے ایمانی کی بھرمار ہے دنیا میں عدل وانصاف کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں ہیں کہیں بیوی اور بچے ہیں کہیں رشتہ اور ناتہ ہے، کہیں قوم اور برادری ہے، کہیں دوست اور احباب ہیں کہیں سورس اور تعلقات ہیں، کہیں ڈر اور خوف ہے، کہیں حرص اور لالچ ہے جو ظلم اور

ناانصافی پر مجبور کرتی ہے، لیکن اللہ کی عدالت ان سب علائق اور عوائق سے پاک ہے اس لئے وہاں انصاف ہی انصاف ہوگا ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔ آیات سماعت فرمائیں۔

(۱)﴿ذَلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾(۳:۱۸۲)

ترجمہ: یہ تمہارے پیش کردہ اعمال کا بدلہ ہے اور اللہ تعالی اپنے بندوں پر ذرہ برابر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

(۲)﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا﴾

(النساء:۴۰)

ترجمہ: بیشک اللہ تعالی ایک ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا اور اگر نیکی ہو تو اسے دوگنی کر دیتا ہے۔

(۳)﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَى وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا﴾ (۴/۷۷)

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کی پونجی بہت تھوڑی ہے، اور پرہیزگاروں کے لئے تو آخرت ہی بہتر ہے، اور تم پر ایک دھاگے برابر ظلم نہ کیا جائیگا۔

(۴)﴿وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا﴾ (۴/۱۲۴)

ترجمہ: ایمان کے ساتھ جو بھی نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور کھجور کی گٹھلی کے شگاف برابر بھی ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔

(۵)﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾(۵۰/۲۹)

ترجمہ: میرے پاس بات بدلی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ذرہ برابر ظلم کرنیوالا نہیں ہوں۔

ان کے علاوہ قرآن پاک میں بہت ساری آیتیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی عدالت میں کسی طرح کا کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ اللہ کے نظام عدل میں یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انصاف کے قیام کے لئے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ اس میں کسی طرح کی نا انصافی، ظلم و زیادتی اور دھاندھلی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ آج دنیا کی عدالت میں کسی مجرم کے سامنے اس کا ٹیپ اور سی، سی کیمرے کے ذریعہ ضبط کی ہوئی اس کی آمد و رفت اور نقل و حرکت کی تصویر دکھادی جاتی ہے تو اس کا ناطقہ بند ہو جاتا ہے۔ قیامت کے دن یہی فلم اور بڑے پیمانے پر مجرم کے سامنے پیش کردی جائے گی۔ اس وقت انسان کہے گا۔ ''این المفر،، کہاں بھاگ کر جاؤں۔ ہر طرف اللہ ہی کی بادشاہی ہوگی۔ یہی نہیں دل اور سینے کا راز بھی کھول دیا جائیگا۔ ''وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُور'' اللہ قیامت کی رسوائی سے محفوظ رکھے۔

خلاصۂ کلام

آج خطبۂ جمعہ میں آپ کو جن باتوں کا سبق دیا گیا ہے، اخیر میں ان کا خلاصہ پیش کر دینا میں مناسب سمجھتا ہوں۔

۱۔ سب سے پہلے قیامت کی ہولناکی اور تباہی کو مختلف آیات کی روشنی میں بتایا گیا۔

۲۔ اس کے بعد آپ کو بتایا گیا کہ اللہ تعالی نے وقوع قیامت کو مختلف انداز سے سمجھایا ہے، کہیں اس طرح سمجھایا گیا کہ جس طرح بارش سے زمین زندہ ہوتی ہے اور پودے نکلتے ہیں اسی طرح تم بھی زندہ ہوگے اور قبروں سے نکلو گے۔ کہیں یہ سوال کر کے کہ پہلی بار پیدا کرنا آسان ہے یا دوسری بار پیدا کرنا؟ کہیں اس طرح سمجھایا

گیا کہ جب دنیا کا نظام ہم نے جوڑے جوڑے رکھا ہے تو دنیا کی زندگی بے جوڑ کیوں رہے گی؟

کہیں اس طرح کہ جب اللہ تعالی آسمان وزمین جیسی عظیم مخلوق کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو بھلا انسان جیسی حقیر مخلوق کو دوبارہ کیوں نہیں پیدا کرسکتا؟

۳۔ اس کے بعد آپ کو یہ سمجھایا گیا کہ عدل کا تقاضا ہے کہ جیسا جرم ویسی سزا۔ اگر جرم پانچ بار سزائے موت کا متقاضی ہے تو عدالت وہی فیصلہ کرے گی۔ اگر جرم ایک ہزار سال کی سزا چاہتا ہے تو جج کے انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ ایک ہزار سال کی سزا سنائے۔ لیکن دنیا کی زندگی اس سزا کے لئے ناکافی ہے۔ اس لئے عدل کا تقاضا ہے کہ ایک ایسی دنیا ہو جہاں عمر غیر محدود ہو اور وہاں ہر ایک کا پورا پورا حق ادا کر دیا جائیگا، اسی کا نام قیامت اور آخرت ہے۔

۴۔ اس کے بعد آپ کو بتایا گیا کہ قیام عدل کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام قائم کر رکھا ہے کہ مجرم اپنے جرم کا انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اگر کرے گا تو خود اس کے ہاتھ، پاؤں اس کے خلاف گواہی دیں گے اور یہ ناممکن ہے کہ آدمی کوئی جرم کرے اور اس کے ہاتھ، پاؤں نہ دیکھیں۔ دنیا میں کسی چیز کی ریکارڈنگ کا جو نظام انسان نے تیار کیا ہے اس سے بہت بڑے پیمانے پر اللہ نے آخرت کے لئے تیار کر رکھا ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دنیا میں ایمان کے ساتھ محتاط اور پاکیزہ زندگی گذارنے کی توفیق بخشے اور قیامت کے دن اپنے نیک اور متقی بندوں کے ساتھ حشر فرمائے۔ جنت کی نعمتوں سے نوازے اور جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

تقلید اور شریعت

نکات:

(۱) تقلید کا معنی۔

(۲) توافق یا تضاد؟

(۳) کھلی تنقید۔

(۴) قابل توجہ۔

(۵) تقلید کا دروازہ کیسے کھلا؟

(۶) دین کہاں سے لیں؟

اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً وَلَوْ شَاء اللّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَـكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُم فَاسْتَبِقُوا الخَيْرَاتِ﴾ (البقرة:۴۸)

ترجمہ: تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے دستور اور طریق عمل مقرر فرما دیا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا (لیکن ایسا نہیں کیا) اس لئے کہ اس نے جو دین تم کو دیا ہے اس میں وہ تم کو آزمانا چاہتا ہے، لہذا تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔

تقلید کا معنی:

ابھی ہم نے آپ کو جو آیت کریمہ سنائی ہے اس پر بحث بعد میں۔ موضوع کی مناسبت سے پہلے تقلید کا معنی اور مفہوم سمجھئے۔ ''تقلید'' عربی لفظ ہے آپ عربی،

اردو، فارسی کوئی بھی لغت اٹھا کر دیکھیں، آپ کو اس کا معنی ملے گا ''گردن میں کوئی چیز لٹکانا،، اسی سے عربی میں ایک لفظ ''قــلادہ'' بولا جاتا ہے، اس کا معنی ''ہار،، ہوتا ہے اس لئے کہ وہ بھی گردن میں لٹکتا رہتا ہے۔

ہم آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کی صحیح حدیث کی روشنی میں تقلید کا معنی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اس سے آپ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور یقین بھی ہوگا اس لئے نبی کریم ﷺ کے فرمان سے بڑھکر کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔

''عَنْ حَفصَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسولَ اللّٰهِ مَا شَأنُ الناسِ حَلُّوا وَلَمْ تَحِلَّ أنتَ؟ قَالَ إنّي لَبَّدتُ رَأسِي وَقَلَّدتُ هَديِىْ وَلَا أُحِلُّ حتَى أحِلَّ مِنَ الحَجِ''

(صحيح بخاري، مناسك، باب فتل القلائد للبدن والبقر/١٦٩٧)

ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا'' کہتی ہیں کہ میں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! کیا بات ہے کہ لوگ حلال ہو گئے اور آپ حلال نہیں ہوئے؟ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے سر کے بالوں کو چپکا لیا ہے اور اپنے قربانی کے جانوروں کو ہار پہنا دیا ہے اس لئے میں حج کرنے کے بعد ہی حلال ہوں گا۔

یہ حدیث پیش کر کے حج اور عمرہ کے مسائل بتانا مقصود نہیں ہے۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ''تقلید،، کا معنی کیا ہے؟ عرب میں پہلے یہ دستور تھا کہ لوگ مکہ میں قربانی کیلئے جانور بھیجتے یا ساتھ لیکر جاتے تو اس جانور کی گردن میں جوتے کا ہار لٹکا دیتے تا کہ ہار دیکھ کر لوگ جان جائیں کہ یہ قربانی کا جانور ہے اور مکہ جا رہا ہے۔ لوگ اس کو چارہ پانی دے کر راستے پر لگا دیتے اور وہ آہستہ آہستہ مکہ اپنی جگہ پہنچ جاتا۔ چونکہ اس دستور میں کوئی قباحت نہیں تھی اس لئے نبی کریم ﷺ نے اپنے جانوروں کو بھی ہار پہنا دیا تھا اور اسکی تعبیر کے لئے آپ نے جو لفظ استعمال کیا وہ ''قلدت'' ہے، یہ لفظ

''تقلید،، سے بنا ہے تقلید کا لغوی معنی ابھی آپ کو بتایا گیا۔ اصطلاحی معنی یوں بیان کیا جاتا ہے ''بغیر دلیل کسی کی رائے کو قبول کرنا،، لغوی اور اصطلاحی معنی میں اگر مناسبت تلاش کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ جانور کی گردن میں پٹہ اور ہار پہنا کر جس طرح اطاعت کرائی جاتی ہے اسی طرح مقلد بھی اپنی گردن میں کسی کی اطاعت کا پٹہ ڈال لیتا ہے اور اس کی اطاعت کرتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تقلید کرنا اور مقلد کہلانا آپ کو زیب دیتا ہے یا نہیں؟ آپ کو یہ خلجان ہو رہا ہو گا کہ ہم عربی نہیں جانتے قرآن وحدیث نہیں سمجھ سکتے اس لئے کسی سے پوچھنے اور اس کی تقلید کرنے پر مجبور ہیں۔

میرے بھائیو! یہ خلجان میں اسی منبر پر بارہا دور کر چکا ہوں اور آج پھر ان شاء اللہ اگر وقت رہا تو خطبہ کے اخیر میں اس پر روشنی ڈالی جائیگی۔

توافق یا تضاد؟

فی الحال آپ اس پہلو پر غور کریں کہ اسلام اور تقلید میں توافق ہے یا تضاد؟ آپ جانتے ہیں کہ انبیاء کرام صلوٰت اللہ علیہم کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ وہ انسانوں کی عقلوں پر تالا چڑھا دیں، ان کی قوتِ ادراک سلب کر لیں؟ آباء واجداد کی تقلید اور مانوس روایات سے مزید چپکا دیں؟ بلکہ ان کو اس لئے بھیجتا تھا کہ قوم کو بیدار کریں اور ان کو اس کا اہل بنائیں کہ وہ اپنی مانوس روایت پر نظر ثانی کریں، سماجی دین اور تقلیدی جمود کو توڑیں، احساس وشعور کو بیدار کریں، متحرک اور نشیط بنائیں؟ لیجئے میں قرآن وحدیث سے دلیل پیش کرتا ہوں، سنئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ اسلام اور تقلید میں توافق ہے یا تضاد؟ اسلام تقلید کو واجب کرتا ہے یا اس کو مٹانا چاہتا ہے؟ کیا

ہے اسلام کی منشا؟

شروع میں آپ کو جو آیت کریمہ سنائی گئی تھی اس کی طرف آیئے۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ اللہ کا دین ایک ہے تمام انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا دین ایک تھا، دعوت ایک تھی یعنی ''اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ'' (اعراف:۶۵) تم سب ایک اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہر نبی کی یہی دعوت تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کی شریعت میں اختلاف رکھا یعنی حلت وحرمت کے مسائل اور عبادت کے طریقے مختلف تھے۔ مثلاً بنی اسرائیل کیلئے مال غنیمت کا کھانا حرام تھا اور ہمارے لئے حلال ہے، اونٹ کا گوشت ان کے لئے حرام تھا ہمارے لئے حلال ہے، وہ صرف عبادت خانوں میں اللہ کی عبادت کر سکتے تھے۔ اور ہمارے لئے پوری زمین مسجد ہے جہاں وقت ہو جائے نماز پڑھ لیجئے۔ اسی طرح عبادات کے طریقوں میں بھی فرق تھا۔

شریعتوں میں فرق رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ بعد میں آنیوالے نبی کے ذریعہ پہلی شریعت کو منسوخ کر دیا گیا، اس لئے کہ ایک ہی طریقے پر نسل در نسل عمل کرنے سے عبادت کا صرف ایک ڈھانچہ رہ جاتا ہے اور اسکی روح نکل جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ تقلیدی اور بے جان عمل کسی طرح مطلوب نہیں ہے۔ اس لئے مذہبی جمود اور تقلیدی ذہن کو بدلنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے شریعتوں میں نسخ کا سلسلہ رکھا اور اسی کو اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں ابتلاء اور آزمائش سے تعبیر کیا ہے۔ ''لیبلو کم فیما آتاکم،، یعنی جو دین تم کو دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے۔ آزمائش کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب آبائی دین اور روایتی طریق عمل کو چھوڑ کر نیا طریق عمل اختیار کرنا پڑتا ہے تو ایسے وقت میں آدمی کی فکر کو دھکا لگتا ہے آدمی اپنے آبائی عمل کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا لیکن اگر

آدمی کا ضمیر زندہ ہے، احساس وشعور بیدار ہے، فکری قوتیں جاگ رہی ہیں تو اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرتا ہے اور تقلید و جمود کی زنجیریں توڑ کر نئی شریعت کو قبول کر لیتا ہے، مفادات اور مصلحتیں، رشتہ اور ناتا، قوم اور برادری اس کے فیصلے میں حائل نہیں ہوتیں، وہ بے پناہ عزم وارادے کے ساتھ آبائی دین کی زنجیر توڑ کر نئے دین میں داخل ہو جاتا ہے، اور اگر جمود و تعطل کا شکار ہے، احساس اور ضمیر مردہ ہے فکری صلاحیتوں پر تالا چڑھا ہوا ہے تو ایسا آدمی اپنے آبائی دین سے چپکا رہتا ہے اور یہ چیز اللہ کو مطلوب نہیں ہے، اسی تقلیدی جمود کو توڑنے اور احساس وشعور کو بیدار کرنے کے لئے اللہ تعالی نے انبیاء کرام کی شریعتوں میں فرق رکھا اور نسخ کا سلسلہ جاری کیا۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ اسلام تقلید کو واجب کرتا ہے یا اس کو مٹانا چاہتا ہے۔

یہی بات تحویل قبلہ کی آیت میں بھی بتائی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ﴾ (البقرة:۱۴۳)

ترجمہ: جس قبلہ پر تم پہلے تھے اس کو ہم نے صرف اس لئے بنایا تھا کہ ہم یہ جان لیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے۔

اللہ کو اپنی عبادت مطلوب ہے جس رخ بھی کی جائے وہ سب جانتا ہے

﴿وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾ (البقرة:۱۱۵)

ترجمہ: مشرق اور مغرب کا مالک اللہ تعالی ہی ہے تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے۔

پھر قبلہ کی تحدید اور اسکی تنسیخ سے اللہ کو کیا مطلوب ہے؟ آیت کریمہ میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی کہ اللہ تعالی جاننا چاہتا ہے کہ کون رسول کے حکم کی اتباع کرتا ہے

اور کون نیا حکم پا کر انکار کرتا ہے اور اپنے آباء واجداد کی تقلید کی طرف پلٹ جاتا ہے؟ گویا پہلے قبلہ کو منسوخ کر کے اور دوسرے قبلے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کس کا احساس وشعور بیدار ہے اور کس کی فکر پر تقلید کا تالا چڑھا ہوا ہے۔ اگر آدمی کا ضمیر بیدار ہے تو بے تکلف رسول کی اتباع کرے گا اور اگر دماغ کی گرہیں بند ہیں تو اپنے آباء واجداد کے روایتی دین سے چپکا رہے گا۔ ایسے وقت میں اتباع اور عدم اتباع کا راز کھل جائیگا۔ اب آپ آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ نسخ کا مقصد تقلیدی جمود کو توڑنا ہے تو پھر تقلید دین کا جز کیسے ہو سکتی ہے۔ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ کتاب وسنت میں تقلیدی ذہن کو کس طرح بدلا گیا ہے اور اس پر کھل کر کس طرح تنقید کی گئی ہے۔

کھلی تنقید

آپ جانتے ہیں کہ آدمی جس ماحول اور معاشرے میں آنکھ کھولتا ہے اس سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر معاشرے میں کوئی ایسی غلط رسم پائی جارہی ہے جس کا غلط ہونا سورج کی طرح واضح ہے تو بھی آدمی اسے غلط کہنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ غلط سمجھنے کی طرف اس کا ذہن ہی منتقل نہیں ہوتا۔ لیکن ہے غلط۔ ایسی کچھ رسمیں عہد رسالت میں بھی ماضی سے چلی آرہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر کھل کر تنقید کی اور اس کا خلافِ واقعہ اور غلط ہونا بذریعہ وحی ثابت کیا۔ مثلاً عرب میں جاہلی روایت کے مطابق ایک رسم یہ چلی آرہی تھی کہ جس کو بیٹا نہیں ہوتا عموماً وہ کسی دوسرے کے لڑکے کو اپنا منہ بولا بیٹا (لے پالک) بنالیتا، اور وہ حقیقی بیٹے کا درجہ اختیار کر لیتا، جس طرح حقیقی بیٹے کو باپ کی طرف نسبت کر کے

بلاتے ہیں اسی طرح اس لڑکے کو غیر حقیقی باپ کی طرف نسبت کرتے اور جس طرح حقیقی بیٹا اپنے باپ کا وارث ہوتا اسی طرح غیر حقیقی بیٹا اپنے مجازی باپ کا وارث ہوتا۔ یہ جاہلی رسم ابتداءً اسلام میں بھی باقی تھی۔ زید بن حارثہ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اور آپ کو نہایت محبوب تھے چنانچہ عرب رواج کے مطابق آپ نے ان کو منہ بولا بیٹا بنالیا یہاں تک کہ صحابۂ کرامؓ حضرت زیدؓ کو زید بن محمد (ﷺ) کہہ کر بلانے لگے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"أن زيد بن حارثة مولى رسول الله ﷺ ما كنا ندعوه إلا زيد بن محمد حتى نزل القرآن (أُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ)

(صحیح بخاری، تفسیر سورہ احزاب/۴۷۸۲)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ زید بن حارثہ جو رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے ان کو ہم لوگ زید بن محمد (ﷺ) کہہ کر بلاتے تھے۔ یہاں تک کہ قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ نازل ہوگئی (أُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ) یعنی ان (لے پالکوں) کو ان کے باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ۔ اللہ کے نزدیک یہ زیادہ انصاف کی بات ہے۔

جو بیٹا نہیں ہے اسکو حقیقی بیٹا بنا دینا اور جو حقیقی باپ نہیں ہے حقیقی باپ کہنا اور غیر حقیقی بیٹے کو اس کا وارث قرار دینا اتنی واضح اور فاش غلطی ہے جس کو بتانے اور سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے، باپ، باپ ہے اور بیٹا، بیٹا ہے جو باپ نہیں ہے وہ باپ نہیں ہوسکتا اور جو بیٹا نہیں ہے وہ بیٹا نہیں ہوسکتا۔ لیکن اتنی موٹی بات پورے معاشرے کو سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور اس غلط رسم پر سیکڑوں سال سے عمل ہوتا آرہا تھا۔ اسلام، اہل اسلام کو ہشیار اور بیدار مغز رکھنا چاہتا ہے چنانچہ اس فاش غلطی پر کھلی تنقید کی گئی اور بذریعہ وحی آبائی تقلید کا جمود توڑا گیا اور بتایا گیا کہ ''لے پالکوں'' کو ان کے حقیقی باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ، اللہ کے نزدیک یہی پورا انصاف ہے۔

اور سنئے! عرب جاہلیت سے ایک رسم چلی آرہی تھی جسے ''ظہار،، کہا جاتا ہے۔
ظہار کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو یوں کہے ''أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّي،، تم میرے نزدیک میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح میری ماں میرے لئے حرام ہے ایسے ہی تم بھی میرے لئے حرام ہو۔ عرب معاشرے میں ایسا کہہ دینے سے بیوی شوہر کیلئے حرام ہو جاتی، جس طرح طلاق سے جدائی ہو جاتی ہے اسی طرح ظہار سے بھی شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ہو جاتی تھی، یہ رسم نسل در نسل عرب معاشرے میں چلی آرہی تھی اور اس پر عمل بھی ہو رہا تھا جبکہ اس کی غلطی بالکل واضح تھی لیکن کسی کا ذہن اسکی طرف نہیں منتقل ہو رہا تھا۔ قرآن پاک میں اس غلطی پر زبردست تنقید کی گئی، جب حضرت خولہ رضی اللہ عنہا سے ان کے شوہر اوس بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ نے ظہار کیا تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

﴿الَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنكُم مِّن نِّسَائِهِم مَّا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ إِنْ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ﴾ (مجادلہ:۲)

ترجمہ: تم میں جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ (بیویاں) ان کی مائیں نہیں ہیں ان کی مائیں تو وہ ہیں جنھوں نے ان کو پیدا کیا ہے۔

بیوی کو ماں کہنا بالکل کھلی غلطی ہے، لیکن کسی کا ذہن اسکی طرف نہیں جا رہا تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ لوگ رسم ورواج کی بندشوں اور آباء واجداد کی تقلید میں جکڑے ہوئے تھے، ذہنی جمود اتنا غالب تھا کہ سوچنے کی صلاحیت سلب ہو گئی تھی۔ انھیں یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یا اپنی زبان سے بول رہے ہیں اس کا حقیقت سے کچھ تعلق ہے بھی یا نہیں؟ اسلام اس تقلیدی ذہن اور جامد مزاج کو پسند نہیں کرتا، اسلام ایک حقیقت پسند دین ہے وہ گرد وغبار کو صاف کرتا ہے، احساس وشعور کو بیدار کرتا ہے، بیوی کو ماں کہنا کھلا ہوا جھوٹ اور نہایت گندی بات ہے اسے کھول کر بتایا گیا۔ اگر کسی نے ایسی غلط اور گندی بات زبان سے نکال دی تو وہ مجرم ہے اور اسکی

سزا یہ ہے کہ ظہار کا کفارہ ادا کرے اس کے بعد بیوی حلال ہوگی۔

ایک مثال حدیث سے بھی سماعت فرمالیں۔ یہ حدیث آپ کو صحیح بخاری مناسک اور ابواب العمرہ میں مل جائیگی ہم حدیث کا مفہوم آپ کو سنائیں گے۔

عرب کے بعض قبیلے خصوصاً انصارِ مدینہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا حرام سمجھتے تھے بلکہ اسے "افجر الفجور فی الارض" یعنی دنیا کا سب سے بڑا گناہ کہتے تھے۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ اس لئے اس کی بھی اصلاح کی گئی۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع میں جب مکہ پہنچے تو آپ نے اعلان کر دیا کہ جو قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہیں لایا ہے وہ اپنے حج کا احرام توڑ کر عمرہ کا احرام باندھ لے اور عمرہ کر کے حلال ہو جائے۔ خلاف معمول اور خلاف توقع یہ فرمان سن کر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ لوگ حیص بیص میں پڑ گئے کہ اب کیا کریں؟ باپ دادا سے تو یہ سنتے اور دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ حج کے ایام میں عمرہ کرنا حرام ہے اور آپ کا حکم ہے کہ عمرہ کر کے حلال ہو جاؤ۔ ان کے سامنے تین استحالہ تھا۔

۱۔ ایک تو یہ کہ باپ دادا کی تقلیدی رسم ٹوٹ رہی تھی۔

۲۔ دوسرے یہ کہ عمرہ کر کے حلال ہونیکا مطلب یہ ہوا کہ اپنی بیویوں کے پاس بھی جائیں، لذت جماع اور عبادت حج کا یہ قرب دماغ نہیں قبول کر رہا تھا۔ دونوں میں بُعد ہونا چاہیئے۔

۳۔ خود نبی کریم ﷺ عمرہ کر کے حلال نہیں ہو رہے تھے اس لئے کہ آپ قارن تھے، قربانی کا جانور ساتھ لائے تھے، اسلیئے آپ بیچ میں حلال نہیں ہو سکتے تھے۔ آپ کا خود حلال نہ ہونا اور صحابہ کرام کو حلال ہونے کا حکم دینا لوگوں کے لئے مزید رکاوٹ کا سبب بن رہا تھا۔ چنانچہ صحابہ کا تامل دیکھ کر آپ نے فرمایا:

لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِی مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا أَهْدَيْتُ وَلَوْ لَا أَنَّ مَعِيَ الْهَدْىَ لَأَحْلَلْتُ۔ (صحیح بخاری، ابواب العمرۃ)

یعنی جو بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی اگر پہلے معلوم ہوگئی ہوتی تو میں قربانی کا جانور ساتھ نہیں لاتا۔ اگر میرے پاس قربانی کا جانور نہیں ہوتا تو میں بھی حلال ہو جاتا۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرام ہیں (رضی اللہ عنہم) اطاعت سے انحراف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن رسم ورواج کی بندش اتنی مضبوط ہوتی ہیکہ اول مرحلہ میں صحابہ کرام کو بھی تأمل ہوگیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کا اضطراب دیکھا، ان کا اعتراض سنا لیکن آپ نے شریعت کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور برسوں کا تقلیدی جمود آپ نے توڑ دیا (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

میرے بھائیو! آیات اور احادیث کی روشنی میں آپ کو یہ سمجھایا جارہا ہے کہ آبائی اور روایتی دین اور تقلیدی جمود کو اسلام کسی حال میں پسند نہیں کرتا بلکہ اسے نسخ کے ذریعہ، شریعتوں کی تبدیلی کے ذریعہ، جاھلی رسم ورواج کی اصلاح کے ذریعہ مٹانا اور ختم کرنا چاہتا ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کریں کہ اسلام میں اندھی تقلید کی کوئی گنجائش ہے؟

قابل توجہ

ہمارے اپنے معاشرے میں بھی تقلیدی مزاج کے نتیجے میں بعض ایسی غلطیاں جگہ پا گئی ہیں کہ ان کی نکارت کو لفظوں میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان سے کتاب وسنت کی توہین اور حق سے انحراف ٹپکتا ہے۔ اس کے باوجود ہمیں ان کے غلط ہونے کا احساس نہیں ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ملک کے بعض صوبوں اور شہروں میں ختنہ کے مقام کو سنت کہا جاتا ہے۔ طلبہ آپ سے چھٹی لینے آئیں گے، آپ پوچھیں گے کیسی چھٹی؟ کہیں گے: دوا لینے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ آپ پوچھیں گے: کیا ہوا ہے؟ کہیں گے: سنت پر کھجلی ہوئی ہے۔ غور فرمایئے: ''سنت،، کتنا پاکیزہ لفظ ہے اور اس کا کیا معنی اور مفہوم ہے؟ سنت۔ نبی کریم ﷺ کے قول و فعل کو کہا جاتا ہے اس کا کتنا اونچا مقام اور مرتبہ ہے؟ دین کی بنیاد سنت نبوی پر قائم ہے لیکن نادانی میں یا قصداً ہم نے ختنہ کے مقام کو سنت کہنا شروع کر دیا اور کبھی ہمارا ذہن اسکی قباحت کی طرف نہیں گیا۔ آج بھی نہیں جا رہا ہے۔ یہ سنت نبی کی کھلی ہوئی توہین ہے، اس سے توبہ کرنا چاہئے۔

آپ جانتے ہیں کہ ''خلیفہ،، کا لفظ تاریخ اسلام اور سیرت کا ایک قابل احترام لفظ ہے۔ نبی کریم ﷺ کے جانشین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ رسول کہا جاتا ہے، علی الترتیب چاروں خلفاء کو خلفاء راشدین کہا جاتا ہے۔ لیکن سخت افسوس کی بات ہے کہ اس قابل احترام لفظ خلیفہ کو ہم نے فٹ کر دیا اس شخص پر جو بچوں کا ختنہ کرے، بال کاٹے، کشتی لڑائے، لاٹھی اور بنوٹ سکھائے یا بورچی ہو اور کھانے پکائے یا کسی کا مذاق اڑانا ہو تو تحقیر کے لئے خلیفہ کہیں۔

''سوموار'' کو ''پیر'' کہنا ایک عام بیماری ہے عام بول چال میں سوموار کو ''پیر'' کہا جاتا ہے، کیلنڈروں پر، جنتریوں میں ''سوموار'' کو پیر لکھا جاتا ہے، ہفتہ کے تمام دنوں میں یہ دن سب کا ''پیر،، کیسے ہو گیا؟ ہفتہ کے تمام دنوں میں جمعہ کے دن کو ''سید الایام،، کہا گیا ہے، صحیح حدیثوں میں نبی کریم ﷺ نے جمعہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور عموماً تمام مسلمان جمعہ کی فضیلت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ ''پیر،، نہیں ہوا ''سوموار،، سب کا پیر ہو گیا اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس دن کوئی

بڑے پیر چھوٹے پیر پیدا ہوئے ہوں گے؟ اس لئے سوموار سارے دنوں کا پیر ہو گیا۔
اس بیماری میں اہل حدیث بھی مبتلا ہیں۔حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ فرماتے ہیں:
"نَحنُ الآخِرونَ السَّابِقُونَ يَومَ القِيَامَةِ بَيْدَ أنَّهم أُوتُوا الكِتَابَ مِن قَبلِنا"
(صحيح بخاري، كتاب الجمعة)

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہود ونصاری زمانے کے اعتبار سے ہم سے پہلے ہیں اور ہم سے پہلے ان کو کتاب بھی دی گئی ہے اور ہم ان کے بعد ہیں لیکن اس کے باوجود قیامت کے دن ہم ان سے آگے رہیں گے۔اور اس کو مثال سے اس طرح سمجھایا کہ جیسے یہود ونصاری پر اللہ تعالی نے اپنی عبادت کے لئے ایک خاص دن فرض کیا تھا لیکن اس دن کی تعیین میں ان سے غلطی ہوئی وہ ہم سے پیچھے ہو گئے اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی رہنمائی فرمائی اور ہم ان سے آگے ہو گئے، ہمارا ہفتہ جمعہ سے شروع ہوا، ترتیب یوں ہوئی جمعہ، سنیچر اور اتوار۔یہود ونصاری ہم سے پہلے ہیں لیکن سید الایام کے انتخاب میں ہمارے بعد ہیں۔اسی طرح پیچھے ہونے کے باوجود ہم قیامت کے دن ان سے آگے رہیں گے۔ان شاء اللہ۔

ہم آپ کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہود کے نزدیک ہفتہ کا پہلا دن سنیچر ہے اور نصاری کے نزدیک ہفتہ کا پہلا دن اتوار ہے اس لئے اگر یہود تعظیماً سنیچر کو ہفتہ کے نام سے موسوم کریں تو کسی قدر بات سمجھ میں آتی ہے حالانکہ وہ ہفتہ نہیں ہفتے کا پہلا دن ہے۔لیکن مسلمان بھی سنیچر کو ہفتہ کہیں اور کیلنڈروں پر سنیچر کے دن کو ہفتہ لکھیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ہمارا ہفتہ تو جمعہ کے مبارک دن سے شروع ہوتا ہے لہذا اگر ہفتہ کہنا ہی ہے تو جمعہ کے دن کو ہفتہ کے نام سے موسوم کرنا چاہئے لیکن ہم بھی سنیچر ہی کو ہفتہ کہتے ہیں۔اس توافق سے بچنا چاہئے۔حدیث میں ہفتہ کو "جمعہ" سے تعبیر کیا گیا

ہے۔ عَنِ ابنِ عَباسٍ قَالَ: حَدِّثِ النَّاسَ كُلَّ جُمعَةٍ مرةً، فَإِنْ أَبَيْتَ فَمَرتَين، فَإِنْ أَكْثَرتَ فَثَلاثَ مَرَّاتٍ۔ (صحیح بخاری، دعوات/۶۳۳۷)

اس حدیث میں عبداللہ بن عباس نے جمعہ کو ہفتہ کے معنی میں لیا ہے۔ عبداللہ بن عمروؓ نے بھی لفظ جمعہ کو ہفتہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور ہم صحابۂ کرام کی ان صراحتوں کو چھوڑ کر سنیچر کو ہفتہ کہتے ہیں۔ (صحیح بخاری، ادب/۶۱۳۴)

بارہ مہینوں کے اسلامی نام محرم، صفر، ربیع الاول وغیرہ متعین ہیں لیکن بعض معاشروں میں یہ اسلامی نام جانتے ہی نہیں ہیں، وہ مہینوں کا نام کسی پیر، فقیر کی پیدائش یا وفات سے جانتے ہیں، یہاںتک کہ ذوالقعدہ کے مہینے میں کوئی پیر نہ پیدا ہوا ہے نہ مرا ہے تو اس مہینے کا نام ''خالی،، رکھا گیا ہے اس لئے کہ یہ مہینہ کسی پیر کے مرنے، جینے سے خالی ہے۔

ایک مشہور اور زبان زد لفظ ''مجاور،، کا ہے اس کا صحیح معنی پڑوسی اور اعتکاف کرنے والے کے ہیں، ہمارے محاورے میں واو کے فتحہ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ حالانکہ قاعدے کے مطابق فاعل کے صیغہ کے ساتھ ہونا چاہئے یہ لفظ ہمارے معاشرے میں ان لوگوں پر بولا جاتا ہے جو درگاہوں اور قبروں پر رہتے ہیں، تعویذ، گنڈا باندھنا، بھوت پریت چھڑانا، اور بزعم خویش عورتوں کو اولاد دینا اور لوگوں کو بیوقوف بنا کر پیسہ لوٹنا ان کا دھندہ ہے وہ خود کیا ہیں اسے مت پوچھئے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دیکھئے ایک پاکیزہ لفظ جس سے ثواب کی خوشبو آرہی ہے اس کو معاشرے نے ایسے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے جہاں سے شرک و کفر اور فسق و فجور کی بدبو آرہی ہے اور سنیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ''لبن،، کا معنی دودھ ہوتا ہے اس مناسبت سے دودھ

والے برتن کو "لبنی" کہا جا سکتا ہے لیکن بعض معاشرے میں لوگ اس پاکیزہ لفظ کو اٹھا کر وہاں لے گئے جہاں نشہ اور حرمت ہے، تاڑی جس برتن میں اتارتے اور رکھتے ہیں اس برتن کو "لبنی" کہا جاتا ہے۔ چونکہ دودھ بھی سفید ہوتا ہے اور تاڑی بھی سفید ہوتی ہے اس ادنیٰ مناسبت سے ایک حرام چیز پر نہایت ہشیاری سے اس لفظ کا اطلاق کر دیا گیا کہ آدمی تاڑی کو حرام نہ سمجھے بلکہ دودھ کیطرح حلال سمجھ کر استعمال کرے۔

اب ایک ایسا لفظ بھی سماعت فرمائیں جسے صرف علماء ہی کا طبقہ استعمال کرتا ہے لیکن اسکی شناعت اور قباحت پر توجہ نہیں جاتی۔ عقیدے کی کتاب جب ہم پڑھاتے ہیں تو طلبہ کو سمجھاتے ہیں کہ معتزلہ مشرک ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں "بندہ خود اپنے فعل کا خالق ہے،، تخلیق اللہ کا فعل ہے اب ہم یہ کہیں کہ بندہ خود اپنے فعل کا خالق ہے تو صفت خلق میں ہم نے بندوں کو اللہ کا شریک کر دیا۔ لہٰذا معتزلہ اپنے اس عقیدے کی وجہ سے مشرک ہوئے۔ بات بالکل صحیح ہے۔ تخلیق اللہ کی صفت ہے جو اللہ کے ساتھ خاص ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن بطور عقیدہ نہ سہی۔ جب یہی لفظ ہم اپنے کسی مضمون اور مقالے پر بولیں اور کہیں کہ یہ ہماری یا فلاں کی تخلیق ہے تو کیا اس سے اعتزال کی بو نہیں آتی؟

میرے بھائیو! ان مذکورہ باتوں کو معمولی اور غیر اہم نہ سمجھیں، ابھی جن غلطیوں کی نشاندھی کی گئی ہے ان میں عقیدے کی بعض ایسی غلطیاں ہیں جن کا رشتہ شرک سے جا ملتا ہے۔ بعض سے کتاب وسنت کی توہین لازم آتی ہے اور کتاب وسنت کی توھین ایسی غلطی ہے جسکی وجہ سے آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اور یہ ساری غلطیاں باپ دادا سے سنتے چلے آرہے ہیں ہم بھی وہی الفاظ روزمرہ کی بول چال میں استعمال کرتے ہیں اور ان کے معانی اور عواقب پر توجہ نہیں دیتے۔ تقلید ایک

ایسی بیماری ہے جو غور وفکر کا مادہ سلب کر لیتی ہے اور عقل پر تالا چڑھا دیتی ہے جبکہ اسلام اپنے متبعین کو نشیط اور بیدار مغز رکھنا چاہتا ہے آپ فیصلہ کیجئے کہ اس تضاد کے بعد اسلام میں تقلید کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟

تقلید کا دروازہ کیسے کھلا؟

اس موضوع پر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جامع اور تفصیلی بحث حجۃ اللہ البالغۃ میں پیش کی ہے اس کا ایک مرتب خلاصہ آپ کے سامنے پیش کیا جارہا ہے جس سے آپ یہ اندازہ کر سکیں گے کہ تقلید کا وجود کیسے ہوا۔ اس کے بعد آپ کو یہ فیصلہ کرنا بھی آسان ہو جائیگا کہ شریعت اور تقلید جامد میں کچھ مناسبت ہے بھی یا نہیں؟

شاہ صاحب کہتے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے کسی ایک معین مذہب (تقلید شخصی) کا وجود نہیں تھا۔ عوام وضو، غسل، روزہ، حج، زکاۃ، جیسے اجتماعی مسائل میں نبی کریم ﷺ کی تقلید (اتباع) کرتے تھے اور جب کوئی نیا واقعہ پیش آتا تو کسی مذہب کی تخصیص اور تعیین کے بغیر کسی بھی مفتی سے فتوی پوچھ لیتے اور اس پر عمل کرتے خواص کا حال یہ تھا کہ ان کے پاس کتاب وسنت اور صحابۂ کرام کے اقوال وآثار کا اتنا ذخیرہ موجود ہوتا کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی نیا مسئلہ حل کرنے میں دقت نہیں پیش آتی، اگر خدانخواستہ کبھی ایسی صورت پیش آجاتی کہ اطمنان بخش دلیل نہیں مل سکی، حدیثیں متعارض ہیں، ترجیح کی صورت واضح نہیں ہے، تو گذشتہ علماء اور فقہاء کے اقوال کی طرف رجوع کرتے اگر ایک سے زیادہ قول ملتا تو اقوی اور اوثق کو اختیار کرتے خواہ وہ اہل حدیث کا قول ہو یا اہل کوفہ کا۔

خلفاء راشدین کے بعد آہستہ آہستہ حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ

میں چلی گئی جو فتاوی اور احکام ومسائل کے استنباط میں مستقل علم نہیں رکھتے تھے اور شرعی مسائل کے بغیر حکومت کی گاڑی نہیں چل سکتی تھی اس لئے ارباب حکومت علماء، فقہاء سے مدد لینے اور ساتھ رکھنے پر مجبور تھے، ارباب حکومت خود تو کتاب وسنت کے عالم نہیں ہوتے لیکن وہ زمانہ طرز اول کے علماء سے خالی بھی نہیں تھا۔ ایسے بہت سارے علماء اور محدثین موجود تھے جن کو دین کا خالص علم تھا لیکن ان کا یہ حال تھا کہ حکومت جب انھیں بلاتی تو وہ دور بھاگتے اور دور رہنے ہی میں وہ اپنی عافیت سمجھتے، اہل زمانہ نے جب دیکھا کہ علماء اور محدثین کی، فقہاء اور مجتہدین کی ارباب حکومت کے نزدیک بڑی قدر ومنزلت اور عزت واحترام ہے ان کو قریب کیا جا رہا ہے اور یہ لوگ بھاگ رہے ہیں تو یہ عزو جاہ حاصل کرنے کے لئے بہت سارے لوگوں نے طلب علم میں سر اٹھایا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ فقہاء کرام بادشاہوں کی نگاہ میں ذلیل وخوار ہوگئے اور مطلوب سے طالب کے درجے میں پہنچ گئے "الا من وفقہ اللہ" اور یہیں سے تقلید کا دروازہ کھلا، چیونٹی کی رفتار سے آہستہ آہستہ تقلید لوگوں کے سینوں میں اس طرح گھس گئی کہ لوگوں کو احساس بھی نہیں ہوا۔ اس کے کل تین اسباب بیان کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ ایک فقیہ جب کوئی فتوی دیتا یا فیصلہ کرتا تو دوسرا اس پر نقض وارد کرتا اور اس کے فتوی کو غلط ثابت کرتا۔ فقہاء کرام کے آپسی مجادلہ کی وجہ سے فیصلہ مشکل ہو جاتا تو مجبوراً بات اس پر ختم کی جاتی کہ اچھا دیکھو کس کا فتوی گذشتہ ائمہ اور فقہاء میں سے کسی فقیہ کے فتوی کے موافق ہے؟ جس کا فتوی، متقدمین میں سے کسی کے موافق ہو جاتا اس کا فتوی لے لیا جاتا اور دوسرے کا چھوڑ دیا جاتا۔ اس طرح تقلیدی ذہن بننا شروع ہوگیا۔

۲۔ عہدۂ قضا کی کرسی پر جو لوگ قابض تھے ان کے اندر سے امانت نکل چکی تھی خیانت اور ظلم کا غلبہ ہو گیا تھا اس لئے ان سے لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا، قضاۃ جب کوئی ایسا فیصلہ کرتے جو عوام کے نزدیک غیر مشکوک ہوتا تو اسکو قبول کر لیتے ورنہ نہیں، اور غیر مشکوک ہونا اسی وقت تسلیم کیا جاتا جب اس کا فیصلہ متقدمین میں سے کسی عالم کے فیصلہ کے موافق ہوتا اس طرح بھی تقلید کو راستہ ملا۔

۳۔ رؤساء اور حکام کی جہالت کی وجہ سے لوگ ایسے لوگوں سے مسئلہ پوچھنے پر مجبور ہوئے جو خود حدیث رسول سے ناواقف ہوتے اور استنباط مسائل سے بھی نابلد ہوتے جب ایسے لوگ عالم اور مفتی ہو گئے تو ان کے لئے بھی ضروری ہوا کہ وہ اپنے فتوی کی تائید اور تصدیق میں اپنے سے پہلے کسی عالم اور فقیہ کا حوالہ دین تا کہ ان کے فتوی کو اعتبار حاصل ہو۔ اس طرح بھی تقلید کو راستہ ملا اور اس کا رواج ہوا (حجۃ اللہ البالغۃ، باب حکایۃ حال الناس قبل المأۃ الرابعۃ و بعدھا) پوری بحث آپ بار بار پڑھیں ان شاء اللہ آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ:

(۱) قرون ثلاثہ جنھیں خیر القرون کہا گیا ہے اس میں تقلید کا وجود نہیں تھا۔

(۲) تقلید آپسی اختلاف اور باہمی مجادلہ کی پیداوار ہے۔

(۳) تقلید جہالت کا نتیجہ ہے۔

اب آپ فیصلہ کریں کی جہالت پھیلانا مطلوب ہے یا علم؟ اللہ کے نبی ﷺ کی نبوت اور وحی کا آغاز ''اقرأ،، سے کیوں ہوا ہے؟ جہالت پھیلانے کے لئے یا علم؟ یہ یقین ہے کہ آخرت میں کسی کی تقلید کے بارے میں ہم سے سوال نہیں کیا جائے گا ہاں نبی کریم ﷺ کے بارے میں قبر کے اندر سوال کیا جائیگا۔ اس لئے ہمیں کس کی تقلید کرنی چاہئے؟ جواب واضح ہے۔ فرض کیجئے تقلید دین کے فرائض میں سے ایک فرض ہے اور

اس کے بارے میں بھی سوال کیا جا سکتا ہے اگر امکان ہی سے بحث کرنا ہے تو کسی شافعی سے یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ کم از کم تمہارے چار امام تھے تم نے صرف امام شافعی کی ہی کیوں تقلید کی باقی تین نے کیا گناہ کیا تھا کہ ان کی تم نے تقلید نہیں کی۔ اسی طرح حنفی، مالکی، اور حنبلی سب سے یہی سوال کیا جا سکتا ہے، ایک امام کو مانئے اور تین کو چھوڑ یئے یہ کون سا انصاف ہے؟ جبکہ آپ کے نزدیک سارے امام برحق ہیں۔

دین کہاں سے لیں

یہ بات دن کے اجالے کی طرح واضح ہے کہ اتباع کہئے یا تقلید صرف نبی کریم ﷺ کی کی جائے گی، وحی آپ پر آتی تھی، جبرئیل امین علیہ السلام آپ سے باتیں کرتے تھے، آپ پر وحی کی دو صورتیں تھیں ایک ''وحی جلی،، جسے قرآن پاک کہا جاتا ہے دوسری ''وحی خفی،، جسے حدیث رسول یا سنت کہا جاتا ہے، اور یہ دونوں اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہین اور دنیا کی تمام مشہور زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے اگر آپ عربی نہیں جانتے ہیں تو جو زبان جانتے ہیں اس میں ترجمہ تلاش کیجئے اور براہ راست قرآن وحدیث کا ترجمہ پڑھئے اور دین حاصل کیجئے۔ آپ جس طرح چوبیس گھنٹہ اپنے لئے اور اپنے بچوں کیلئے خرچ کرتے ہیں اسیطر ح ایک گھنٹہ اپنے دین کیلئے بھی نکالئے اور قرآن وحدیث کا مطالعہ کیجئے اور پھر اس کا اثر دیکھئے آپ کی زندگی میں انقلاب آجائیگا۔ جن مسائل پر قصداً پردہ ڈالا گیا ہے اس کا پردہ اٹھ جائیگا اور حقیقت آپ کے سامنے آجائیگی۔

اگر آپ پڑھنا نہیں جانتے تو علماء حق کی کیسیٹیں ملیں گی انھیں سنئے، ایسی مسجد میں جمعہ پڑھیں جہاں اردو میں خطبہ ہوتا ہے سنئے اور علم حاصل کیجئے۔ اگر کوئی بات

سمجھ میں نہ آئے یا کسی مسئلے میں شک ہو تو ایک نہیں متعدد عالموں سے پوچھئے۔ جواب میں فرق پڑ سکتا ہے لیکن آپکو اللہ نے عقل دی ہے رد و قدح کیجئے آپ خود کسی فیصلے اور نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔ ان شاء اللہ

ہاں آپ سے کوئی کہہ سکتا ہے قرآن و حدیث کا مطالعہ مت کرو، بہت زیادہ کرید مت کرو، تم گمراہ ہو جاؤ گے، تحقیق کرنا علماء کا کام ہے۔ آپ کہئے ہم ہر چیز چھان پھٹک کر لیتے ہیں تو دین بغیر سمجھے بوجھے کیوں لے لیں۔ اللہ نے دین کو آسان بنا کر بھیجا ہے قرآن اور حدیث دونوں اس پر ناطق ہیں دین ہدایت کے لئے آیا ہے نہ کہ گمراہ کرنے کے لئے، ہم دین کا علم حاصل کرنا چاہتے ہیں گمراہ کیوں ہوں گے؟ اللہ کے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: "الدین یسر"، دین آسان ہے۔ آپ مشکل کیوں کہہ رہے ہیں؟ میں کہتا ہوں اگر آپ مذکورہ باتوں پر عمل کریں گے تو آپ کو سمجھ میں آجائیگا کہ کتاب وسنت میں جو دین محفوظ ہے اس میں اور سڑکوں پر چلتا پھرتا جو دین نظر آتا ہے اس میں تضاد ہے۔ آپ یہ بات یاد رکھیں کہ آنکھ بند کر کے بلا دلیل کسی ایک امام کی بات ماننا تقلید ہے اور کسی امام کی تعیین کے بغیر قرآن وحدیث کے کسی بھی عالم سے دلیل کے ساتھ مسئلے کو معلوم کرنا اور اس پر عمل کرنا اتباع ہے تقلید نہیں ہے۔ اللہ تعالی ہمیں صراط مستقیم پر چلائے اور براہ راست کتاب وسنت پر تمسک کی توفیق دے۔ آمین۔

☆☆☆

آپ کی ذمہ داری

نکات:

(۱) عارضی زندگی۔

(۲) دائمی زندگی۔

(۳) دو راستے۔

(۴) آثار پرستی۔

عارضی زندگی

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ (۵۷/۲۰)

ترجمہ: خوب جان رکھو کہ دنیا کی زندگی صرف کھیل، تماشہ، زینت اور آپس میں فخر و غرور اور مال اور اولاد میں زیادتی کی طلب ہے (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش، جس کی پیداوار کسانوں کو خوش کرتی ہے، پھر جب خشک ہو جاتی ہے تو تم اسے پیلی دیکھتے ہو پھر وہ چور چور ہو جاتی ہے، اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور رضامندی ہے، اور دنیا کی زندگی بجز دھوکے کے سامان کے کچھ بھی نہیں ہے۔

آیت کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ انسان کی زندگی کے چار مراحل ہیں: بچپن

یہ کھیل اور تماشے کا مرحلہ ہے، جوانی یہ زیب وزینت کا مرحلہ ہے کھولت یہ فخر ومباہات کا زمانہ ہے پھر بڑھاپا یہ حرص ولالچ کا زمانہ ہوتا ہے۔اس کے بعد دنیاوی زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کو بارش اور بارش سے پیدا ہونے والے پودوں سے تشبیہ دیکر سمجھایا جارہا ہے کہ ہری، بھری، لہلہاتی ہوئی کھیتی کو دیکھ کر انسان خوش ہوجاتا ہے لیکن چند دنوں کے اندر وہ کھیتی پک جاتی ہے اور ریزہ ریزہ ہوجاتی ہے اسی طرح انسان اپنے مال اور اولاد کو دیکھ کر خوش ہوجاتا ہے اور اس پر اترانے لگتا ہے لیکن انسان کو دنیا کی نازونعمت پر اترانا نہیں چاہئے انسان کی یہ زندگی بھی اتنی ہی ناپائیدار ہے جتنی پودوں کی زندگی بلکہ اس سے بھی کم۔آدمی پلاننگ کرتا ہے منصوبے بناتا ہے لیکن رات میں سویا اور اٹھ نہیں پایا، گھر سے نکلا اور ایکسیڈنٹ ہوگیا، بینک سے آرہا تھا کسی نے گولی ماردی منٹوں میں مہلت عمل ختم ہوگئی دنیا کی زندگی کا یہی حاصل ہے۔

دائمی زندگی

پچھلے خطبے میں آپ کو بتایا گیا تھا کہ ہماری عدالت فیصلہ سناتی ہے کہ فلاں مجرم کو پانچ بار سزائے موت دی جائے، لیکن دنیا میں یہ ممکن نہیں۔ایک بار پھانسی دینے کے بعد دوسری بار پھانسی نہیں دی جاسکتی، چار بار سزائے موت کا فیصلہ مجرم کے ذمہ قرض ہے یہ قرض کیسے ادا ہوگا؟ اور کہاں ادا ہوگا؟

میرے بھائیو: اس سوال کا جواب دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے اس کا جواب صرف ہمارے پاس ہے، اسلام یہ عقیدہ پیش کرتا ہے کہ اس محدود زندگی کے بعد ایک لامحدود زندگی ہوگی جہاں ہر عادل کے عدل اور ہر ظالم کے ظلم کا پورا پورا بدلہ اور حق ادا کردیا جائے گا۔وہاں کی زندگی ابدی اور دائمی زندگی ہوگی۔

جنتیوں کے بارے میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (۴۳/۷۱)

اور وہاں (جنت میں) ان کی خواہش کے مطابق ہر چیز ہوگی اور جن سے ان کی آنکھیں لذت پائیں (وہ بھی ہوں گی) اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔

جہنمیوں کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (۵۸/۱۷)

ان منافقوں کے مال اور ان کی اولاد ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے، یہ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

صرف دو آیتیں آپ کو سنائی گئی ہیں، ان سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ جنت و جہنم کی زندگی دائمی اور ابدی ہوگی۔ قرآن پاک اس مضمون سے بھرا ہوا ہے۔

دو راستے

یہ ثابت ہو جانے کے بعد ہر آدمی اپنے تئیں یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ دنیا کی عارضی زندگی کے لئے بھاگ دوڑ کی جائے یا آخرت کی دائمی زندگی کے لئے محنت کی جائے؟ میرے بھائیو! دنیا کی زندگی تو جیسے تیسے کٹ جائیگی، ہمیں آخرت کی فکر کرنی چاہئے۔ ہم کون سا راستہ اختیار کریں کہ جہنم کے عذاب سے بچا جا سکے اور جنت کی نعمتوں کو پایا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کی جائے۔ جب آپ یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اطاعت کا طریقہ اور راستہ کیا ہے، ہم نماز کیسے پڑھیں؟ تو کوئی آپ کو بتائے گا، سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوگی اور کوئی کہے گا ہو

جائیگی، کوئی کہے گا رفع الیدین کرو کوئی کہے گا مت کرو، کوئی کہے گا آمین بولو کوئی کہے گا مت بولو۔ اور دونوں بتانے والے مولانا ہونگے۔ اب آپ حیران ہوں گے۔،،، کس کی مانوں کس کی نہ مانوں؟

آپ کسی پریشانی، الجھن، مصیبت اور بیماری میں مبتلا ہوں، اور اپنی پریشانی کا ذکر کسی ہمدرد اور خیر خواہ سے کریں گے تو وہ آپ سے کہے گا چھوڑو دوا علاج۔ ہوا لگ گئی ہے، اوپری فساد ہے اور آپ کو لیکر کسی سلّدا بابا، مغلانی بابا، پنیھوا بابا، ڈبر ہوا بابا، چوہا شاہ، کتا شاہ کے پاس جائیگا۔ وہاں آپ دیکھیں گے بابا کا عرس ہے خلق خدا کا ہجوم ہے، کہیں بابا کی حمد وثنا میں تقریر ہورہی ہے کہیں قوالی ہو رہی ہے، کہیں حال وقال کی مجلس جمی ہوئی ہے، کہیں اندھیرا ہے تو کہیں اجالا ہے۔ کہیں طوطے کی قبر ہے تو کہیں گھوڑے کی قبر ہے۔،،، کہیں بابا کی قبر ہے، کہیں ساواں اور چاول چڑھایا جارہا ہے تو کہیں چنا کا نذرانہ ہے کہیں چادر ہے، مرغا ہے، گھی کا چراغ ہے اگربتی ہے، کوئی سجدے میں ہے کوئی رکوع میں ہے کوئی دستہ بستہ باادب ہاتھ باندھے کھڑا ہے، کوئی طواف کررہا ہے، یہ شرکیہ اعمال اور برائیوں کا ہجوم علماء اور قائدین ملت کی نگرانی میں انجام پارہا ہے۔

دوسرے علمائے کرام آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث سنائیں گے آپ نے فرمایا ہے: اَللّٰھُمَّ لَا تَجعَلُ قَبرِی وَثَناً یُعبَد، اے اللہ میری قبر کو بت مت بنا جس کی پوجا کی جائے (فتح المجید) آپ نے فرمایا

لَعَنَ اللّٰہُ الیَھُودَ وَالنَّصَارَی، إتَّخَذُوا قُبورَ أنبیاءِ ھِم مَسَاجِد۔

(صحیح بخاری/۱۳۳۰)

اللہ تعالیٰ یہود و نصاری پر لعنت بھیجے ان لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو

مسجد بنالیا۔

"نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُجَصَّصَ القَبْرُ" (مسلم، جنائز) رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو پختہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوالہیاج اسدی سے کہتے ہیں "أَلَا أَبْعَثُكَ عَلَى مَا بَعَثَنِي رسولُ اللّٰهِ ﷺ؟ أَمَرَنِي أَنْ لَا تَدَعَ قَبْراً مُشرِفاً إلا سَوَّيتَهُ، وَلَا تِمْثَالاً إِلَّا طَمَسْتَه، (صحیح مسلم)

میں تمھیں اس کام پر بھیجنا چاہتا ہوں جس کام پر مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا، مجھے آپ نے حکم دیا تھا کہ اونچی قبر جہاں پاؤ اس کو گرا کر برابر کر دو اور جہاں کوئی مورتی ملے اس کو مٹا دو۔

دو ذہن اور دو مزاج آپ کے سامنے رکھا گیا ایک کا حال یہ ہے کہ وہ قبر ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے، جو کچھ کہنا ہے، مانگنا ہے، فریاد کرنا ہے، نذر و نیاز کرنا ہے، رکوع اور سجدہ کرنا ہے وہ سب قبر پر ہی کیا جائے، اس کے نزدیک مسجد اور اللہ کی کوئی حیثیت اور قیمت نہیں جو کچھ لینا ہے وہ قبر والے سے لے لیں گے، دوسرا آپ کو نبی ﷺ کی حدیثیں سناتا ہے اور آپ کو سمجھاتا ہے قبروں پر رکوع اور سجدہ کرنا اللہ کی لعنت کا سبب اور شرک ہے، قبریں پختہ نہ بنائی جائیں وہاں عرس اور میلا نہ لگایا جائے، چراغاں نہ کیا جائے، فریاد نہ کی جائے، نذر و نیاز نہ کیا جائے یہ ساری چیزیں توحید کے خلاف ہیں اور شرک ہیں۔ علم اور عمل کے یہ دو راستے ہیں اور دونوں دین کے نام پر ہیں اور دونوں کا سوتا دینی درسگاہوں سے پھوٹتا ہے۔ اب ایک عام آدمی حیران ہے کہ یا اللہ میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں۔ دونوں راستوں کی سربراہی اور رہنمائی علماء ہی کر رہے ہیں۔

میرے بھائیو: آپ کیا کریں اور کیا نہ کریں یہ آپ کو بتایا جائیگا لیکن تھوڑا

توقف کریں ایک بات اور سن لیں اس کے بعد آپ کو بتایا جا رہا ہے۔

آثار پرستی:

حدیبیہ کے واقعات میں ایک اہم واقعہ بیعت کا ہے، سورہ فتح میں اللہ پاک نے اس کا ذکر فرمایا ہے۔ ''إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ'' جب لوگ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

یہ کون سا درخت تھا اس کے بارے میں حضرت طارق بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں حج کیلئے جا رہا تھا اسی دوران میرا گذر کچھ لوگوں کے پاس سے ہوا وہ لوگ ایک مخصوص جگہ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے پوچھ دیا یہ کون سی جگہ ہے جہاں لوگ نماز پڑھ رہے ہیں لوگوں نے بتایا کہ یہاں جو درخت ہے اسی کے نیچے رسول ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرام سے بیعت رضوان لی تھی، طارق کہتے ہیں کہ (حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے) میں سعید بن مسیّب کے پاس آیا اور ان کو پوری بات بتائی انھوں نے سن کر فرمایا: کہ میرے والد یعنی مسیّب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس سفر میں تھے اور تمام لوگوں کے ساتھ میرے والد نے بھی رسول ﷺ سے بیعت کی تھی۔ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ جب اگلے سال (سات ہجری میں) ہم لوگ عمرۃ القضا کیلئے گئے اور حدیبیہ پہنچے تو ہم لوگ نہیں جان سکے کہ وہ کون سا درخت تھا (جس کے نیچے بیعت ہوئی تھی) ''نسیناھا'' اللہ کی جانب سے وہ درخت ہمیں بھلا دیا گیا۔ اور نہیں جان سکے۔ اس کے بعد حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں،،،، إِنَّ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ ﷺ لَمْ يَعْلَمُوهَا وَ عَلِمْتُمُوهَا أَنْتُمْ فَأَنْتُمْ أَعْلَمُ،، یعنی محمد ﷺ کے صحابہ تو اس کو نہیں جان سکے اور تم جان گئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ صحابہ سے زیادہ جاننے

والے تم ہو۔ (بخاری، مغازی ۴۱۶۳)

بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب یہ خبر پہنچی کہ لوگ ایک درخت کے پاس جا کر حصول برکت کے لئے نماز پڑھتے ہیں تو حضرت عمر رضی عنہ نے اس درخت کو کٹوا دیا۔ اس درخت کی معرفت تو پہلے ہی مٹا دی گئی تھی لیکن جس درخت کو اپنے طور پر لوگوں نے فرض کر لیا تھا کہ یہی بیعت رضوان کا درخت ہے اور وہاں نماز پڑھنے لگے تھے اسی درخت کو کٹوا کر اس کا نشان مٹا دیا۔

آثار پرستی بھی مسلم معاشرے کی ایک بیماری ہے، کہیں انار کا درخت ہے، کہیں گلاب کا پودا ہے، کہیں ببول اور بیری کا درخت ہے، کہیں پتھر ہے کہیں کنواں ہے کہیں پوکھرا اور تالاب ہے۔ آج مسلمان ان چیزوں کو ایسے ہی خیر و برکت کا ذریعہ مانتے ہیں جیسے مشرکین مانتے تھے۔ آثار پرستی کے بارے میں آپ کو دو متضاد فتویٰ مل جائے گا، کوئی کہے گا اسلام میں آثار پرستی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اگر کہیں آثار پرستی ہو رہی ہے تو اس کا نام و نشان مٹا دینا چاہئے۔

جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فرضی درخت ہی کو کٹوا دیا جہاں لوگ برکت حاصل کرنے جاتے تھے۔

کوئی آثار پرستی کو جائز بلکہ عین ایمان قرار دے گا۔ اور یہ دونوں فتوی دینے والے علماء کرام ہوں گے یا کم از کم مولوی نما ہوں گے۔ ایسے موقع پر ایک عام آدمی حیران و پریشان ہوتا ہے کہ میں کیا کروں؟ مانا کہ آپ کے ساتھ ایسی کوئی صورت حال پیش نہیں آئی لیکن آپ اپنے معاشرے میں اتنا تو دیکھتے ہی ہیں کہ ایک قبر پرستی ہی کو اسلام جانتا ہے اور دوسرا قبر پرستی کو شرک کہتا ہے۔ ایک آثار پرستی کو عین اسلام سمجھتا ہے اور دوسرا اسے اسلام کی ضد سمجھتا ہے۔ ایک آمین اور رفع الیدین کو نماز میں

سنت کہتا ہے اور دوسرا اس کی نفی کرتا ہے۔ اور یہ دونوں فتوی دینی اداروں ہی سے نکلے ہیں۔ اب آپ کا کیا فرض بنتا ہے یہ ہے قابل غور پہلو۔

آپ کو اپنی بیٹی کا رشتہ کرنا ہو تو لڑکے، اس کے والدین، خاندان، کاروبار، ہڈی گڈی سب کی تحقیق کر ڈالیں گے، تجارت کرنا ہو، لین دین کرنا ہو، سامان خریدنا ہو، زمین یا مکان لینا ہو تو سوچ بچار کر، ٹھونک بجا کر دو آدمی سے سمجھ بوجھ کر اگلا قدم اٹھائیں گے۔ تاکہ دھوکہ نہ ہو لیکن دین کے معاملے میں آنکھ بند کر کے ایک کی بات مان لیں گے، دین ہی پر آپ کی اصل زندگی یعنی آخرت کا کل دارومدار ہے اور دین کو آپ بغیر محنت اور بغیر تحقیق کے مان لیں یہ کتنے تعجب کی بات ہے؟

میرے بھائیو: میں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ جب آپ کے سامنے دو متضاد فتوے ہیں تو آپ خود اٹھئے محنت کیجئے قرآن وحدیث کا مطالعہ کیجئے میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ پچاس فیصد آپ خود سمجھ جائیں گے۔ اور پچاس فیصد نہ سمجھنے کی کمی تنہا آپ کے ساتھ نہیں ہے اس میں عوام سے لیکر علماء تک شامل ہیں کوئی مولوی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں سب سمجھتا ہوں۔ جو نہ سمجھ میں آئے وہ آپ علماء کرام سے پوچھیں۔ قرآن پاک کی تعلیم "فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون" پر عمل کریں، ایک سے نہیں دو چار سے پوچھیں، خود مطالعہ کریں اور باتوں کا موازنہ کریں۔ اس کے بعد دیکھئے دودھ اور پانی الگ ہو جاتا ہے یا نہیں؟ آپ سوچیں گے کہ میں کس کا مطالعہ کروں؟ یہ سوال بھی آپ کا صحیح ہے۔ بہت ممکن ہے آپ دو سے پوچھیں تو وہ آپ کو الگ الگ دو کتاب کا نام بتائیں آپ کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ دو اور چار کتابوں کا مطالعہ کریں۔

لیجئے میں آپ کو ایک ایسی کتاب کا نام بتاتا ہوں جس کی صحت اور قبولیت پر

تمام امت کا اجماع ہے۔ دیوبندی، بریلوی اہل حدیث، شافعی، مالکی، حنبلی سب اس کتاب کی صحت پر متفق ہیں۔ علماء اسلام نے اس کتاب کو "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" یعنی قرآن پاک کے بعد سب سے صحیح کتاب کا درجہ دیا ہے۔ اور آج تک پوری امت اس کتاب کو یہ درجہ دینے پر متفق ہے اس لئے کہ یہ کتاب تمام دینی اداروں میں پڑھائی جاتی ہے۔ جب تک یہ کتاب نہیں پڑھالی جاتی اس وقت تک کوئی مولوی مولوی نہیں ہوتا اور نہ اسکے سر پر دستار فضیلت لپیٹی جاتی ہے۔ وہ کتاب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "صحیح بخاری" ہے، ہر شہر، ہر دینی ادارے بلکہ ہر بڑی لائبریری میں مل جائے گی چاہے وہ لائبریری کسی دینی ادارے کی ہو، ذاتی ہو یا کسی یونیورسٹی کی ہو، اس کتاب کا اردو، ہندی اور انگریزی ترجمہ ہر شہر اور کتب خانوں میں مل جائیگا۔ یہ کتاب قرآن پاک کے بعد تمام دینی کتابوں میں اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہے آپ اپنی ذمہ داری محسوس کیجئے، دین کے لئے تھوڑا وقت لکالیئے اور اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ کتابی دین کیا ہے اور سماجی دین کیا ہے۔ ہم کہاں ہیں اور ہمیں کہاں ہونا چاہئے؟

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ۔ و صلی اللہ علی النبی۔

☆☆☆

اللہ کی رحمت اور اس کا غضب

نکات!

(۱) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

(۲) اللہ کی وسعت رحمت کی مثال۔

(۳) کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟

(۴) سارے گناہ معاف۔

(۵) یہ ادا اللہ کو پسند آ گئی۔

(۶) اللہ کی رحمت کاملہ کو اور سمجھئے۔

(۷) اللہ کی صفت غضب۔

(۸) اللہ کے عذاب کی شکلیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے!

﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعاً إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾

(الزمر:۵۳)

ترجمہ! اے نبی آپ (میری جانب سے) کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی تم لوگ اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو جاؤ۔ بلا شبہ اللہ تمام گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ بیشک وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَمَن يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ (النساء:۱۱۰)

ترجمہ: جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو اللہ کو بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا پائے گا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ زمر کی تفسیر میں ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے۔ "باب قوله قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ......"

نیچے سبب نزول کے ضمن میں عبداللہؓ بن عباس کی روایت نقل کرتے ہیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ ایسے مشرک آئے جو بڑے قاتلوں اور بڑے زانیوں میں شمار ہوتے تھے ان کا کام اور مشغلہ ہی تھا قتل، زنا اور فساد مچانا۔ آپ ﷺ کے پاس آکر ان لوگوں نے کہا! آپ کی دعوت اور آپ کی بات بہت بہتر ہے ماننے کے لائق ہے لیکن سامنے ایک بڑی مجبوری ہے وہ یہ کہ ہم نے بڑے بڑے گناہ اور جرائم کئے ہیں، آپ یہ بتائیں کہ ان کا کفارہ کیا ہوگا؟ مشرکین کے اس سوال کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی "قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ......"

آیت کریمہ کے منطوق اور اس کے سبب نزول دونوں ہی سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم بڑا کریم اور بڑا بخشنے والا ہے۔ اس لئے کسی عاصی، خاطی، قاتل اور زانی کے دل میں گناہوں سے توبہ کا احساس جاگ اٹھا ہے تو وہ یہ نہ سوچے کہ میں نے تو بہت گناہ کیا ہے اب میری بخشش کہاں ہوگی اور میری توبہ کیسے قبول ہوگی؟ یا مثلاً کوئی کافر یا مشرک ہے اور کفر و شرک کی حالت میں نہ جانے کتنے گناہوں کا ارتکاب کیا ہوگا، کتنوں کو قتل کیا ہوگا، کتنوں کی عزت لوٹی ہوگی، کتنوں کو

ستایا ہوگا وہ سوچے اب ایمان لاکر کیا کروں گا، میری بخشش کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ جو آیت کریمہ آپ کو سنائی گئی ہے اس میں اسی سوچ اور اسی انداز فکر کی نفی کی گئی ہے۔ لیجئے چند حدیثیں آپ کو سنائی جارہی ہیں، اس سے آپ اللہ کی وسعت رحمت کا اندازہ کریں۔ اللہ آپ کو اور ہم کو توفیق بخشے۔

اللہ کی وسعت رحمت:

ابھی آپ کو جو آیت کریمہ سنائی گئی ہے اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے مسند احمد کے حوالے سے کئی حدیثیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک حدیث سماعت فرمائیں۔ حدیث کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ خادم رسول ہیں (ﷺ) کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔ آپ فرمارہے تھے! قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم اتنا زیادہ گناہ کرڈالو کہ تمہارے گناہوں سے آسمان وزمین کا خلا بھر جائے (پھر تمہیں ندامت ہو) اور اللہ سے بخشش طلب کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف فرمادے گا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے اگر تم گناہ نہیں کروگے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا جو گناہ کریں گے پھر اللہ سے معافی چاہیں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمادے گا۔ حدیث سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ معافی کو کتنا پسند کرتا ہے اور اپنے بندوں پر کتنا مہربان ہے؟

دوسری حدیث سماعت فرمائیں: یہ حدیث متفق علیہ ہے، صرف صحیح بخاری میں مختلف جگہوں پر مختلف سندوں کے ساتھ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے۔ سب کا ملا جلا مفہوم یہ ہے کہ

''اللہ تعالیٰ نے جس دن آسمان وزمین کو پیدا کیا اسی دن اللہ نے اپنی رحمت

کے بھی ایک سو(۱۰۰) حصے پیدا کئے۔ سو(۱۰۰) میں سے ننانوے(۹۹) حصے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھ لئے اور ایک حصہ اپنی مخلوق کے لئے بھیجا۔ رحمت کے ایک حصے کا نتیجہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ انسان، جن، حیوان، چرند، پرند سب آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں، پھر جب قیامت قائم ہوگی تو اللہ تعالیٰ رحمت کا وہ ایک حصہ جو اس نے اپنی مخلوق کو دیا تھا اسے بھی اپنی رحمت کے ننانوے حصوں میں شامل کر کے سو(۱۰۰) پورا کرلے گا۔ (صحیح بخاری/ رقاق/۶۴۶۹)

اللہ جل شانہ کی رحمت کا صرف ایک حصہ مخلوق کو دیا گیا ہے، تمام مخلوق میں محبت کا اور رحم و کرم کا کیا پیمانہ ہے، اس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے، لیکن اپنے انسانی معاشرے میں ہم ہر دن مشاہدہ کرتے ہیں کہ رنگ، نسل، قوم، وطن، کنبہ، قبیلہ، ذات برادری، رشتہ ناتہ، دین دھرم، ماں باپ، بیٹا بیٹی، شوہر بیوی، صنعت حرفت، مال دولت، زبان تہذیب اور نہ جانے کتنے علائق اور کتنی محبتیں ہیں جو ایک دوسرے کو اس مضبوطی کے ساتھ جکڑے ہوئی ہیں کہ آدمی اس کے پیچھے اپنی جان قربان کردیتا ہے۔

یہ محبت کا صرف ایک حصہ ہے جو ہزاروں اور لاکھوں خانوں میں بٹا ہوا ہے اس کے باوجود اس محبت میں وہ قوت ہے کہ آدمی اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا۔ اب آپ سوچئے کہ جس رحیم و کریم اللہ کے پاس اسی رحمت و رأفت کے ننانوے حصے ہوں اور قیامت کے دن مخلوق والا حصہ بھی ننانوے میں مل کر سو(۱۰۰) مکمل ہو جائے وہ اللہ اپنے بندوں پر کتنا رحیم اور کتنا شفیق ہوگا؟ اگر ایک بکری یہ نہیں چاہتی کہ میرا پاؤں میرے بچے کے اوپر پڑے اور اس کو تکلیف ہو تو اللہ تعالیٰ کب چاہے گا کہ اس کے بندے جہنم کی آگ میں جلیں اے اللہ تجھ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا اور نعمت بھری جنت میں جگہ عطا فرما۔

کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟

اللہ کی وسعت رحمت کی ایک اور مثال سماعت فرمائیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے ان قیدیوں میں ایک عورت بھی تھی جس کا بچہ کہیں گم ہو گیا تھا اور اس کی چھاتی دودھ سے بوجھل ہو رہی تھی وہ اپنے بچہ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگی پھر رہی تھی اچانک ایک بچہ کو پایا اور اس کو اپنی چھاتی سے لگا کر دودھ پلانے لگی۔ رسول اللہ ﷺ اس عورت کی پریشانی دیکھ رہے تھے۔ آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا! ''أَتُرَوْنَ هَـذِهِ طَارِحَةً وَلَدَهَا فِي النَّار '' بتاؤ! تمہارا کیا خیال ہے یہ عورت کبھی اپنے بچے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا! اللہ کے رسول امکان بھر وہ ایسا نہیں کر سکتی (مجبوری کی بات الگ ہے) رسول اللہ ﷺ نے اس مثال کے ذریعہ اللہ کے رحمت کاملہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا! ''اَللّٰهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هَذِهِ بِوَلَدِهَا'' یہ عورت اپنے بچے پر جتنی مہربان ہے اللہ تعالیٰ اس عورت سے کہیں زیادہ اپنے بندوں پر مہربان اور شفیق ہے۔

(صحیح بخاری/ادب/۵۹۹۹)

آپ نے سنا! ایک ماں کا بچہ گم ہو گیا ہے، چھاتی دودھ سے بھر گئی ہے، حیران و پریشان دوڑ رہی ہے، اپنے بچے کو تلاش کر رہی ہے، اپنا بچہ نہیں ملا تو دوسرے ہی بچے کو اٹھا لیا اور چھاتی سے لگا کر دودھ پلانے لگی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ماں کو اپنے بچے سے کتنی محبت ہوتی ہے، بھلا قدرت رکھتے ہوئے وہ اپنے بچے کو کبھی آگ میں پھینک سکتی ہے؟ نہیں یہ ناممکن ہے۔

جب ایک ماں جس کو محبت کا تھوڑا سا رحمت کا حصہ ملا ہے اتنا تھوڑا کہ اس کی
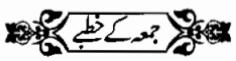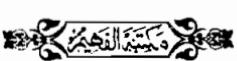
قلت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اگر وہ اپنے بچے کو آگ میں نہیں پھینک سکتی تو وہ اللہ جس کے پاس رحمت کے کامل سو(۱۰۰) حصے ہوں وہ کیسے اپنے بندوں کو جہنم کی آگ میں پھینکنا پسند کرے گا؟

سارے گناہ معاف:

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے نہایت فدائی، بہادر اور دوراندیش صحابی ہیں جب ان کی وفات کا وقت قریب ہوا تو دیوار کی طرف منہ پھیر کر زاروقطار رونے لگے۔ یہ کیفیت دیکھ کر حاضرین اور ابناء واحفاد رسول اللہ ﷺ کی بشارتوں اور عمرو بن عاص کی خدمات کا ذکر کر کے انہیں تسلی دینے لگے۔ اس کے بعد وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا! سنو ساری نیکیوں میں ہماری سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں ایمان لانے کی توفیق دی۔ مزید کہتے ہیں کہ "إِنِّی کُنتُ عَلَى أَطْبَاقٍ ثَلَاثٍ" یعنی میری زندگی کا تین دور گزرا ہے۔

پہلا دور تو ایسا تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مبغوض اور برا میرے نزدیک کوئی نہ تھا۔ اس وقت میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ کسی طرح آپ پر میں قابو پا جاؤں اور آپ کو قتل کر ڈالوں (معاذ اللہ) میری زندگی کا یہ دور ایسا تھا کہ اگر میں اسی حالت میں مر گیا ہوتا تو بلا شبہ جہنم میں جاتا۔ لیکن اللہ کا کرم ہوا کہ اس نے میرے دل میں اسلام کی محبت پیدا کی اور میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور میں نے آپ سے کہا "اُبْسُطْ يَمِينَكَ فَلْأُبَايِعْكَ" دایاں ہاتھ بڑھائیے کہ میں آپ سے بیعت کروں جب آپ نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ نے تعجب سے پوچھا! "مَالَکَ يَا عَمْرو" عمرو کیا بات ہے؟ مجھ سے بیعت کرنے کے لئے ہاتھ بڑھانے کو کہتے ہو اور جب میں نے ہاتھ بڑھایا تو تم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میں

نے کہا!"أَرَدتُ أَنْ أَشْتَـرِطَ" اللہ کے رسول ایک شرط لگانا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا!"تَشْتَـرِطُ مَـاذَا" شرط لگاؤ گے بولو!؛شرط کیسی؟ میں نے کہا! بس ایک شرط ہے۔"أَنْ يُغْـفَـرَلِي" مجھے بخش دیا جائے۔آپ نے فرمایا!"أما عَلِمتَ أن الاسلامَ يَهدِمُ ما كان قبلَه، وأن الهجرةَ تهدِمُ مَا كانَ قبلَها، وأنَّ الحَجَّ يَهدِم مَا كَانَ قَبلَه" تم کو پتہ نہیں اسلام پہلے کے تمام گناہوں کو ساقط کر دیتا ہے، ہجرت پہلے کے تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور حج، حج سے پہلے کے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

کہتے ہیں! یہ میری زندگی کا سنہرا دور تھا اس زمانے میں اللہ کے رسول سے زیادہ محبوب اور آپ سے زیادہ عظیم المرتبت میری نگاہ میں کوئی نہیں تھا، آپ کی عظمت اور جلالت کا یہ حال تھا کہ آنکھ بھر کر میں آپ کے چہرۂ مبارک پر نگاہ نہیں ڈال سکتا تھا، اگر کوئی مجھ سے کہے کہ میں آپ کا حُلیہ بیان کروں تو مجھ سے نہیں ہوسکتا اس لئے کہ آپ کی عظمت کے باعث کبھی آنکھ بھر کر میں نے آپ کو دیکھا ہی نہیں۔اگر اِن حالات میں میری موت ہوئی ہوتی تو میں اپنے لئے جنتی ہونے کی امید رکھتا۔(لیکن ایسا نہیں ہوسکا)

پھر تیسرا دور آیا۔جس میں ہمیں حکومت، امارت اور عہدے ملے اس دور میں میرا کیا حال ہوا؟ میں کچھ نہیں جانتا۔

سنو! جب میں مرجاؤں تو میرے جنازے کے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی نہ جانے پائے، میرے جنازے کے ساتھ آگ نہ لے جائی جائے۔قبر میں دفن کرنے کے بعد آہستہ آہستہ مٹی گرانا۔دفن کا کام مکمل ہوجائے تو میری قبر کے پاس اتنی دیر تک رکے رہنا جتنی دیر کسی اونٹ کے ذبح کرنے اور ٹکڑے بنا کر گوشت بانٹنے میں لگتی ہے، ایسا اس لئے کہتا ہوں کہ تمہارے رکے رہنے سے مجھے اُنس حاصل ہوگا اور اپنے

رب کے فرشتوں کو کیا جواب دینا ہے اس کو سوچ لوں گا۔ (مسلم، ایمان/۱۹۲)

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر کہے جاتے ہیں نہایت بالغ نظر اور دور اندیش انسان تھے، فن حرب اور اصابت رائے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، حضرت حسن اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی صلح میں کلیدی کردار عمرو بن عاص نے ادا کیا تھا۔ ان سارے کمالات، فضائل اور خدمات کے باوجود اپنی نیکیوں اور کارناموں پر کوئی غرہ نہیں، کوئی ناز اور گھمنڈ نہیں بلکہ ان ساری قربانیوں اور خدمات کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ ان کو شمار کیا جائے، ہاں اگر کوئی چیز ان کے نزدیک قابل شمار ہے تو وہ صرف یہ کہ اللہ نے انہیں ایمان کی دولت سے نوازا۔ اس کے برعکس ہمارا یہ حال ہے کہ اگر پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگ گئے تو بس پوچھئے مت، اللہ پر کوئی احسان کرنے لگے، اپنی اور محلے پڑوس کی نگاہ میں متقی شمار ہونے لگے...... میرے بھائیو! تقویٰ صرف نماز پڑھنے کا نام نہیں ہے، تقویٰ نام ہے امتثال امر کے ساتھ اجتناب نواھی کا، ہمارے یہاں امتثال امر تو کسی قدر ہے لیکن اجتناب نواھی مفقود ہے اس حدیث سے آپ نے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ صحابۂ کرام نبی کریم ﷺ سے کتنی زیادہ محبت کرتے تھے؟ آپ کی عظمت شان کا یہ حال تھا کہ صحابۂ کرام آنکھ بھر کر آپ کے چہرۂ مبارک پر نگاہ نہیں ڈال سکتے تھے۔

بات اللہ عزوجل کی رحمت و شفقت کی چل رہی تھی آپ نے سنا کہ کفر و شرک کی حالت میں آدمی نے چاہے جتنا گناہ کیا ہو، قتل و زنا کا ارتکاب کیا ہو، ایمان لاتے ہی سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، یہ اللہ کی اسی رحمت کا کرشمہ ہے جس کا ننانوے حصہ اللہ نے اپنے پاس رکھا ہے، صرف ایک حصہ اپنی مخلوق کو عطا کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کر لیا تو اپنے عرش کے اوپر یہ لکھ دیا کہ "إن رحمتي سبقت غضبي" میری رحمت میرے

غضب پر غالب ہے۔ (صحیح بخاری/توحید/۷۴۵۳)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ صفت رحمت کے ساتھ متصف ہے تو اس کے اندر صفت غضب بھی پائی جاتی ہے، لیکن صفت غضب پر صفت رحمت غالب ہے۔

یہ ادا اللہ کو پسند آ گئی:

ایک حدیث آپ کو سنائی جا رہی ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ مختلف جگہوں پر مذکور ہے۔ مفہوم سب کا یہ ہے۔

گذشتہ زمانے میں ایک بہت مالدار آدمی تھا جب اس کی موت کا وقت ہوا تو اس نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور کہا! یہ بتاؤ میں تمہارا کیسا باپ تھا؟ بیٹوں نے کہا! "خَیـــر أَبٍ" آپ بہت بہتر باپ تھے۔ اس نے کہا دیکھو میرے پاس نیکیاں نہیں ہیں اس لئے مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ زندہ کرے گا تو بدترین عذاب دے گا۔ لہذا میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ جب میں مر جاؤں تو خوب زیادہ لکڑیاں جمع کرو اور آگ لگا کر مجھے اسی میں جلا دو جب میرا گوشت اور ہڈیاں سب جل کر کوئلہ ہو جائیں تو اسے پیس ڈالو، پھر میری راکھ کا کچھ حصہ سمندر کے پانی میں بہا دو اور کچھ حصہ زوردار آندھی آئے تو اس میں اڑا دو (بیٹوں نے ایسا ہی کیا) اللہ تعالیٰ نے اس کے ذرات کو اکٹھا کیا اور زندہ کر کے پوچھا! بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس نے کہا! اے میرے رب! صرف تیرے خوف سے۔ اللہ کہے گا! جا؛ تجھے معاف کر دیا۔ (صحیح بخاری/انبیاء، ۳۴۷۸)

یہ حدیث ابھی جو آپ کو سنائی گئی اس میں ذکر ہے کہ جب اس آدمی نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرنے کے لئے بلایا تو اس نے کہا "فَـإِنِّـي لَـمْ أَعْمَلْ خَيْـراً قَـــطُّ" یعنی مرنے کے بعد جلانے اور راکھ کے اڑانے اور سمندر میں بہانے کی جو

وصیت کر رہاں ہوں وہ اس لئے کہ کبھی میں نے زندگی میں کوئی نیکی نہیں کی ہے۔ اس لئے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا اور کرے گا ضرور، تو میں اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن اللہ ہر چیز پر قادر ہے اس کی راکھ آندھی میں اڑائی جائے یا پانی میں بہائی جائے ہر حال میں اللہ تعالیٰ اس کو زندہ کر لے گا۔ حدیث میں اللہ کی قدرت کا بیان مقصود نہیں ہے۔ یہاں مقصود اللہ کی رحمت اور مغفرت کا بیان ہے، اور یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر کسی کے دل میں صرف اللہ کی گرفت کا احساس پیدا ہو گیا تو اللہ کی مغفرت اور جنت کے حصول کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اعمال صالحہ نہ ہوں جب بھی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جنت میں داخل کر سکتا ہے اس آدمی کی یہی ایک ادا اللہ کو پسند آ گئی اور جنت میں جانے کا بہانہ بن گئی۔ اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ اے اللہ تو ہمیں اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھ لے۔

اللہ کی رحمت کاملہ کو اور سمجھئے

آپ جانتے ہیں کہ علم، قدرت اور حیات اللہ کی صفات عالیہ میں سے ہیں اسی طرح صفت رحمت بھی اللہ کی صفات عالیہ میں سے ایک صفت ہے، یہ اور اسی طرح کی کچھ اور صفتیں مثلاً صفتِ کلام، صفت سمع و بصر وغیرہ ایسی صفتیں ہیں جو اللہ اور بندے کے درمیان مشترک ہیں، یعنی علم، قدرت، کلام، حیات اور سمع و بصر کی صفت سے اللہ بھی متصف ہے اور اس کے بندے بھی متصف ہیں، علم اور قدرت وغیرہ کی صفت اللہ میں بھی پائی جاتی ہے اور بندے میں بھی پائی جاتی ہے، اسی طرح صفت رحمت اللہ کے اندر بھی پائی جاتی ہے اور بندے کے اندر بھی پائی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اور اپنی مخلوقات پر رحم فرماتا ہے بندے بھی اپنی بیوی بچوں، ماں اور باپ پر رحم کرتے ہیں، لیکن بندے کا رحم اور اللہ کا رحم ایک جیسا نہیں ہے، اللہ کا رحم

کمال درجے کا ہے اور بندے کا رحم ناقص درجے کا ہے۔

اس فرق کو حدیث کی روشنی میں ہم کو اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ اللہ نے رحمت کے سو حصے پیدا کئے اس میں کا ننانوے حصہ اپنے پاس رکھا، صرف ایک حصہ اپنی مخلوق کو دیا اور وہی ایک حصہ لاکھوں اور کروڑوں مخلوق پھر ہر مخلوق کے کروڑوں اور اربوں افراد میں بٹا ہوا ہے اس کے باوجود ہر مخلوق میں محبت کا یہ حصہ اتنی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے کہ ہر ماں اور ہر باپ اپنی اولاد پر جان قربان کرنے کو تیار ہے، اب آپ غور کریں جس رحیم وکریم ذات گرامی کے اندر اسی رحمت کے ننانوے حصے ہوں اور پھر قیامت کے دن مخلوق کی محبت کا وہ ایک حصہ جس کے ہوتے باپ اپنی اولاد پر جان چھڑکتا ہے وہ حصہ بھی ننانوے میں مل جائے اور سو (۱۰۰) کی گنتی پوری ہو جائے اس ذات گرامی کے اندر رحمت کس کمال درجے کی ہوگی؟

اس تشریح سے شاید آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اللہ کی ذات کریمی کے اندر صفت رحمت جس درجے کی پائی جاتی ہے وہ کمال کا آخری درجہ ہے اس کے اوپر کمال کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اللہ کے بندوں کو معصیت کے ارتکاب پر کبھی بھی مغفرت، بخشش، عفو درگذر اور رحمت وشفقت کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کو جو آیات اور احادیث سنائی گئی ہیں ان کا مطلوب ومقصود یہی ہے۔

اللہ کی صفت غضب:

اللہ کی صفت رحمت کا بیان۔واقعہ کا ایک پہلو تھا، یہاں واقعہ کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ ہے اللہ کی صفت غضب، اگر ہم صفت غضب کا بیان نہ کریں تو بات ادھوری رہ جائیگی اس لئے اللہ کی صفت غضب کا پہلو بھی ہم آپ کے سامنے رکھنا چاہیں گے تاکہ دونوں پہلو ہمارے سامنے رہے۔

دنیا کی زندگی میں انسان کو مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، کبھی کشادگی اور فراخی ہے تو کبھی تنگی اور غریبی ہے، کبھی صحت وعافیت ہے تو کبھی بیماری اور خوف ہے، ان حالات میں مومن کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جب کشادگی اور خوشحالی حاصل ہوتی ہے تو وہ اللہ کا شکرادا کرتا ہے، اور جب کسی طرح کی پریشانی اور محتاجی میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ سوچ کر کہ یہ مصائب میرے گناہوں کا نتیجہ ہیں وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ توبہ اور استغفار کرتا ہے اور مصائب پر صبر کرتا ہے، زندگی کے نشیب وفراز سے کافر بھی دوچار ہوتا ہے، امیری اور غریبی کے مسائل اس کے ساتھ بھی ہیں لیکن انقلاب احوال سے وہ کوئی عبرت نہیں حاصل کرتا، وقت کے الٹ پھیر کو وہ گردش ایام سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کو اس میں اللہ کی قدرت وحکمت کارفرما نہیں نظر آتی، حالانکہ یہ ساری چیزیں اللہ کے نظام اور اس کے ارادے کے مطابق وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ کبھی اللہ کی رحمت کارفرما ہے تو کبھی اللہ کا غضب ہے۔

قرآن پاک کی متعدد آیات میں اللہ پاک نے اپنی تدبیر کے دونوں نظام کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾ (آل عمران:١٠٦)

اس دن کچھ چہرے چمکتے ہوئے روشن ہونگے اور کچھ چہرے سیاہ اور کالے ہوں گے۔

﴿إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (الاعراف:١٦٧)

بیشک تیرا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے، اور وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

سورہ اعراف کے اندر ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کو یوں بیان فرمایا ہے کہ اگر کسی بستی اور شہر کے لوگ ایمان لے آئیں، اللہ کا تقویٰ اور اس کا

خوف اپنے دل میں پیدا کریں تو اللہ تعالیٰ ان پر آسمان و زمین سے اپنی برکتوں کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ خوشحالی اور کشادگی پیدا کرتا ہے، پیداوار اور تجارت میں برکت عطا کرتا ہے، اور اگر بستی والے اللہ کو اور اس کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں، اس پر ایمان نہیں لاتے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی بداعمالیوں کیوجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے بحرانجی اور تنگی میں مبتلا کر دیتا ہے، دن اور رات کے کسی بھی حصے میں اللہ کا عذاب ان پر نازل ہوسکتا ہے، اس لئے اللہ کے عذاب اور اس کی گرفت سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہئے، اللہ کے عذاب اور اس کی گرفت سے وہی لوگ مطمئن اور بے خوف رہتے ہیں جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، یعنی کفار و مشرکین۔ مومن ایسا ہرگز نہیں کرسکتا۔ ارشاد ہے۔

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُواْ وَاتَّقَواْ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ وَلَـكِن كَذَّبُواْ فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُواْ يَكْسِبُونَ. أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَى أَن يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتاً وَهُمْ نَآئِمُونَ. أَوَ أَمِنَ أَهْلُ الْقُرَى أَن يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ. أَفَأَمِنُواْ مَكْرَ اللّهِ فَلاَ يَأْمَنُ مَكْرَ اللّهِ إِلاَّ الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ﴾ (۷/۹۶)

ترجمہ! اگر ان بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمانوں و زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا، کیا پھر بھی ان بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے فکر ہو گئے کہ ان پر ہمارا عذاب شب کے وقت آپڑے جب کہ وہ سو رہے ہوں۔ اور کیا ان بستیوں والے اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آپڑے جبکہ وہ اپنے کھیلوں میں مشغول ہوں، کیا وہ اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہو گئے ہیں، تو سن لو! اللہ کی پکڑ سے صرف وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو گھاٹا اٹھانے

والے ہیں۔

سنا آپ نے! سورہ اعراف کی ان آیات میں بار بار یاد دلایا جار ہا ہے کہ کیا بستی والے اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جس طرح ایمان اور تقوی اختیار کرنے سے اللہ کی برکتوں کے دروازے کھلتے ہیں اسی طرح نافرمانی، عصیان اور انکار و تکذیب سے اللہ کا عذاب اور اس کا غضب نازل ہوتا ہے،

آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اللہ کی رحمتوں کا بیان سن کر یکطرفہ طور پر مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے۔ بندوں پر جس طرح اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اسی طرح سرکشی اور بغاوت کی صورت میں اللہ کا غضب بھی نازل ہوتا ہے۔

اللہ کے عذاب کی شکلیں:

اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ اللہ کا عذاب کب آئیگا اور اس کی کیا شکل ہو گی اور نہ ہی آتا ہوا عذاب یہ اعلان کرتا ہے کہ میں تمہاری فلاں فلاں بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ کا بھیجا ہوا عذاب ہوں۔ بلکہ وہ اللہ کی تقدیر اور اس کے علم کے مطابق اللہ کا ایک اٹل فیصلہ ہوتا ہے جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ عذاب کس وقت اور کس شکل میں آئے گا؟

قرآن پاک میں اللہ عزوجل نے بہت ساری قوموں کی ہلاکت کا ذکر فرمایا ہے، انہیں میں قوم لوط کی تباہی کا ذکر فرمایا ہے۔

قوم لوط کی بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جب ان کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھیجا، فرشتے پہلے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور ان کو اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری دی اور قوم لوط کی تباہی کی بھی خبر دی۔ ابراہیم علیہ السلام قوم لوط کی تباہی کی خبر سن کر اس فیصلے پر فرشتوں سے تکرار کرنے

لگے۔کہا جس بستی میں اللہ کے نبی لوط علیہ السلام موجود ہوں اس بستی کو آپ لوگ کیسے ہلاک کریں گے،فرشتوں نے کہا! قوم لوط کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہے،اس لئے آپ یہ بحث وتکرار چھوڑ یئے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ﴾ (هود:٧٦)

ترجمہ! اے ابراہیمؑ اس بحث کو چھوڑ دیجئے، آپ کے رب کا حکم آپہنچا ہے اوران پر ایک اٹل عذاب آکر رہے گا۔

ابراہیم علیہ السلام چونکہ بہت رحم دل، متحمل مزاج اور آہ وزاری کرنے والے انسان تھے اس لئے قوم لوط کی تباہی کی خبر سن کر بے قرار ہو گئے اور فرشتوں سے حجت وتکرار کرنے لگے۔لیکن یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ اللہ کا رحم ابراہیم علیہ السلام کے رحم سے کہیں زیادہ ہے بلکہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے، پھر بھی اللہ کی جانب سے ابراہیم علیہ السلام کی تنبیہ ہو رہی ہے "**یا ابراھیم اعرض عن ھذا**،" اے ابراہیم اس مسئلے میں مت بولو۔تیرے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے یہ عذاب ان کے اوپر آکر رہے گا۔اندازہ کیجئے اللہ کا غضب کتنا سخت ہے؟ فیصلہ ہو جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سفارش سختی سے رد کر دی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ قوم نوح کو طوفان میں غرق کیا گیا،قوم ثمود اور اصحاب مدین زوردار دھماکہ میں ھلاک کر دیئے گئے،قوم عاد بے قابو زوردار آندھی میں تباہ کر دی گئی،یہود کو سور اور بندر بنا دیا گیا،ان مثالوں سے آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ ارشاد و رہنمائی اور مہلت وامہال کے بعد بھی اگر کوئی قوم راہ راست پر نہیں آتی تو اللہ تعالیٰ اپنا شکنجہ کسنا شروع کر دیتا ہے اور ایک دن وہ آتا ہے کہ وہ قوم صفحۂ ہستی سے مٹادی جاتی ہے۔قوم نہیں رہتی لیکن موعظت کیلئے اس کی تاریخ باقی رہتی ہے۔

آج کے خطبۂ جمعہ میں آپ کو سمجھایا گیا ہے کہ ایک طرف اللہ کی صفت رحمت ہے اور دوسری طرف اللہ کی صفت غضب۔ اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ گناہ کے بعد اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوا جائے اور صفت غضب کا تقاضا یہ ہے کہ عبادت کر کے اس کی گرفت سے کبھی بے خوف نہ ہوا جائے ایمان انہیں دو چیزوں کے درمیان ہے۔ "الایمان بین الخوف والرجاء"

اور اسی چیز کو اللہ کے نبی ﷺ نے ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے:

"اَلجنةُ أَقربُ إلٰى أحَدِكُم مِنْ شِراكِ نَعْلِه وَالنَّارُ مِثلُ ذَالِكَ"

(صحیح بخاری، رقاق: ٦٤٨٨)

تمہاری چپل کی تسمہ جتنی تمہارے قریب ہے جنت اس سے بھی زیادہ قریب ہے اور یہی حال جہنم کا بھی ہے۔

کون سا عمل جنت میں جانے کا باعث ہوگا اور کون سا عمل آدمی کو جہنم میں لے جائے گا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم اس لئے نیکی کر کے مطمئن نہیں ہونا چاہئے اور برائی کر کے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں ہر اس راستے پر چلائے جو جنت کیطرف لے جائے اور ہر اس راستے سے بچائے جو جہنم کیطرف لے جائے۔ اے اللہ ہمیں نیکیوں کی توفیق دے اور برائیوں سے محفوظ رکھ۔ آمین۔

☆☆☆

فضول خرچی معاشرے کا بوجھ

نکات:

(۱) اللہ کی نعمت کی قدر کیجئے۔

(۲) جائز امور میں بھی اسراف ناجائز ہے۔

(۳) عرف کی رعایت۔

(۴) بارات کا لشکر۔

(۵) ولیمہ اور بارات کی ضیافت۔

(۶) یہ سوچ غلط ہے۔

(۷) سنت حسنہ یا سنت سیئہ۔

(۸) فیصلہ آپ کے اوپر۔

(۹) خلاصہ کلام۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿وَلاَ تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوماً مَّحْسُوراً﴾ (اسراء/۲۹)

اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ، اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے کہ پھر ملامت کیا ہوا اور درماندہ بیٹھ جائے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿يَا بَنِي آدَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وكُلُواْ وَاشْرَبُواْ وَلاَ تُسْرِفُواْ إِنَّهُ لاَ يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾ (۷/۱۳)

اے آدم کی اولاد تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو، اور خوب کھاؤ، پیو، لیکن حد سے نہ نکلو، بے شک اللہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

تیسری آیت ہے: ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا، إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾ (۱۷/۲۶۔۲۷)

اور رشتے داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتے رہو، اور اسراف اور بے جا خرچ سے بچو۔ بیجا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔

سورہ فرقان میں ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾

اور یہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے اور نہ بخیلی کرتے ہیں، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال اختیار کرتے ہیں۔

بزرگو، نوجوانو اور عزیز بچو! خطبۂ مسنونہ کے بعد آپ کو چار آیتیں سنائی گئی ہیں ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ اپنے ہر کام میں اسراف اور زیادتی سے بچو اور اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ یہاں تک کہ عبادات اور نیکیوں میں بھی زیادتی سے احتراز کرو۔ صدقہ وخیرات ایسی نیکیاں ہیں جو گناہوں کو اس طرح مٹا دیتی ہیں جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے لیکن اس کے باوجود ان جائز امور میں بھی حد سے تجاوز نہیں کیا جائے گا۔ یہ سمجھ لینے کے بعد آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ معصیت کا ارتکاب جو ہر حال میں ممنوع ہے اس میں حد سے تجاوز اور اسراف وتبذیر کو اسلام کیسے

برداشت کر سکتا ہے؟ آج خطبہ جمعہ میں آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔
واللہ ولی التوفیق

اللہ کی نعمت کی قدر کیجئے:

انسان کے اوپر اللہ عزوجل کی بے شمار نعمتیں ہیں، ان نعمتوں میں مال اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے، حصول مال کے لئے انسان بے پناہ محنت کرتا ہے، دن رات اور سردی گرمی کی پرواہ کئے بغیر بھاگ، دوڑ میں مصروف رہتا ہے، انتھک کوشش کے باوجود کامیابی کم اور ناکامی زیادہ ہوتی ہے لیکن مال کی لالچ میں آدمی ہمت نہیں ہارتا۔ چاہتے سب ہیں کہ ہم مالدار اور دولت مند ہو جائیں لیکن کامیاب وہی ہوگا جسے اللہ چاہے۔ اس کی کائنات میں فیصلہ اسی کا چلے گا۔ معلوم یہ ہوا کہ مال و دولت کا حصول اللہ کا فضل اور اس کی دین ہے نہ کہ ہماری محنت اور ہماری حکمت۔ اس لئے اللہ کی نعمت کی قدر کرنی چاہئے کم ہو یا زیادہ۔

اللہ کے رسول ﷺ کی ایک حدیث سماعت فرمائیں اور عبرت حاصل کریں۔ ایک وقت کا پیٹ بھر کھانا بھی اللہ کی عظیم نعمت ہے، اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ قیامت کے دن اس کا بھی سوال ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ گھر سے نکلے، اتفاق سے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے فوراً ملاقات ہوگئی۔ آپ نے ان سے پوچھا کیسے نکلے ہو؟ ان لوگوں نے کہا بھوک سے بیقرار ہو کر نکلے ہیں۔ آپ نے فرمایا: میں بھی بھوک ہی کی وجہ سے نکلا ہوں۔ یہ سب لوگ ایک انصاری صحابی حضرت ابوالھیثمؓ کے گھر تشریف لائے۔ ابوالھیثمؓ اس وقت پانی لینے باہر گئے ہوئے تھے، ان کی بیوی نے آپ حضرات کو دیکھ کر خوش آمدید کہا۔ اتنے میں ابوالھیثم آ گئے۔

نبی کریم ﷺ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور کہا آج میرے مہمانوں سے بہتر مہمان کوئی نہیں پا سکتا۔ فوراً مختلف قسم کی کھجوریں لائے، ادھر ضیافت میں کھجور رکھی اور ادھر چھری لی۔ فوراً ایک بکری ذبح کی، بوٹی بنی اور دیکھتے دیکھتے گوشت پک کر تیار ہو گیا۔ سب لوگ کھجور اور گوشت کھا کر آسودہ ہو گئے۔

اس کے بعد نبی کریم ﷺ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے ارشاد فرماتے ہیں: تم لوگ اپنے گھروں سے بھوکے نکلے تھے اور اب یہ کھانے کی نعمت پا کر واپس جا رہے ہو۔ یاد رکھو:

وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہ لَتُسْأَلُنَّ عَنْ هَذا النَّعِيمِ يَومَ القِيَامَة۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، بلاشبہ قیامت کے دن تم لوگوں سے اس نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا (صحیح مسلم:۲۰۳۸)

سنا آپ نے! ایک وقت کا کھانا اللہ کا انعام ہے، اگر نہ دے تو آپ اللہ کا کیا کر لیں گے، ہم اللہ کی نعمت پا کر اترانے لگتے ہیں، حرام اور ناجائز جگہوں میں اللہ کی دی ہوئی دولت کو خرچ کرتے ہیں اور اگر جائز جگہوں میں خرچ کرتے ہیں تو اسراف اور تبذیر سے کام لیتے ہیں اور اللہ کی پکڑ کو بھول جاتے ہیں ابھی آپ نے سنا کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ ہے کوئی جو شیطان کا بھائی ہونا پسند کرے؟

جائز امور میں بھی اسراف ناجائز ہے

ابھی آپ کو جو چار آیتیں سنائی گئی ہیں، ان میں جائز اور مباح کاموں میں مال خرچ کرنے کا ذکر ہے لیکن جائز جگہوں میں بھی اسراف اور تبذیر سے بچنے کا حکم ہے، لیجئے کچھ حدیثیں بھی سماعت فرما لیں۔
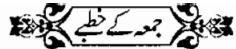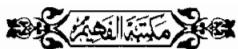
نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"كُلُو وَاشْرَبُوا وَالْبَسُوا وَتَصَدَّقُوا فِي غَيرِ إِسْرَافٍ وَلَا مَخِيلَةٍ"

کھاؤ، پیو، پہنو اور صدقہ کرو لیکن اسراف اور تکبر سے دور رہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"كُلْ مَا شِئْتَ وَالْبَسْ مَاشِئْتَ، مَاأَخْطَأَتْكَ إِثْنَتَانِ: سَرَفٌ أَو مَخِيلَةٌ"

جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو (بشرطیکہ حلال ہو) جب تک دو چیزیں تم سے دور رہیں اسراف اور تکبر۔

دونوں حدیثیں آپ کو صحیح بخاری کتاب اللباس کے شروع ہی میں مل جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے، اوڑھنے، پہننے اور زیب وزینت کی جو چیزیں حلال کی ہیں ان کو استعمال کرنے میں ہمارے اوپر کوئی تنگی نہیں ہے۔ اپنے ذوق، معیار، استطاعت اور ضرورت کے مطابق ضروریات زندگی کو استعمال کرنے میں ہم آزاد ہیں۔ ہاں اسراف، فضول خرچی اور فخر وتکبر سے بچنا ضروری ہے۔

حضرت کعب بن مالکؓ اللہ کے رسول ﷺ کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ یہ غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہوسکے تھے۔ سرزنش کے طور پر ان کا سماجی بائیکاٹ ہوا۔ پچاس دن کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی۔ جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو وہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قبولیت توبہ کی خوشی میں رسول اللہ ﷺ سے کہتے ہیں اللہ کے رسول میری توبہ کی قبولیت کا تقاضا ہے کہ میں اپنے کل مال سے دست بردار ہو جاؤں اس لئے میں اپنا کل مال اللہ اور اس کے رسول کے حضور صدقہ کررہا ہوں۔ رسول کریم ﷺ ان سے فرماتے ہیں أَمْسِكْ عَلَيكَ بَعْضَ مَالِكَ اپنا کچھ مال روک لو۔ آپ جانتے ہیں صدقہ ایک عبادت ہے، قرآن وحدیث

میں مختلف ناحیوں سے صدقہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور یہاں کعب بن مالک کو کل مال صدقہ کرنے سے روکا جارہا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ قبولیت توبہ کی خوشی میں کل مال کا صدقہ کرنا ایک طرح کی زیادتی ہے۔ ایسی صورت میں آدمی خود محتاج ہوجائے گا اور اسلام فقر محتاجی کی تعلیم نہیں دیتا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مکہ میں بیمار پڑ گئے رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کو گئے تو انھوں نے کہا: اللہ کے رسول میں مالدار آدمی ہوں اور میری ایک بیٹی ہے، میں اپنا کل مال وصیت کردیتا ہوں آپ نے فرمایا نہیں۔ انھوں نے کہا اچھا دو تہائی، آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر انھوں نے کہا اچھا آدھا کرتا ہوں آپ نے کہا نہیں۔ پھر کہا اچھا ایک تہائی وصیت کرتا ہوں آپ نے فرمایا ایک تہائی کرسکتے ہو لیکن یہ بھی زیادہ ہے۔ (صحیح بخاری/وصایا)

جو آیتیں اور حدیثیں آپ کو سنائی گئی ہیں ان میں جائز اور ثواب کی جگہوں میں مال خرچ کرنے کا ذکر ہے۔ لیکن آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ جائز اور واجبی نفقات کے اندر بھی ہم بے لگام نہیں ہیں، ہر قدم پر اعتدال کا دامن تھامے رہنا ہے۔

عرف کی رعایت

اب آیئے ہم آپ کو بتائیں کہ اخراجات اور نفقات کے سلسلہ میں اللہ نے ہمیں کیا اصول اور کیا ضابطہ دیا ہے۔ آیات کریمہ سماعت فرمائیں

﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (بقرۃ:۲۳۳)

اور مولود لہ (باپ) کے ذمہ ان عورتوں کا روٹی کپڑا دستور کے مطابق

ہے۔ ہر شخص اتنی ہی تکلیف دیا جاتا ہے جتنی اس کو طاقت ہے۔

آیت کریمہ میں ایک ضابطہ بتایا جارہا ہے کہ اگر شوہر اور بیوی میں طلاق ہوگئی اور ماں کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہے تو باپ کو دینے سے اور ماں کو دودھ پلانے سے انکار نہیں کرنا چاہئے اگر ماں بچے کو دودھ پلانے پر آمادہ ہے تو ایسی صورت میں اس کے کھانے اور کپڑے لتے کا خرچہ باپ کو دینا ہوگا۔ لیکن کیسے؟ بتایا گیا دستور کے مطابق۔ یعنی جس معاشرے کا یہ واقعہ ہے وہاں کھانے پینے اوڑھنے پہننے کا جو معیار ہے اسی کے مطابق ماں کو دودھ پلانے کا خرچہ دیا جائے گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَمَن كَانَ غَنِيّاً فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَن كَانَ فَقِيراً فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (النساء:٦)

(ولی) اگر مالدار ہے تو وہ یتیم کا مال کھانے سے بچے اور اگر فقیر ہے تو دستور کے مطابق کھالے۔

آیت کریمہ میں بتایا جارہا ہے کہ ولی اگر مالدار ہے تو یتیموں کا مال کھانے سے بچے اور اگر فقیر اور محتاج ہے تو اپنا حق المحنت لے سکتا ہے لیکن اس کا خیال رہے کہ اس معاشرے میں کھانے پینے کا جو معیار اور دستور ہے اس کے مطابق لے۔ معاشرے میں اگر دال روٹی کھانے کا دستور ہے تو ولی کے لئے جائز نہیں ہے کہ مرغ اور مچھلی کھانا شروع کردے۔

صرف دو آیتیں آپ کو سنائی گئی ہیں، ان کے علاوہ متعدد آیتیں ہیں جن میں دستور کے مطابق نان نفقہ کا حکم دیا گیا ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں کو پیش کر کے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شریعت نے

اخراجات میں اور نان نفقہ میں عرف اور دستور کا لحاظ کیا ہے، خصوصاً ایسے اخراجات جو شخصی نہیں عوامی سطح پر ہیں۔ مثلاً عقیقہ ہے، شادی ہے، ولیمہ ہے، مہر ہے۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہر فرد کی ضرورت ہے اس لئے اگر اللہ نے آپ کو کافی وسعت دی ہے تب بھی پورے معاشرے کو سامنے رکھ کر ہاتھ پاؤں پھیلائیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی خوشی اور آپ کی فراخی سماج کے لئے مصیبت کا سبب بن جائے۔

یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ جائز اور مباح کاموں میں بھی اعتدال کی راہ اختیار کرنی چاہئے اور اسراف اور تبذیر سے بچنا چاہئے۔ اب ہم آپ کی توجہ اپنے معاشرے کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کچھ ایسی خرابیاں در آئی ہیں جو جھوٹی شہرت، خودنمائی اور اسراف و تبذیر کا نتیجہ ہیں۔ ان میں کچھ تو اصلاً مباح اور جائز بلکہ سنت ہیں اور کچھ ایسی رسمیں ہیں جن کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن ہماری ناک اونچی رہے کہ زعم فاسد نے انہیں خوب پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ یہ فاسد رسمیں معاشرے کے لئے عذاب بن گئیں ہیں۔ سماعت فرمائیں۔

بارات کا لشکر

شادی، بیاہ میں کچھ ایسی رسمیں داخل ہوگئی ہیں جن کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے بارات بھی انہیں رسموں میں سے ایک رسم ہے۔ بارات صرف ہندوؤں کی نقل اور تقلید ہے یا اس کی کوئی اصل بھی ہے؟ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ صاحب مرعاۃ المفاتیح حضرت الشیخ عبیداللہ الرحمانی رحمہ اللہ سے ناچیز کی گفتگو ہو رہی تھی تو شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بارات کی ابتداء اس طرح ہوئی ہوگی کہ شادی کے لئے رشتے دور دراز گاؤں، دیہات اور قبیلوں میں طے ہوتے تھے۔ قدیم زمانے میں آمد و رفت اور

سواریوں کا زیادہ انتظام نہیں ہوتا تھا اکیلے دو کیلیے سفر کرنا مشکل ہوتا تھا۔ لوٹ پاٹ کا خطرہ بھی رہتا تھا۔ خاص طور سے جب ساتھ میں عورتیں ہوں اور دولہن کو رخصت کرا کے لانا ہوتو یہ خطرہ اور زیادہ بڑھ سکتا ہے۔ اس لئے دولہن کو رخصت کرانے کے لئے قافلہ کی ضرورت پڑتی ہوگی جس میں دس، پندرہ آدمی ہوں تا کہ بے خوف ہو کر دلہن کو رخصت کرا کے لایا جا سکے۔

یہ توجیہ کسی قدر سمجھ میں آتی ہے۔ ممکن ہے شروع شروع میں ضرورت کی بناء پر چند لوگ مل کر جاتے ہوں اور دلہن کو رخصت کرا کے لاتے ہوں۔ لیکن بعد میں یہ ایک رسم بن گئی دور دراز کا تصور ختم ہو گیا اب اگر ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں جانا ہوتب بھی بارات کا لشکر ساتھ رہتا ہے۔

شادی کے موقع پر اگر لڑکے کے گھر والے یا رشتے ناتے والے دس بیس کی تعداد میں لڑکی کے گھر رخصت کرانے کے لئے جائیں اور وہاں ان کی ضیافت کی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اب بارات کی رسم اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ باراتیوں کی تعداد پر باقاعدہ مول تول ہوتا ہے، بعض دفعہ تعداد کی کمی بیشی پر آپس میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ بعض بعض جگہوں پر یہ رسم ہے کہ باراتیوں کی تعداد پانچ سو سے کم نہیں ہو سکتی۔ ہاں ایک ہزار تک یہ تعداد پہنچ سکتی ہے۔ یہ طریقہ بلاشبہ شریعت کی روح کے منافی ہے۔ لڑکی والوں کے ذمہ کسی طرح کے اخراجات کا بار نہیں ہے۔ جو کچھ لینا دینا، اور کھانا کھلانا ہے وہ لڑکے والوں کے ذمہ ہے۔ یہ بھی سنا جاتا ہے کہ جھوٹی شہرت اور عزت حاصل کرنے کے لئے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ بارات ہاتھی پر آئے گی گھوڑے پر آئے گی، ماروتی سے آئے گی، بولٹ سے آئے گی، ناچ گانے، بینڈ باجے، بھانٹ بھڑوے کے ساتھ آئے

گی، سہرہ پڑھا جائے گا، ویڈیو فلم تیار ہوگی، ہوائی فائرنگ ہوگی، خبروں کے مطابق ایسا بھی ہوا ہے کہ لبلبی دب گئی کوئی زد میں آ گیا اور اس کی جان چلی گئی۔ بار ہا ایسا بھی ہوا ہے کہ باراتیوں اور گھراتیوں میں اختلاف ہوگیا، مار پیٹ ہوگئی اور بندوق بھی چلی گئی۔ دھماکے، پٹاخے، آتش بازی دراصل آتش پرستی کی ایک صورت ہے اور مجوسیوں کے لئے عبادت ہے، اس لئے ان کے تشبہ سے بہرحال بچنا چاہئے لیکن آپ آتش بازی پر ذرا اس ناحیہ سے غور فرمائیں تو اس کی قباحت کا اندازہ ہوگا کہ آپ اپنی محنت کی کمائی اپنی ضروریات زندگی میں نہ خرچ کر کے اپنے ہی پیسوں اور اپنی ہی کمائی میں آگ لگا رہے ہیں۔ دنیا میں ایسا کوئی احمق نہیں ملے گا جو دن رات کمائے اور محنت کرے، اس کے بعد اپنی کمائی میں آگ لگا دے، آتش بازی میں یہی ہوتا ہے ہم نے دیکھا بھی ہے اور سنا بھی ہے جب بارات کا لشکر دروازے پر یا اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا تو دھماکہ شروع ہو جائے گا۔ پٹاخوں کی چٹائی بنتی ہے تاکہ لگاتار، مسلسل آدھے گھنٹے تک تڑاتڑ کی آواز آتی رہے اور دھماکہ ہوتا رہے۔ کتنوں کی گفتگو میں خلل ہو رہا ہے، کتنے گھبرا رہے ہیں، کتنوں کی نماز خراب ہو رہی ہے نام ونمود کے ان دیوانوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں اور ہیں مسلمان۔ میرے بھائیو! اس سے بری فضول خرچی کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ ہزاروں روپئے خرچ کرنے کے بعد ہی یہ پٹاخے خریدے جاتے ہیں اور ان کی چٹائیاں بنتی ہیں پھر اپنی گاڑھی کمائی میں آگ لگا دی جاتی ہے۔

ولیمہ اور بارات کی ضیافت

مہمان کی ضیافت شرعی امر ہے حدیث میں ضیافت کی تاکید کی گئی ہے اور

اس کو باعث ثواب بتایا گیا ہے، شادی میں آنے والے مہمانوں کی بھی عزت کی جائے گی لیکن شریعت کے اوامر ونواہی کو مدنظر رکھا جائے گا، ایسا نہ ہو کہ قدم جادۂ شریعت سے بہک جائے اور بجائے ثواب کے یہی ضیافت عذاب بن جائے۔ بسوں اور گاڑیوں کے ذریعہ سینکڑوں کی تعداد میں جب باراتی فوج دروازے پر پہنچتی ہے تو پہلے ناشتہ کے نام پر ان کی پرتکلف ضیافت کی جاتی ہے، جس میں عمدہ سے عمدہ نوع بنوع شیرینیاں، نمکین، مشروبات، پھل فروٹ سے لے کر کاجو اور بادام اتنی وافر مقدار میں ہوتا ہے کہ کوڑے دان میں پھینکنا پڑتا ہے۔ ایک کا بچا ہوا دوسرا نہیں لے سکتا۔ کتنے ایسے اللہ کے بندے ہیں جنھیں رمضان میں بھی حریرہ بنانے کے لئے کاجو اور بادام نصیب نہیں ہوتا اور یہاں اس کا جھاڑو لگایا جاتا ہے، یہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کی اتنی بڑی ناقدری ہے کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ تو بارات کا ناشتہ ہوا، کھانا دو قسم کا تیار کیا جائے گا، عام مدعوین کے لئے الگ اور باراتیوں کے لئے الگ۔ عام مدعوین کے لئے بھی ایک سے دو قسم کا سالن ہو سکتا ہے ضیافت میں کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن باراتیوں کے لئے مختلف آئیٹم ہوتے ہیں اور ساتھ میں بطور تفکہ پھل فروٹ اور میوے جات بھی اتنی وافر مقدار میں ہوتے ہیں کہ کھانا جو ساری کمائی کا حاصل ہے اس کی ناقدری اور بے حرمتی ہونے لگتی ہے۔

آدمی اپنی وسعت اور طاقت کے مطابق چھوٹا یا بڑا ولیمہ کر سکتا ہے، کھانے میں کمی، بیشی، اونچا نیچا کر سکتا ہے، لیکن معاشرے کے دستور سے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ شریعت نے عرف اور دستور کا اعتبار کیا ہے۔ آپ کو اللہ نے دولت دی ہے، شوق میں آپ نے ایک سے دو آئیٹم کر دیا۔ دوسرے صاحب دولت نے تین کر دیا، ہوتے ہوتے رواج بڑھتا گیا آپ کا شوق تو پورا ہو گیا۔ لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا

کہ ہمارے پاس پڑوس میں غریب اور مسکین بھی بستے ہیں، ان کی بھی بچیاں ہیں اور ان کے بھی سینے میں دل ہے وہ بھی چاہیں گی کہ ہماری بارات اسی کروفر کے ساتھ آئے اور ضیافت کا یہی معیار ہو، لیکن اس کے لئے یہ ممکن نہیں۔ اب آپ ہی بتائیں اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ اس ذہنی کرب کا ذمہ دار کون ہوگا؟ آپ اپنے گھر کے اندر اپنے معیار کے مطابق اسراف سے بچتے ہوئے جو چاہیں پکائیں کھائیں لیکن شادی بیاہ کی دعوت اور ولیمہ کا تعلق معاشرے سے ہے اس لئے سب کی رعایت کرنی چاہیئے۔ اسراف میں نام پیدا کرنا اچھی بات نہیں ہے۔

یہ سوچ غلط ہے

کچھ مالدار اور تعلیم یافتہ کہے جانے والے گھروں میں یہ تصور پیدا ہوگیا ہے کہ دولت ہماری کمائی اور محنت کا نتیجہ ہے لہٰذا ہم اپنی کمائی جیسے چاہیں جہاں چاہیں خرچ کریں کسی سے کیا مطلب؟ اس لئے قیام وطعام کے جھنجھٹوں سے بچنے کے لئے وہ مہنگے اور قیمتی ہوٹلوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں، اور ان ہوٹلوں میں مہمانون کا استقبال کرنے والی نوخیز لڑکیاں ہوتی ہیں۔ مطعومات اور مشروبات کو نیم برہنہ انداز میں وہی اپنے دست نازک سے پیش کرتی ہیں، باراتیوں میں مختلف مزاج کے لوگ ہوتے ہیں، کتنوں کی نگاہیں شرم سے جھک جاتی ہیں اور کتنے ٹکٹکی باندھ لیتے ہیں۔

میرے بھائیو یہ روشن خیالی نہیں بلکہ مسلم معاشرے میں بے حیائی اور بے شرمی کو فروغ دینا ہے اور سنت سیئہ کی بنیاد رکھنا ہے، آیئے آپ کو ایک حدیث سناتا ہوں۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ صبح کے وقت ہم

لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں قبیلہ مضر کے کچھ لوگ آ گئے۔ ان کی غربت کا حال یہ تھا کہ ایک اونی موٹا کمبل بیچ سے پھاڑ کر گلے میں ڈالے ہوئے تھے (یہی ان کا لباس تھا) اور گردن میں تلوار لٹک رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کی بیکسی، محتاجی اور غربت کا یہ حال دیکھا تو آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا۔ نماز کا وقت ہوا۔ آپ نے نماز پڑھی پھر خطبہ دیا آپ نے ان غریبوں کی غمخواری اور تعاون کے لئے چندہ کی اپیل کی آپ نے فرمایا جس کے پاس جو ہو لے کر آئے دینار، درہم، کپڑا، اناج، کھجور، یہاں تک کہ کھجور کی ایک قاش لاسکتا ہے تو وہی لے کر آئے۔

سب سے پہلے ایک انصاری صحابی ایک تھیلا بھر کر سامان لائے اس کے بعد چندہ دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اور دو ڈھیر لگ گیا۔ کھانے کا الگ اور کپڑے کا الگ۔ یہ نقشہ دیکھ کر نبی کریم ﷺ اتنا خوش ہوئے کہ آپ کا چہرۂ مبارک چمک اٹھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آپ کے چہرۂ مبارک پر سونا مڑھ دیا گیا ہو۔ اس کے بعد اللہ کے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

مَنْ سَنَّ فِی الإِسْلامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِن غَيرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِم شَيئٌ وَمَنْ سَنَّ فِی الإِسْلامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعدِه مِنْ غَيرِ أَنْ يَنْقُصَ مِن أَوْزَارِهِم شَيئٌ (صحیح مسلم، ۱۰۱۷)

یعنی جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کو اس کا اجر ملے گا اور جتنے لوگ اس کے بعد اس اچھے طریقے پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اس کو ملے گا لیکن ان کے اجروں میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جس کسی نے کوئی برا طریقہ جاری

کیا تو اس پر اس کے اپنے گناہ کا بوجھ ہوگا اور پھر ان تمام لوگوں کے گناہ کا بوجھ ہوگا جو اس کے بعد اس غلط طریقے پر عمل کریں گے اور ان کے گناہ کے بوجھ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

سنت حسنہ یا سنت سیئہ؟

حدیث کا مطلب واضح ہے۔ ایک ہے سنت حسنہ اور ایک ہے سنت سیئہ جس نے سماج اور معاشرے مین کوئی نیکی کا طریقہ جاری کیا تو اس کو اس نیکی کا ثواب تو ملے گا ہی بعد میں جتنے لوگ اس نیک راستے پر چلیں گے ان کو اس کا ثواب دے کر اتنا ہی ثواب اس پہلے شخص کو دیا جائے گا جس نے اس نیکی کی بنیاد رکھی ہے۔

اسی طرح اگر معاشرے میں کوئی برائی یا کوئی غلط رسم رائج نہیں تھی لیکن کسی نے اپنی شہرت، نام ونمود اور اپنی شان بان کے لئے کوئی غلط رسم جاری کر دی تو اس کا گناہ تو اس کو ملے گا ہی۔ بعد میں جتنے لوگ اس غلط اور برے طریقے پر چلیں گے سب کو ان کا گناہ دے کر اتنا ہی گناہ اس پہلے شخص کو دیا جائے گا جس نے اس غلط رسم کو جاری کیا ہے۔

میرے بھائیو! قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے اوصاف میں ایک وصف یہ بھی بتایا ہے کہ:

﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (۷/۱۵۷)

اور لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو وہ نبی دور کرتے ہیں۔

یعنی مرنے، جینے، شادی بیاہ، خوشی اور غمی میں قوم کے اندر جو رسم ورواج

لوگوں کی گردن کا بوجھ اور گلے کی پھانسی بنے ہوتے ہیں، نبی کریم ﷺ ان کو توڑتے اور دور کرتے ہیں اور قوم کے بوجھ کو ہلکا کرتے ہیں۔ آپ نے ایسا کر کے دکھایا ہے، چنانچہ صرف اسلام لانے پر، قرآن کریم کی چند سورتیں یاد کرانے پر آپ نے شادیاں کر دیں، آپ نے خود اپنی شادی کے ولیمہ میں، کھجور، ستو اور گھی کا مالیدہ کھلانے پر اکتفاء کیا، بارات کا کہیں نام و نشان نہیں۔ آپ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ ”خیر النکاح أیسرہ“ (سنن ابوداؤد/۲۱۱۷) سب سے بہتر نکاح وہ ہے جو سب سے آسان ہو۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے قول و فعل سے نکاح اور شادی کو آسان بنایا تھا لیکن ہم نے اس کو مشکل ترین بنا دیا۔ شادی کسی غریب کی ہو یا کسی امیر کی، مہینوں پہلے اس کی تیاری کرنی پڑتی ہے غریبوں کو سالوں پہلے تیاری کرنی پڑتی ہے اور بدرجہ مجبوری قرض بھی لینا پڑتا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے ایک عورت نے کہا! اللہ کے رسول ﷺ میں اپنے کو آپ کے حوالہ کر رہی ہوں، آپ اپنی زوجیت میں لے لیں۔ لیکن آپ کو ضرورت نہیں تھی آپ نے سکوت اختیار کیا، اتنے میں مجلس کے ایک آدمی نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ اگر آپ کو ضرورت نہیں ہے تو مجھ سے شادی کر دیجئے۔ آپ نے کہا: مہر میں کیا دو گے؟ اس نے کہا (غریب آدمی ہوں) میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: گھر جا کر دیکھو اگر لوہے کی انگوٹھی مل جائے تو وہی لے کر آؤ اسی کے عوض شادی کر دوں گا۔ وہ آدمی گیا اور آ کر کہا اللہ کے رسول وہ بھی نہیں ہے۔ صرف یہی ایک چادر ہے جو میرے جسم پر ہے۔ اسی میں سے آدھی پھاڑ کر اس کو دیدیں۔ آپ نے فرمایا: پھاڑ دو گے تو نہ تمہارے کام آئے گی نہ تمہاری بیوی کے، اچھا یہ بتاؤ تمہیں قرآن کی کچھ سورتیں زبانی یاد ہیں؟ اس نے کہا ہاں فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں۔ آپ

نے فرمایا: جاؤ یہ سورتیں اسے یاد کرادینا، یہی تمہارا مہر ہوگا۔

سنا آپ نے کتنا آسان نکاح ہے؟ نہ بارات، نہ ولیمہ، نہ کپڑا، نہ جوڑا، نہ زیور، نہ پٹاخہ، نہ ڈھول اور سہرا۔ قرآن کریم کی چند سورتیں یاد کرانے کے وعدے پر اسی مجلس میں شادی ہوگی۔ ہمارے معاشرے میں کتنی ایسی مثالیں ملیں گی کہ لڑکا مولوی یا حافظ ہے اس لئے اس سے شادی نہیں ہوگی۔

اسلام کی تعلیمات کا اگر آپ رسم ورواج کی بندش سے اوپر اٹھ کر سچائی سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ شادی بیاہ اور مرگ ووفات کے مسئلہ کو اسلام نے نہایت آسان اور سستا بنا کر پیش کیا ہے لیکن ہماری جاہلانہ رسومات اور اسلام بیزاری نے انہیں دونوں مسئلوں کو سب سے اہم اور مشکل بنا دیا ہے۔ لڑکا ہو یا لڑکی پیدا ہونے کے ساتھ بے جا تکلفات شروع ہوجاتے ہیں، عقیقہ اور ختنہ شرعی چیزیں ہیں لیکن ان میں بھی کپڑے اور جوڑے کا اہتمام! کارڈ اور لمبی لمبی دعوتوں کا انتظام ہوتا ہے، بچے قرآن ختم کریں تو، سند فراغت حاصل کریں تو، مکان یا دکان کا افتتاح ہو تو، حج یا عمرے کا سفر ہو تو، رشتہ کی منگنی اور پکی ہو تو یہ سب خوشی کے مواقع ہیں ان موقعوں پر خوشی کا اظہار یا دعوت کا اہتمام حرام یا ناجائز نہیں کہا جارہا ہے لیکن تکلفات اتنے بڑھ گئے ہیں کہ یہ خوشی معاشرے کا بوجھ بن گئی ہے۔

فیصلہ آپ کے اوپر

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ”مَنْ سَنَّ فِي الإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً“ آپ کو پہلے سنائی جاچکی ہے، اس کی روشنی میں ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ کسی گاؤں اور سماج میں اگر بارات کی، بینڈ باجے کی، آتش بازی کی، منہ دکھائی کی،

نیوتہ کی، جہیز کی، تلک کی رسم نہیں تھی مگر کسی دولت مند نے اپنی دولت کا سہارا لے کر اس طرح کی کسی رسم کو جاری کر دیا اور بعد میں وہ رسم چل پڑی اور لوگ اس پر عمل کرنے لگے تو اس نے ایک سنت سیئہ کو جاری کیا، اس کا گناہ تو اس کو ملے گا ہی، بعد میں جتنے لوگ اس غلط رسم پر عمل کریں گے ان کو گناہ کا بوجھ اٹھانے کے بعد اتنا ہی گناہ اس پہلے شخص کو دیا جائے گا جس نے اس غلط رسم کو جاری کیا۔

اسی طرح اگر کسی گاؤں اور سماج میں یہ رسمیں پائی جا رہی تھیں مگر کسی اللہ کے بندے نے محسوس کیا کہ یہ رسومات قوم کی گردن کا بوجھ ہیں، سماج کے لئے نقصان دہ ہیں، شریعت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس نے ہمت کر کے ان رسموں کو توڑ دیا اور اس کی دیکھی دیکھا اور لوگوں نے بھی ان رسموں کو توڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس گاؤں اور سماج سے یہ رسمیں ختم ہو گئیں تو وہ شخص ایک سنت حسنہ کو قائم کرنے والا ہوا۔ اس کو اس کا ثواب مسلسل ملتا رہے گا۔ اب؟ آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہم سنت حسنہ کے قائم کرنے والے بنیں یا سنت سیئہ کے قائم کرنے والے بنیں؟

خلاصۂ کلام

آج خطبہ جمعہ میں جو باتیں آپ کے گوش گزار کی گئی ہیں ان کا خلاصہ ایک بار اور سماعت فرمالیں۔

(۱) آپ کو یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حلال اور مباح قرار دیا ہے، ان کے کھانے، پینے، پہننے اور استعمال کرنے میں ہمارے اوپر کوئی تنگی نہیں ڈالی گئی ہے۔ لیکن ان جائز امور کے استعمال میں بھی یہ پہلو ضرور ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ اسراف اور تکبر کو کسی طرح راستہ نہ ملنے پائے۔ اگر کسی قسم کے اسراف اور تکبر کا شائبہ

آ گیا تو یہ جائز امور بھی ناجائز ہو جائیں گے۔

(۲) دوسری بات یہ بتائی گئی کہ جب جائز امور میں اسراف، تبذیر اور خودنمائی کی اجازت نہیں ہے تو بھلا وہ امور جو ابتداء ہی سے حرام اور ناجائز ہیں ان کے ارتکاب اور پھر ان میں اسراف اور ریاء اور نمود کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟

(۳) جو چیزیں سماج اور معاشرے سے متعلق ہیں اور جائز ہیں، ان میں عرف اور دستور کی رعایت کرنی چاہئے تاکہ غرباء اور فقراء کے لئے مشکل نہ پیدا ہو۔

(۴) آپ کو یہ بتایا گیا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی پاکیزہ تعلیمات کے ذریعہ ان ساری جاہلانہ رسومات کو توڑ دیا جو قوم کی گردن کا بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ اور آپ نے دین کو نہایت آسان شکل میں پیش کیا۔ خصوصاً موت وحیات اور شادی بیاہ کے مسائل جو زندگی کے سب سے اہم مسائل ہیں ان کو آسان بنا کر عملی شکل میں پیش کیا۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اللہ کے نبی نے جو طوق اور بوجھ ہماری گردن سے اتارا تھا اس کو ہم نے خودنمائی کے شوق اور برادران وطن کی تقلید میں اپنی گردن میں ڈال لیا۔ اور یہ رسومات قوم کے لئے عذاب بن گئیں۔

(۵) آخری بات یہ بتائی گئی کہ راستے دو ہیں۔ سنت حسنہ اور سنت سیئہ۔ ہمیں چاہئے کہ ہم سنت حسنہ کے قائم کرنے والے بنیں نہ کہ سنت سیئہ کے قائم کرنے والے۔

اخیر میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں کتاب وسنت پر عمل کرنے کی توفیق بخشے اور اپنی رحمتوں کے سایہ میں رکھے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

☆☆☆

اللہ غالب حکمت والا ہے

نکات:

(۱) اللہ کی قدرت کاملہ۔

(۲) اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا۔

(۳) ریکارڈ تیار ہو رہا ہے۔

(۴) وہ سن رہا ہے۔

(۵) سنبھل کر قدم رکھئے۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد آپ کو قرآن کریم کی چند آیتیں سنائی جا رہی ہیں۔ ان آیتوں کو سنا کر ہم آپ کو یہ بتانا چاہیں گے کہ وہ اللہ جس کی ہم بے دیکھے عبادت کرتے ہیں اس کی حکمتوں اور قدرتوں کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ آیتیں سماعت فرمائیں۔

اللہ عزوجل کا فرمان ہے۔

اللہ کی قدرتِ کاملہ

(۱) ﴿قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (۱۶/۱۳)

اے نبی (ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمام چیزوں کا خالق ہے، وہ اکیلا ہے اور زبردست غالب ہے۔

(۲) ﴿يَوْمَ هُم بَارِزُونَ، لَا يَخْفَى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ، لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (۱۶/۴۰)

جس دن سب لوگ (اپنی قبروں سے) ظاہر ہو جائیں گے، ان کی کوئی چیز

اللہ سے پوشیدہ نہیں رہے گی، آج کس کی بادشاہی ہے؟ صرف ایک اللہ کی جو سب پر غالب ہے۔

(۳) ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۱۲/۲۱)

اللہ اپنے ارادے پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جان پاتے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے غلبہ کا ذکر حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں بیان فرمایا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ وقت یاد کیجئے جب وہ بچے تھے، حد درجہ مجبور تھے، بھائیوں نے حسد کے نتیجے میں ان کو کنوئیں میں پھینک دیا تھا اور مطمئن ہو گئے تھے کہ یوسف مر گئے ہوں گے۔ لیکن اللہ کی حکمت اور مصلحت اپنا کام کر رہی تھی، کنوئیں سے نکالے گئے، مصر کے بازار میں فروخت ہوئے، عزیز مصر کے غلام بنے، ایک عورت کے مکر کے شکار ہوئے، جیل گئے، ناکردہ گناہ کی سزا کاٹی، پھر ایک دن وہ آیا کہ مصر کے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے اور جن بھائیوں نے انھیں موت کے منہ میں ڈھکیلا تھا وہی بھائی ان کے سامنے شرم وندامت سے سجدہ ریز ہیں۔ چالیس یا اسی سال کے طویل عرصے میں اللہ کی حکمت کام کر رہی تھی، اسی کو کہا جاتا ہے اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ وہ کہاں سے آتا ہے کوئی نہیں جانتا۔

(۴) ﴿وَلَوْلَا أَن يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَن يَكْفُرُ بِالرَّحْمَـٰنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقُفًا مِّن فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ﴾ (۴۳/۳۳)

اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تمام لوگ ایک امت ہو جائیں گے تو اللہ کے ساتھ کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتوں کو ہم چاندی کی بنادیتے اور زینوں کو (بھی) جن پر وہ چڑھا کرتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور دنیا کی حقارت کو بیان فرما رہا ہے۔ایک حدیث کے اندر اللہ کے نبی ﷺ بیان فرماتے ہیں کہ اگر اللہ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی دنیا کی وقعت ہوتی تو وہ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی نہیں دیتا۔ آیت کریمہ میں اللہ عزوجل فرما رہے ہیں کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اللہ کے منکروں اور کافروں کے مکانات، سیڑھیاں، دروازے اور تخت، سونے اور چاندی کے بنادیں لیکن ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ کافروں کی یہ نعمتیں دیکھ سارے لوگ کافر ہو جائیں گےاور یہ اللہ کو مطلوب نہیں ہے۔

(۵) ﴿وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لاَ يَعْلَمُهَا إِلاَّ هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلاَّ يَعْلَمُهَا وَلاَ حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الأَرْضِ وَلاَ رَطْبٍ وَلاَ يَابِسٍ إِلاَّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾(۵۹/۶)

اور اسی کے پاس ہیں غیب کی کنجیاں، ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جو کچھ خشکی میں اور دریاؤں میں ہے وہ سب کو جانتا ہے، اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے، اور کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین میں ہے۔

یہ اللہ کی وسعت علم کا بیان ہے، اس کے احاطۂ علم سے کوئی چیز باہر نہیں ہے آسمان وزمین کے بیچ کتنی مخلوقات ہیں؟ آسمان میں کتنے تارے ہیں؟ زمین کی تہوں میں کتنے خزانے ہیں؟ کیا کیا ہیں اور کہاں ہیں وہ سب کی تفصیل جانتا ہے، دریاؤں اور سمندروں میں کتنی مچھلیاں ہیں؟ کتنے جانور ہیں؟ پانی کے کتنے قطرات ہیں دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے کتنے ذرات ہیں؟ اللہ سب کی تفصیل جانتا ہے، اب آپ غور کریں جس کے علم کی وسعت کا یہ حال ہو، اس کی حکمت کتنی غالب

اور اس کا انتظام کتنا پائیدار ہوگا؟ ہے کوئی جو اس کا اندازہ کر سکے؟

(٦) ارشاد ہے: ﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ ، وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ، وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَكِن لَّا تُبْصِرُونَ ، فَلَوْلَا إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ، تَرْجِعُونَهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ (٥٦/٨٣-٨٧)

پس جب کہ روح حلق میں آ کر اٹک جائے، اور اس وقت تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہو، اور ہم بنسبت تمہارے اس مرنے والے کے زیادہ قریب ہوتے ہیں، لیکن تم دیکھ نہیں سکتے، پس اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنی اس بات میں سچے ہو تو (ہم اس روح کو کھینچتے ہیں) تم اس کو لوٹا لو۔

کوئی مائی کا لال آج تک دنیا میں ایسا پیدا نہیں ہوا جو اللہ کے اس چیلنج کو قبول کرے اور نہ قیامت تک کوئی قبول کرنے والا پیدا ہوگا۔

اللہ نے اپنی قدرت کاملہ کو بار بار قرآن پاک میں بیان فرمایا ہے، کہیں چیلنج کر کے، کہیں اپنی نعمتوں کو گنا کر، کہیں مثالیں دے کر۔

(٧) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کون نہیں جانتا؟ ان کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا۔ لیکن اپنے ایمان اور یقین میں مزید اضافہ اور پختگی چاہتے تھے، اللہ سے سوال کر دیا اے اللہ تو کیسے مردوں کو زندہ کرے گا ذرا مجھے دکھا دے۔ اللہ نے کہا! ابراہیم کیا تمہیں اس پر ایمان نہیں ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ہاں! ہے ایمان لیکن ایمان میں اضافہ چاہتا ہوں۔ سننے اور دیکھنے میں فرق ہے۔

اللہ نے فرمایا: چار چڑیوں کو پکڑو اور ان کا تکا بوٹی کر ڈالو، پھر ان کے اجزاء کو خلط ملط کر کے مختلف پہاڑوں پر رکھ دو، یہ سب کر لینے کے بعد ان کو بلاؤ پھر دیکھو وہ تمہارے پاس دوڑتی ہوئی آئیں گی۔

ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَى وَلَكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (البقرة:۲۶۰)

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم کو اس پر ایمان نہیں ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: کیوں نہیں؟ (ایمان تو ہے) لیکن (یہ سوال اس لئے ہے کہ) میرے دل کو اور اطمینان ہو جائے۔ اللہ نے فرمایا: چار پرندوں کو پکڑ و پھر ان کے ٹکڑے کر ڈالو، اور ان کا ایک ایک ٹکڑا مختلف پہاڑ پر رکھ دو، پھر انھیں پکارو، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے، اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

یہ اللہ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی ایک مثال ہے اللہ تعالیٰ عرش پر رہ کر آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا خالق، مالک، مدبر اور منتظم ہے، ان میں سے کسی چیز میں ذرہ برابر اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اگر کسی نے کائناتی امور میں کسی پیر، فقیر کے بارے میں کسی طرح کے تصرف کا عقیدہ رکھا تو وہ شرک کا مرتکب ہوگا اور شرک کو اللہ تعالیٰ کبھی نہیں معاف کرے گا۔

ان آیتوں کو سنا کر ہم آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ إن الله على كل شئ قدير۔ جو چاہے سو کرے اس کو کوئی عاجز کرنے والا نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے تو اپنا حکم منوانے پر بھی قادر ہے۔

اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا

میرے بھائیو! عرض ہے کہ جو اللہ اتنی عظیم قدرتوں اور حکمتوں کا مالک ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنے نور کو، اپنے دین کو، قرآن کریم کی تعلیم کو تمام ادیان اور تمام دوسری تعلیمات پر غالب کر دے۔

ارشاد ہے: ﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِؤُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ (۸/۶۱)

یہ ظالم چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا اگر چہ ان کافروں کو برا لگے۔

جس زمانے میں یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں اس زمانے میں بھی اسلام کے نور کو بجھانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا تھا۔ لیکن اللہ کی کائنات میں فیصلہ اللہ کا چلتا ہے کسی اور کا نہیں چلتا۔ آٹھ سال جاتے جاتے اسلام عرب کا غالب دین بن گیا۔ اللہ کا نور بجھایا نہیں جا سکا البتہ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے ذریعہ اپنے نور کو مکمل کر دیا۔

آج بھی پوری دنیا سے اسلام کو مٹانے کی سازشیں اور کوششیں پورے شباب پر ہیں، کہیں حجاب اور نقاب پر پابندی ہے، کہیں داڑھی اور ٹوپی پر پابندی ہے، کہیں قرآن کی بعض سورتوں اور آیتوں کو نصاب سے خارج کرنے کا آرڈر ہے، کہیں دینی اداروں پر شکنجہ کسا جا رہا ہے، کہیں مسجدیں ڈھائی جا رہی ہیں، کہیں اسلام ہی پر پابندی عائد کی جا رہی ہے، کہیں دہشت گردی کا الزام ہے، کہیں مسلم حکومتوں کو لڑایا جا رہا ہے، کہیں ان پر قبضہ کیا جا رہا ہے، غرض اسلام کو بدنام کرنے، مسلمانوں کو کمزور کرنے

اور نور اسلام کو بجھانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے بلکہ اس موضوع پر مسلسل تحقیق ہورہی ہے کہ اسلام کو کیسے مٹایا جائے؟ ٹھیک وہی نقشہ سامنے ہے جو ابتداء اسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش مکہ کا تھا، لیکن اللہ کی حکمت دیکھئے کہ جو اسلام کے دشمن تھے وہی اسلام کے خادم بن گئے اور بغیر کسی جنگ کے مکہ فتح ہوگیا۔ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔ اللہ کہاں سے آتا ہے اسے کوئی نہیں جانتا۔ ایک طرف اسلام کو مٹانے کی کوششیں ہورہی ہیں اور دوسری طرف صحیح اسلام پوری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

آیت کریمہ پر تھوڑی توجہ دیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ نے ''افواہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی نور اسلام کو یہ کفار اپنے اعتراضات، الزامات، تنقیدات، نشریات اور پروپیگنڈوں کے ذریعہ بجھانا چاہیں گے۔ کفار مکہ اسلام کے خلاف لسان سے زیادہ سنان استعمال کرتے تھے آج سنان کی ضرورت ختم ہوتی جارہی ہے عصر حاضر کا سب سے بڑا ہتھیار میڈیا ہے۔ پرنٹ میڈیا ہو یا الکٹرانک میڈیا دونوں آج کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں۔ منٹوں میں پوری دنیا سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ منوا لیا جاتا ہے۔ چیخنے والے چیختے رہیں ان کے پاس میڈیا کا وہ سسٹم ہی نہیں جس سے اپنی بات منوا سکیں۔

لیکن میرے بھائیو! مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے مایوسی کفر ہے، اللہ تعالیٰ ایسی جگہ سے امید پیدا کرتا ہے جہاں امید کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ قرآن پاک کی یہ آیت کریمہ پڑھئے اور دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بات کیسے منواتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ، مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (ق:١٧،١٨)

یاد کرو جب دو لکھنے والے لکھ رہے ہوتے ہیں دائیں اور بائیں بیٹھ کر، انسان کوئی بات نہیں بولتا مگر اس کے پاس نگہبان تیار رہتا ہے۔

اللہ نے ہر انسان کے ساتھ دو پہرے دار لگا دیئے ہیں۔ وہ ہر وقت ہماری نگرانی اور جاسوسی کرتے رہتے ہیں، کوئی لفظ ہماری زبان سے نکلا نہیں کہ فوراً نوٹ ہو گیا۔

قرآن پاک میں جس وقت یہ بات کہی گئی تھی اس وقت اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے صرف ایمان کی قوت تھی۔ خارجی ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے دیکھ کر یا سن کر اس آیت پر ایمان لایا جاتا۔ آج ہمارا ایمان کمزور ہوتا جا رہا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب مہیا فرما دیئے ہیں کہ ہم اس طرح کی آیتوں پر ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں۔

ریکارڈ تیار ہو رہا ہے:

آج دنیا کے حالات ایسے ہوتے جا رہے ہیں کہ کسی کی کوئی بات یا کوئی نقل وحرکت چھپی نہیں رہ سکتی۔ کوئی ٹھیلہ کھینچنے والا، جھاڑو لگانے والا تو جاسوسی نظام سے بچ سکتا ہے لیکن کوئی ذمہ دار، آفیسر، حاکم اور وزیر مخابرے سے محفوظ نہیں رہ سکتا، وہ کسی سے کیا کہہ رہا ہے اس کی ہر بات، فون اور موبائیل سے ٹیپ ہو رہی ہے۔ کہاں جا رہا ہے، کس سے مل رہا ہے سب کی فلم تیار ہو رہی ہے، اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ کوئی دیکھنے والا، سننے والا نہیں ہے تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے، آپ کسی سے بات کر رہے ہیں آپ کو کیا پتہ اس کے جیب میں ٹیپ مشین یا موبائل ہو اور آپ کی بات ٹیپ ہو رہی ہو۔ اس طرح کی خبروں اور انکشافات سے اخبار کے صفحات بھرے رہتے ہیں۔ اس لئے ایک مرتبہ پھنسنے کے بعد یا دوسروں کا کیس سننے کے بعد آدمی محتاط اور چوکنا ہو جاتا

ہے، کسی سے بات کرتا ہے تو سوچ سمجھ کر بولتا ہے، زبان سنبھال کر استعمال کرتا ہے۔ کہیں جانا ہو، کسی سے ملنا ہو تو بار بار سوچے گا کہ اس کے مفید یا مضر اثرات کیا پڑ سکتے ہیں؟ جتنے غلط کام ہیں چاہے گھٹالے کا ہو یا ناجائز تعلقات کا ہو، ظلم وناانصافی کا ہو یا قتل اور دہشت گردی کا، سب چھپ کر اور خفیہ طریقے سے ہی انجام دیئے جاتے ہیں، لیکن کوئی چھپا نہیں رہتا، سب کا راز کھل جاتا ہے۔ اس لئے آدمی مجبور ہے کہ ذمہ داری کا ثبوت دے، صحیح کام کرے اور سچ بولے، زبان سنبھال کر استعمال کرے۔ نبیوں کے سردار ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ نے ہم کو یہی ادب سکھایا ہے، ارشاد گرامی ہے:

"مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيراً أَوْ لِيَصمُتْ۔
(صحیح بخاری رکتاب الادب)

جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اچھی بات بولے ورنہ چپ رہے۔

میرے بھائیو! قرآن کریم نے بھی تو یہی کہا ہے کہ تمہارے ساتھ ریکارڈنگ اور ٹیپنگ کا نظام لگا ہوا ہے، اس لئے سچ بولو جھوٹ نہ بولو، صحیح کام کرو غلط نہ کرو، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کے راستے میں استعمال کرو بے حیائی اور فحاشی میں نہ استعمال کرو، اپنے اختیارات کو جائز جگہوں میں استعمال کرو، غلط جگہوں میں نہ استعمال کرو، اللہ کے بندوں پر رحم کرو، ظلم وزیادتی سے باز رہو، کوئی دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو تمہارا کوئی قول وفعل اور کوئی نقل وحرکت اللہ سے مخفی نہیں ہے۔ اللہ نے تمہارا ریکارڈ تیار کرنے کا انتظام فرما دیا ہے۔

دنیا کے جاسوسی نظام کا ہم انکار نہیں کر سکتے تو اللہ کے اس نظام کا ہم کیسے انکار

کر سکتے ہیں؟

میرے بھائیو! اللہ نے انسانوں کو اس خفیہ نظام کی صلاحیت دے کر اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اللہ کے بنائے ہوئے خفیہ نظام کو تسلیم کرے اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر سچائی کے ساتھ چلے، من مانی اور نفس پرستی نہ کرے ورنہ اللہ کا خفیہ نظام اس کے ساتھ لگا ہوا ہے، قیامت کے دن اللہ کے حضور زندگی کی پوری فلم دہرا دی جائے گی اور اس دن نہ انکار کی گنجائش ہوگی اور نہ بھاگنے کی کوئی جگہ۔

وہ سن رہا ہے:

اللہ عزوجل کی صفات علیا میں دو صفتیں ''سمیع'' اور ''بصیر'' بھی ہیں۔ ان دونوں صفتوں کا بار بار قرآن پاک میں اعادہ کیا گیا ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾(۱۱/۴۲)

اللہ کے مثل کوئی چیز نہیں ہے وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

﴿وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ﴾(۱/۵۸)

اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے، بیشک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ عرش پر ہے، عرش ہماری زمین سے کتنے فاصلے پر ہے اگر ہم سمجھانا چاہیں تو نہیں سمجھا سکتے ہمارے بس سے باہر ہے، ہم صرف کائنات کے اس حصے پر نظر کریں جو ہمارے سامنے ہے، مثلاً سورج جسے ہم روز دیکھتے ہیں وہ سائنسی تحقیق کی روشنی میں ہماری زمین سے ساڑھے نو کروڑ میل دور اور ہماری زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ اگر ہماری یہ زمین امریکہ، برطانیہ، ہندوستان اور چین سمیت پوری دنیا

سورج میں ڈال دی جائے تو سورج کے حجم کے تناسب سے زمین کی حیثیت ایک فٹبال سے زیادہ نہیں ہوگی، اور خود سورج آسمانی کائنات میں ایک فٹبال کی طرح نظر آتا ہے۔ صرف ایک لائن جس پر سورج چل رہا ہے اگر کروڑوں سورج رکھ دیئے جائیں تو سب سما جائیں گے اور دائیں بائیں پوری کائنات خالی رہے گی اب آپ صرف اس آسمانی کائنات کا اندازہ کریں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، دماغ پھٹ جائیگا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد سات آسمان، اس کے اوپر ایک سمندر اور سب کا فاصلہ ایک جیسا۔ ان سب کے اوپر اللہ عزوجل کا عرش وہاں سے اس زمین پر ہونے والی ہر نقل وحرکت کو بلاواسطہ وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔

آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے سمجھنا اور ماننا اتنا آسان نہیں تھا جتنا آج ہے۔ آج ہمارا ملک ہندوستان بھی مریخ پر قدم رکھ چکا ہے اور اس پورے سفر میں مواصلات کا تسلسل ٹوٹتا نہیں ہے۔ یہ وسائل مہیا کر کے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے کہ اگر انسان مریخ پر جا سکتا ہے وہاں سے باتیں کر سکتا ہے سن سکتا ہے اور دیکھ سکتا ہے تو عرش سے اللہ کا سننا اور دیکھنا کیوں ناممکن ہے، وحی کا آنا اور فرشتوں کا اترنا اور چڑھنا کیوں ناممکن ہے، نبی ﷺ کی معراج جسمانی کیوں ناممکن ہے؟ اگر مریخ کا سفر ممکن ہے تو بلاشبہ اللہ کا عرش پر ہونا، اس کا سننا اور دیکھنا، وحی کا اور فرشتوں کا نزول نبی ﷺ کی معراج ساری باتیں حق ہیں۔ دیکھا آپ نے انسان جس بات کو نہیں مانتا تھا اللہ نے اسے اپنی حکمت سے منوالیا۔

سنبھل کر قدم رکھیے:

اسلام ہمیں عاجزی، انکساری، وقار اور سنجیدگی کی تعلیم دیتا ہے، یہاں تک کہ

جماعت میں ملنا ہے، رکعت چھوٹ رہی ہے تب بھی دوڑنے سے منع کیا گیا ہے اور وقار اور سکینت کا حکم دیا گیا ہے، جب نماز کے لئے دوڑنا منع ہے تو عجب اور کبر کے طور پر چلنا اور فخر وغرور کا اظہار کرنا، اللہ کی زمین پر دھمکنا اور سینہ تان کر اکڑنا بہرحال حرام اور ناجائز ہے۔ سنئے قرآن کریم کی تعلیم ہے، حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کررہے ہیں۔

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ، وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾ (۳۱/۱۸، ۱۹)

لوگوں سے اپنا منہ مت پھیر اور زمین پر اترا کر مت چل، بیشک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا، اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو پست رکھو، بیشک سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کی معتدل تعلیم، رفتار اور گفتار سے ہماری نقل وحرکت سے کسی قسم کی بڑائی اور فخر وغرور کا اظہار نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ بڑائی صرف اللہ کے لئے زیبا ہے۔

سورہ فرقان کے اندر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے اوصاف میں سب سے پہلا وصف رفتار میں فروتنی اور خاکساری کو بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْناً وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَاماً﴾ (۲۵/۶۳)

رحمان کے (سچے) بندے وہ ہیں جو زمین پر چلتے وقت فروتنی اختیار کرتے ہیں، اور جب جاہل لوگ ان سے (جہالت کی) باتیں کرتے ہیں تو کہتے ہیں سلام

(اور گزر جاتے ہیں)

اللہ کے نیک اور سچے بندوں کی یہ پہچان ہے کہ راہ چلتے فخر وغرور کا اظہار نہیں کرتے اور اگر کوئی نادانی اور جہالت کی بات کرتا ہے تو وہ ان سے الجھتے نہیں، سلامتی کی بات کرتے ہیں اور شرافت سے گزر جاتے ہیں۔ رفتار اور گفتار میں وقار اور سنجیدگی اختیار کرنے کا اسلام نے حکم دیا ہے لیکن جب انسان دولت اور حکومت پا جاتا ہے تو اس کے اندر غرور اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے، زمین پر اکڑنا، سخت کلامی کرنا وہ اپنی شان سمجھتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ میں بھی کسی کا محکوم ہوں اور میرا بھی کوئی محاسب ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے غافل نہیں رہتا وہ ایسے طریقے سے گھیرتا ہے کہ انھیں احساس نہیں ہوتا اور فروتنی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سنئے کیسے؟

اللہ تعالیٰ جب دولت دے دیتا ہے تو آدمی اپنی حیثیت کے مطابق بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اپنا شاندار مکان اور محل بنواتا ہے۔ عمدہ قسم کے پتھر اور ٹائلس سے دیواروں کو، فرش اور زینوں کو مزین کرتا ہے، خود بھی خوش ہوتا ہے اور دوسرے بھی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں۔

لیکن میرے بھائیو! اس میں ایک عبرت کا سامان اور درس بھی ہے، وہ پاؤں جو مکان سے باہر اب تک دھمک رہا تھا اور اکڑ رہا تھا اب مکان کے اندر وہی پاؤں سنبھل سنبھل کر سنجیدگی سے رکھا جائے گا۔ کہیں پاؤں پھسل نہ جائے، اٹھا پٹخ اور دھما چوکڑی نہیں کی جائے گی کہیں فرش ٹوٹ نہ جائے۔ اونچی آواز سے بات نہیں کی جائے گی آواز بازگشت ہوگی چھوٹوں اور بچوں پر نگاہ رکھی جائے گی گندگی نہ پھیلائیں ورنہ صاف ستھرا مکان گندہ ہوگا۔ دیکھئے کتنی حکمت سے اللہ نے اپنا حکم منوالیا۔ سنجیدگی نہ اختیار کرنے والا سنجیدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا۔ جس کے پاس بصیرت اور

بصارت ہو، گرویدگی اور انابت ہو وہ ہر جگہ عبرت کا سامان پالیتا ہے۔ فللّٰہ الحمد

اللہ تعالیٰ اپنے احکامات، دلائل، براہین اور شواہد کی روشنی میں نافذ کرتا ہے تاکہ ایمان لانے والے ایمان لائیں، رجوع کرنے والے رجوع کریں اور عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کریں۔ اگر عبرت کا سامان پاکر عبرت نہ حاصل کی جائے تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو مٹا کر دوسری قوم لائے گا جو اللہ کی اطاعت گزار اور فرمانبردار ہوگی۔ یہ اللہ کا نظام اور قانون ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

﴿وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ﴾ (۳۸/۴۷)

اور اگر تم منہ پھیر لو تو وہ تمہارے بدلے تمہارے علاوہ ایسے لوگوں کو لائے گا جو پھر تم جیسے نہیں ہوں گے۔

میرے بھائیو! آپ کو یہ سمجھایا جارہا ہے کہ رجوع الی اللہ کا سامان ہر جگہ اللہ نے رکھا ہے۔ اپنی آنکھیں کھولئے۔ پوری دنیا میں مسلمان خس وخاشاک کی طرح بہہ رہے ہیں جہاں مسلمان محکوم ہیں وہاں تو ان پر ظلم ہو ہی رہا ہے لیکن جہاں مسلم حکومتیں ہیں، مسلم حکمراں ہیں وہاں بھی اسلام اجنبی ہوتا جارہا ہے، ملک اپنا، عوام اپنے لیکن حکم کسی اور کا۔ اللہ اپنے دین کو نہیں مٹائے گا وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا۔ اگر ہم اس کے اہل نہیں ثابت ہوئے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو لائے گا جو اس کے اہل ہوں گے اور ہم جیسوں کو مٹا دے گا۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اور سارے مسلمانوں کو کسی برے وقت سے بچائے اور کتاب وسنت پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ بدعقیدگی اور شرک وبدعات سے محفوظ رکھے۔

☆☆☆

رسالت اور بشریت

نکات!

(۱) غلو سے بچیے۔

(۲) بشریت سے انکار۔

(۳) نکتۂ اتحاد۔

(۴) دلائل بشریتِ رسالت۔

(۵) اللہ پر تعمیہ کا الزام۔

(۶) مقام الوھیت اور مقام رسالت۔

(۷) انبیاء کی تنبیہ۔

(۸) انبیاء انسانی اوصاف سے متصف ہوتے تھے۔

(۹) دعاء اور استغفار تھے۔

(۱۰) ایک سوال۔

غلو سے بچیے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا۟ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً إِنْ أَرَادَ أَن يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا﴾

(المائدۃ:۱۷)

ترجمہ: یقیناً وہ لوگ کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے، آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم، ان کی والدہ اور روئے زمین کے سب

لوگوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر کچھ اختیار رکھتا ہو، آسمان وزمین اور دونوں کے درمیان ساری چیزوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور ملکیت تامہ بیان کر کے نصاریٰ کے عقیدۂ الوہیت کا رد کر رہا ہے، نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں اور ان کی ماں کو بھی خدا کا درجہ دیتے ہیں اور اللہ تو اللہ ہے ہی۔ اب یہ تین اصلیں ہوئیں پھر تینوں مل کر ایک ہو گئے۔ تین کیسے ایک ہو گئے؟ اسے آج تک نصاریٰ بھی نہیں سمجھا سکے۔ بہر حال آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کو بیان فرمایا کہ آسمان وزمین اور ان دونوں کی بیچ کی ساری چیزیں میری ملک اور میری مخلوق ہیں جن میں مسیح ابن مریم اور ان کی ماں مریم بھی ہیں اگر میں انہیں اور زمین کی ساری چیزوں کو ہلاک کرنا چاہوں تو کون ہے جو مجھے روکے؟ جب وہ میری مملوک اور مخلوق ہیں تو میں ان کو ہلاک کر سکتا ہوں اور ان کو ہلاک کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا تو پھر الوھیت کے مقام پر تنہا میں ہوا۔ مسیح ابن مریم ''اللہ'' کیسے ہو گئے؟ اگر کسی نے ایسا عقیدہ رکھا تو وہ کافر ہے اور اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔

گویا آیت میں یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ جو جس مقام پر ہے اس کو اسی مقام پر رکھو عقیدہ میں اس کو اس کے مقام سے اوپر نہ لے جاؤ۔ حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اگر ان کو مخلوق کے مقام سے اٹھا کر خالق اور اللہ کے مقام پر لے جاؤ گے تو یہ کھلا ہوا شرک اور کفر ہوگا۔

اس تشریح کی روشنی میں ہمیں بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ''محمد ﷺ'' اللہ کے رسول اور اس کے بندے ہیں اب اگر کوئی آپ کو عبدیت اور بشریت کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کے مقام پر فائز کرے گا تو وہ بھی اسی کفر کا مرتکب ہوگا جس کا ذکر آیت کریمہ میں ہوا۔

انبیاء یا اولیاء کے بارے میں جب اس طرح غلو کا عقیدہ پایا جائے جو عبدیت سے اٹھا کر الٰہی صفات میں شریک کردے تو اسکی اصلاح ضروری ہے۔ غیب کا علم صرف اللہ کو حاصل ہے اگر اللہ کی اس صفت عالیہ میں اللہ کی کسی مخلوق کو شامل کیا جائیگا تو یہ اللہ کی صفت خاص میں شرک ہوگا، صحیح بخاری کی روایت ہے ایک مرتبہ کچھ بچیاں اپنے آباء واجداد کا مرثیہ کہہ رہی تھیں، نبی ﷺ وہاں تشریف فرما تھے کسی بچی نے فرط عقیدت میں آپ کی شان میں یہ مصرع کہہ دیا۔ ''وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِي غَدٍ'' ہم میں ایک ایسے نبی ہیں جو آئندہ کی بات جانتے ہیں۔ یہ کہنا ایک طرح سے آپ کے بارے میں ''علم غیب'' کا دعویٰ ہے فوراً نبی کریم ﷺ نے بچی کو روک دیا اور فرمایا!''دَعِيْ هٰذا وَقُولِي مَا كُنتِ تَقُولِيْن '' یہ چھوڑ کر پہلے جو کہہ رہی تھی وہی کہو۔ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ ایسی کوئی بات پسند نہیں فرماتے تھے جس میں آپ کی شان میں افراط اور غلو سے کام لیا گیا ہو۔

بشریت سے انکار:

لیکن امت کا حال دیکھئے کہ آپ ہی کے امتی فرط عقیدت اور جوش محبت میں آپ کو ان صفات کے ساتھ متصف مانتے ہیں جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں آپ کو عالم الغیب کہا جاتا ہے، آپ کو ہر جگہ حاضر و ناظر مانا جاتا ہے حالانکہ یہ عقیدہ اللہ کے بارے میں بھی جائز نہیں ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے ہر جگہ نہیں ہے ہاں اللہ کا علم ہر جگہ ہے۔ نبی کریم ﷺ اور تمام انبیاء ورسل کی بشریت سے انکار کیا جاتا ہے حالانکہ قرآن پاک میں انبیاء کرام اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کے بارے میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ آپ اپنی قوم کے ایک فرد تھے، آپ بشر اور انسان تھے مگر ان ساری وضاحتوں اور صراحتوں کے باوجود آپ ہی کی امت کا ایک طبقہ آپ

کو بشر نہیں مانتا۔

نکتۂ اتحاد

گذشتہ قوموں نے انبیاء کی کیوں تکذیب کی؟ اس کی متعدد وجوہات بیان کی گئی ہیں انہیں میں ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ یہ مکذبین اپنی قوم کے رؤساء اور امراء ہوا کرتے تھے اور بزعم خود اپنے کو ہر خیر کا ٹھیکیدار سمجھتے تھے، اس لئے انبیاء پر ایمان لانے میں قوم کا کمزور، مزدور اور نچلا طبقہ سبقت کرتا تھا اور امراء اپنی رعونت اور کبر میں پڑے رہتے اور اپنے انکار کا جواب یہ دیتے کہ نبی کی نبوت اگر حق اور خیر ہوتی تو وہ پہلے ہمارے پاس آتی اس کو اختیار اور قبول کرنے میں ہم سبقت کرتے نہ کہ محکوم اور مزدور طبقہ۔ اس لئے کہ ہر خیر کی طرف سبقت کرنے والے ہم ہیں اس کے ٹھیکیدار ہم ہیں ہمارا سبقت نہ کرنا اس کے خیر نہ ہونے کی دلیل ہے۔

"لَوْ كَانَ خَيْراً مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ" اگر وہ دین بہتر ہوتا تو یہ (نچلے) لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہیں کرتے (احقاف/۱۱)

اور تکذیب کی دوسری وجہ یہ بیان کرتے کہ یہ مدعی نبوت انسان ہے، ہماری ہی قوم کا ایک انسان نبی کیسے ہو جائیگا؟

(۱) "أَبَشَرٌ يَّهْدُونَنَا" (تغابن/۶) کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے۔

(۲) "أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَراً رَّسُولاً" (بنی اسرائیل/۹۴) کیا اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔

آپ یہاں غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مکذبینِ رسالت اور مبتدعین دونوں رسالت کے مسئلہ میں ایک خاص نکتے پر متحد ہیں یعنی بشریت اور رسالت کا عدم اجتماع۔ مکذبین کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ بشریت اور رسالت دونوں جمع نہیں ہو سکتی

اور مبتدعین کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ مکذبینِ رسالت نے رسول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کا خاندان، قبیلہ، اس کا بچپنا اور جوانی، کھانا اور پینا، چلنا اور پھرنا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سارے عوارض جو کسی انسان کے اندر پائے جاسکتے ہیں اور ان کی وجہ سے اس کو انسان کہا جا سکتا ہے وہ سب رسول کے اندر بھی پائے جا رہے ہیں اس لئے وہ بشریت کا انکار نہیں کر سکتے تھے لیکن بشریت اور رسالت کا اجتماع ان کے نزدیک بھی ناممکن تھا اس لئے بشریت کا اقرار کیا اور رسالت کا انکار کر دیا۔ مسلمان مبتدعین نے چونکہ رسول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں ہے اسلئے ان لوگوں نے رسالت کا اقرار کیا اور بشریت کا انکار کر دیا۔ لیکن دونوں اس نکتے پر متحد ہیں کہ رسالت اور بشریت جمع نہیں ہو سکتی، ایک نے انسان ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے بشریت کا انکار نہیں کر سکے رسالت کا انکار کر دیا اور دوسرے نے ان کا انسان ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں ہے اس لئے بشریت کا انکار کر دیا اور رسالت کا اقرار کر لیا۔

یہ نکتہ اتحاد کیسے ہو گیا؟ اس پر بھی قرآن پاک نے تبصرہ کیا ہے۔ آیت پڑھیے۔

﴿كَذٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ، أَتَوَاصَوْا بِهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ﴾ (الذاریات:۵۲،۵۳)

ترجمہ! اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گذر چکے ہیں ان کے پاس جو بھی رسول آیا انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادوگر ہے یا دیوانہ ہے، کیا یہ اس بات کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے رہے ہیں (نہیں) بلکہ یہ سب کے سب سرکش ہیں۔

گزشتہ قوموں نے اپنے انبیاء کو جادوگر اور پاگل کہا ان کی تکذیب کی اور بعد میں آنے والی قوموں نے بھی اپنے انبیاء سے وہی برتاؤ اور وہی سلوک کیا جو گزشتہ

قوموں نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا تھا ایسا لگتا ہے پہلے والے بعد والوں کو وصیت کرتے رہے ہیں حالانکہ یہ ممکن نہیں اس لئے کہ ان قوموں کے درمیان سیکڑوں برس کا فاصلہ ہے وصیت کیسے کریں گے؟

البتہ سرکشی اور طغیان دونوں کا خمیر ہے سب اپنے اپنے وقت کی سرکش قومیں ہیں اس لئے ہر ایک کا مزاج، ان کی فکر اور سوچ ایک جیسی ہے، ان کے اخلاق و عادات ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لئے جو پہلوں نے کہا وہی پچھلوں نے بھی کہا۔ ہمارے زمانے کے مسلمان مبتدعین بھی ان قوموں سے یک گونہ فکری مشابہت رکھتے ہیں وہ اس طرح کہ ان قوموں کے نزدیک بھی بشریت اور رسالت کا اجتماع ناممکن تھا اور ان کے نزدیک بھی بشریت اور رسالت کا اجتماع ناممکن ہے۔

دلائل بشریت رسالت:

حقیقت یہ ہے کہ رسالت اور بشریت کے اجتماع میں کوئی تنافی اور کوئی استحالہ نہیں بلکہ عقل اور نقل دونوں کا تقاضہ ہے کہ نبی اور رسول انسان ہی ہو اور اسی قوم کا ایک فرد ہو جس قوم کی ہدایت کے لئے اسے بھیجا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ جسے بار نبوت عطا فرماتا ہے وہ اپنی قوم کا سب سے افضل سب سے بہتر اور سب سے قابل اعتماد انسان ہوتا ہے، ہر نبی کو چالیس سال کے بعد نبوت سے سرفراز کیا جاتا ہے، اس سے قبل کی پوری زندگی یعنی بچپنا اور جوانی قوم کے بیچ گذری ہوتی ہے، قوم اس کی رفتار گفتار سے واقف ہوتی ہے، اس کے اخلاق و کردار کا علم رکھتی ہے، اس کی زبان اور انداز گفتگو کو پہچانتی ہے، اس لئے اپنی قوم کی اصلاح اور ہدایت کیلئے جتنا موثر کردار وہ ادا کرسکتا ہے کوئی اجنبی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے اپنی کتاب عزیز میں پوری وضاحت سے اس کو بیان کردیا ہے۔ ارشاد ہے۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾

(سورہ ابراہیم:۴)

اور ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا ہے تا کہ ان کے سامنے وضاحت سے بیان کرے۔

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (سورہ جمعہ/۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے امیوں (عربوں) میں انہیں میں کا ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھکر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

نبی اللہ کا پیغام قوم کو پہنچاتا ہے، قوم میں عام اور خاص، عالم اور جاہل ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں ہدایت کا پیغام کسی مخصوص طبقے کے لئے نہیں ہوتا سب کے لئے ہوتا ہے اسلئے پیغام رسانی کا انداز عام فہم، واضح اور صاف ہونا چاہئے اور خود ان کی اپنی زبان اور لب ولہجہ میں ہونا چاہئے تا کہ ہر شخص سمجھ سکے، اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ عربی سمجھنے والی قوم کے پاس اگر انگلش بولنے والا بھیج دیا جائے یا انسانوں کی ہدایت کے لئے کسی غیر انسان کو نبی بنا دیا جائے تو ہدایت کا مقصد کبھی حاصل ہوسکتا ہے۔نہیں اور ہرگز نہیں۔

تعجب ہے کہ اتنی موٹی بات کچھ لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتی اور وہ اس بات پر مصر ہیں کہ انبیاء ورسل انسان نہیں ہوتے اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے اس سے تجاوز کر کے وہ یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ انبیاء ورسل کو انسان کہنے والے کافر ومنافق ہیں۔نعوذ باللہ من ذالک .ایک عبارت ملاحظہ فرمائیں!

''زمانۂ ماضی کے کفار ومشرکین کے نقش قدم پر چل کر اور ان کے طرز عمل کو

مشعل راہ بنا کر دور حاضر کے منافقین بھی انبیاء کرام اور خصوصاً سید الانبیاء والمرسلین ﷺ کو اپنے جیسا بشر کہہ کر عوام المسلمین کے دلوں سے آپ کی عظمت و محبت کم کرنے کی سازش کو ایک جماعتی حیثیت سے رائج کرتے ہیں اور علی الاعلان کرتے ہیں۔ کیوں کہ اپنے اس فاسد اعتقاد کو زیور طباعت سے آراستہ کر کے شائع کرتے ہیں ماضی کے کفار اور دور حاضر کے منافقین کا نبی کو بشر کہنے کا انداز یکساں ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ ماضی کے کفار اپنا یہ فاسد نظریہ خفیہ طور پر پھیلاتے تھے لیکن دور حاضر کے منافقین زمانۂ ماضی کے کفار و مشرکین سے دو نہیں بلکہ چار قدم آگے ہیں۔ کیونکہ جو بات علی الاعلان کہتے ہوئے ماضی کے کفار و مشرکین جھجھکتے تھے اور چھپ چھپ کر خفیہ طور پر جو بات کہتے تھے وہی بات دور حاضر کے منافقین علانیہ طور پر کہہ کر اپنی بیباکی، بے حیائی، بے شرمی، شقاوت قلبی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

(کتاب! خیر بشر کی نوری بشریت ص ۴۳-۴۴)

یہ ایک فتویٰ آپ نے سن لیا کہ انبیاء و رسل کو ''بشر'' کہنے والا مشرک، کافر اور منافق ہے۔ اب آپ قرآن پاک کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک دو نہیں تیس سے اوپر آیتوں میں آپ ﷺ کو اور دیگر انبیاء کو ''بشر'' کہا گیا ہے کسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود کہا ہے، کسی آیت میں اللہ نے اپنے نبی کو ''بشر'' کہنے کا حکم دیا ہے، کسی آیت میں خود نبی نے اپنے ''بشر'' ہونے کا اعتراف کیا ہے اور کسی آیت میں قوم کے افراد نے ''بشر'' کہکر اپنے نبی کی تکذیب کی ہے۔ ظاہر ہے جن کا یہ عقیدہ ہو کہ نبی بشر نہیں ہو سکتا اس کے لئے دو میں سے ایک راستہ ہے، اگر اپنے آنکھوں سے بشر ہونا دیکھ رہا ہے تو وہ بشریت کا انکار نہیں کر سکتا، رسالت کا انکار کرے گا، کفار و مشرکین نے یہی کیا۔ اور جو ''بشر'' ہونا نہیں دیکھ رہا ہے وہ اگر رسالت کو تسلیم کرتا ہے تو ''بشریت'' کا انکار کرے گا اور یہی کام مبتدعین نے کیا ہے۔ اب جو صریح آیتیں انبیاء و رسل کی

بشریت پر دلالت کر رہی ہیں ان کی وہ بے جا تاویل کرے گا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ معنوی تحریف کرے گا۔ ہم ان کی تاویلات فاسدہ سے بحث کرنا فالتو سمجھتے ہیں، البتہ یہاں ایک اصولی بات کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔ وہ یہ کہ

اللہ کی ذات اقدس پر تعمیہ کا الزام:

قرآن پاک خالص عربی کتاب ہے اور اس کا انداز بیان نہایت واضح اور کھلا ہوا ہے، قرآن پاک میں ان دونوں باتوں کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے، اس لئے قرآن پاک کے اندر جو لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے اس کا معنی عربی لغت اور عربی اصول کی روشنی میں سمجھا جائے گا، اگر کہیں وضعِ اوّلی اور حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی مراد لیا جائے گا تو سیاق وسباق سے اس کا قرینہ ہونا لازم ہے۔ اگر قرینہ اجازت دیتا ہے تو لفظ کا حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی یا کنائی معنی مراد لیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔ اب اگر کوئی حقیقی معنی مراد نہ لے کر مجازی اور کنائی معنی مراد لیتا ہے اور قرینہ اس کی اجازت نہیں دیتا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص اللہ پر تعمیہ کا الزام دے رہا ہے، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو قرآن پاک کو ''کتاب مبین'' کہے اور پھر ''بشر'' کا ایسا معنی مراد لے جو واضح نہیں بلکہ مخفی ہے اور اس مخفی معنی کو مراد لینے کے لئے وہاں کوئی قرینہ بھی نہیں ہے تو گویا ایسا کر کے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اندھیرے میں رکھنا چاہتا ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ کون سا حسن ظن ہوگا؟ اسے اہل تاویل جانیں۔

انبیاء کرام بشر نہیں ہوتے یہ ثابت کرنے کے لئے ایک صاحب نے بڑی محنت کی ہے لیکن آیت کریمہ ''إِنْ نَحنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكم'' ''هَلْ كُنتُ إلا بَشَراً رَسولاً'' اور ''قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُم'' جیسی آیتوں پر آ کر گاڑی پھنستی ہے تو فرماتے ہیں

''ان سرکشوں نے انبیاء کرام سے یہ کہا تھا کہ تم ہماری طرح بشر ہو۔ انبیاء کرام نے ان کو ان کی عقل کی بساط کے مطابق جواب فرمایا کہ اے لوگو! تم ہم کو اپنے جیسا بشر کہتے ہو تو ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ہاں ہاں!''ان نحن الا بشر مثلکم'' ہم ہیں تو تمہاری طرح انسان لیکن......(خیر بشر کی نوری بشریت ص ۷۰)

میرے بھائی یہ اللہ کا کلام ہے، ہمارا اور آپ کا کلام نہیں ہے کہ جیسے چاہیں کھینچ تان کریں، اگر انبیاء کرام ہماری طرح انسان نہیں تھے تو اللہ تعالی کو یہی کہنا چاہئے تھا۔''اے نبی کہہ دو میں تمہاری طرح انسان نہیں ہوں،، لیکن ایسا نہ کہنے سے آپ کو جو پہلوانی کرنی پڑی وہ الگ، اس سے بڑی خرابی جو لازم آئی وہ یہ کہ اللہ تعالی نے کہا کچھ اور مراد لیا کچھ اور۔ کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے انبیاء اور بندوں کو دھوکہ دیتا ہے؟ العیاذ باللہ۔

میرے بھائیو! اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء کرام انسان ہوا کرتے تھے اور خود ہمارے نبی اکرم ﷺ بھی انسان تھے، اس بیان سے قرآن پاک بھرا ہوا ہے اور متعدد حدیثوں میں خود نبی کریم ﷺ نے اپنے انسان ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ ہم اپنے انسانی معاشرے پر معمولی سا غور کر لیں تو یہ عُقدہ حل ہو جائیگا۔ ہم ہزاروں انسانوں کے بیچ رہتے ہیں لیکن ہر انسان اپنے تشخص، علم، فہم، عقل اور دماغ کے اعتبار سے ممتاز اور جدا ہے۔ ایک کو دوسرے پر فوقیت اور فضیلت حاصل ہے لیکن انسانیت میں سب برابر ہیں۔ انبیاء کرام پر اللہ کا فضل خاص ہوتا ہے ان کے پاس فرشتے آتے ہیں وہ اللہ کے مقرب بندے ہوتے ہیں اس لئے وہ انسان ہوتے ہوئے بھی اپنے علم، فضل، عقل، فہم اور قربت الٰہی کے اعتبار سے عام انسانوں سے جدا ہوتے ہیں۔ جب عقل وفہم اور علم وفضل میں ایک انسان دوسرے انسان جیسا نہیں ہو سکتا تو انبیاء کرام ان صفات میں عام انسانوں جیسے کیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن انسانیت میں

برابر ہیں۔

اب آیئے کچھ ایسی باتیں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جن سے آپ فیصلہ کر سکیں گے کہ انبیاء کرام کا مقام اور ہے اور اللہ کا مقام کچھ اور ہے۔ انبیاء کرام اللہ کی مخلوق، مامور اور بندے ہیں انھیں مقام الوہیت پر نہیں بٹھایا جا سکتا۔

مقام الوہیت اور مقام رسالت:

لوگ نبی ﷺ کے بارے میں مختار کل اور متصرف فی الامور ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس عقیدے کی بناء پر نبی کریم ﷺ کو حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں۔ چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں غور سے سنیں اور اندازہ کریں کہ اللہ کی جناب میں محمد ﷺ کا مقام کیا ہے؟ اللہ کتنا قادر مطلق ہے اور نبی اس کے سامنے کتنا عاجز ہے؟ کفار مکہ کہا کرتے تھے کہ محمد ﷺ جو کلام پیش کر رہے ہیں وہ اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ وہ خود گھڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا! (فرض کرو) اگر محمد ﷺ گھڑ کر کوئی کلام میری طرف منسوب کرتے تو میں انہیں دائیں ہاتھ سے پکڑتا اور ان کی شہ رگ کاٹ دیتا اور کوئی مجھے اس کام سے روکنے والا نہیں ہوتا۔ ارشاد ہے

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ، لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ، ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ، فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ﴾ (۶۹:۴۴تا۴۷)

ترجمہ: اگر یہ (محمد) ہم پر کوئی بات گھڑ کر پیش کریں گے، تو ہم ان کو دائیں ہاتھ سے پکڑیں گے، پھر ان کی شہ رگ کاٹ دیں گے اور تم میں سے کوئی ہم کو اس کام سے روکنے والا نہیں ہوگا۔

سنا آپ نے کتنے بلیغ اور زوردار انداز میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کا

اظہار فرمایا ہے۔فرمایا: محمد ﷺ بھی اگر ایسی غلطی کریں گے تو انہیں بھی ہم معاف نہیں کریں گے اور جب سزا دیں گے تو تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ہم کو اس کام سے روک سکے۔اب آپ اندازہ کریں اللہ کی قدرت کا اور اسکے سامنے آپ ﷺ کے عجز کا۔

اللہ تعالی انبیاء کرام کی عصمت کے بیان میں ارشاد فرمار ہا ہے کہ یہ کفار چاہتے ہیں کہ آپ کوئی بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیں تو یہ لوگ آپ کو اپنا دوست بنالیں گے۔لیکن اللہ کی طرف سے آپ کو عصمت حاصل رہی اور آپ ان کی طرف کسی طرح نہیں جھکے۔اگر کفار کے کہنے پر جھک گئے ہوتے تو اللہ کی جانب سے آپ کو کیا سزا ہوتی اسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے۔

﴿إِذاً لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لاَ تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيراً﴾ (الاسراء:۷۵)

ترجمہ: اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو بہت ممکن تھا کہ آپ ان کی طرف کسی قدر مائل ہو جاتے، اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو ہم آپ کو دوہرا عذاب دیتے دنیا کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی پھر آپ ہمارے خلاف کوئی مددگار نہیں پاتے۔

نبی کریم ﷺ سید الانبیاء والمرسلین ہیں یہ جتنی بڑی نعمت اور جتنا بڑا اعزاز ہے اسی تناسب سے آپ کی ذمہ داریاں بھی ہیں، ان ذمہ داریوں میں کسی قسم کی کوتاہی آپ سے ممکن نہیں اس لئے کہ آپ کو اللہ کی جانب سے عصمت کا مقام ہے لیکن اگر بالفرض کسی کوتاہی کا صدور ہو جائے تو مرتبے کے تناسب سے آپ کے لئے تنبیہات بھی ہیں جن کا ذکر آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔اللہ کی تنبیہ سے اللہ کے مقام اور رسول کے مقام کا فرق پہچانا جاسکتا ہے ایک کا مقام خالق اور معبود کا ہے اور دوسرے کا مقام مخلوق اور عابد کا ہے۔

اللہ کی تنبیہ انبیاء کرام کو

دنیا میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بادشاہوں کے کچھ معتمد اور مشیر خاص ہوتے ہیں جو بادشاہ کے قریبی ہوتے ہیں لیکن ہر حال میں بادشاہ بادشاہ ہے اور وزیر وزیر ہے، وزیر بادشاہ نہیں ہوسکتا حالانکہ دونوں انسان ہیں۔ یہ دنیا کے بادشاہ کا حال ہے، اب آپ اندازہ کریں کہ اللہ جو سلطان حقیقی اور مالک حقیقی ہے اس کے اور اس کے بندے کے درمیان کتنا فرق ہوگا؟ اس فرق لا متناہی کی بناء پر آقا اپنے غلام اور اپنے بندے کو جس طرح چاہے سزا دے اور جن لفظوں میں چاہے تنبیہ کرے، قرآن پاک کی روشنی میں انبیاء کرام کی زندگی کا مطالعہ کریں تو آسانی سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے درخت کھانے کی لغزش، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبطی کے مارنے کی لغزش، حضرت داؤد علیہ السلام سے مقدمہ کے فیصلہ میں لغزش، حضرت یونس علیہ السلام سے بستی چھوڑنے کی لغزش صادر ہوئی، یہ الگ بات ہے کہ انبیاء کرام کو عصمت کا مقام حاصل ہے اس لئے وہ لغزشوں پر قائم نہیں رہتے اللہ کی جانب سے ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ غیر شعوری طور سے خطاؤں اور لغزشوں کا صدور انسانی خاصہ ہے، انبیاء کرام سے لغزشوں کا صدور اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء کرام انسان ہوا کرتے ہیں، ہاں انبیاء کرام اللہ کے فضل خاص سے اخلاق، عادات اور فہم و بصیرت میں اپنے ہم عصروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

رسولوں کے سردار فداہ ابی وامی نبینا محمد ﷺ بھی انسان تھے اس لئے آپ کے ساتھ بھی بشری عوارض لاحق تھے اور آپ سے بھی بعض حالات میں بشری لغزشیں ہوئیں اور اللہ کی جانب سے آپ کو فوراً تنبیہ ہوئی۔ واقعات کی تفصیل طول کا باعث ہوگی اس لئے ہم صرف چند آیات کریمہ نقل کر کے ترجمہ کر دیتے ہیں، آپ حقیقت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ بشر تھے یا ما فوق البشر تھے؟

۱۔ ﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ﴾ (احزاب:۳۷)

ترجمہ: یاد کیجئے جب کہ آپ اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا کہ تم اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو اور اللہ سے ڈرو، اور آپ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ اور آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں حالانکہ اللہ کو زیادہ حق پہنچتا ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔

۲۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (تحریم:۱)

ترجمہ: اے نبی آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جسے اللہ نے حلال کیا ہے (کیا) آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ (خیر) اللہ بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

۳۔ ﴿عَبَسَ وَتَوَلَّى، أَن جَاءَهُ الْأَعْمَى، وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى، أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَى، أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَى، فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّى، وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّى، وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَى، وَهُوَ يَخْشَى، فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّى﴾

(عبس:۱۔۱۰)

ترجمہ: وہ ترش رو ہوا اور منہ موڑ لیا، اس بناء پر کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا، تمہیں کیا پتہ شاید وہ پاک ہو جاتا، یا نصیحت سنتا اور نصیحت اسے فائدہ پہنچاتی، رہا وہ شخص جو لاپرواہی برتتا ہے تو آپ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، جبکہ وہ اگر پاکی حاصل نہ کرے تو آپ پر کوئی الزام نہیں، اور وہ شخص جو آپ کے پاس دوڑ کر آتا ہے اور وہ ڈرتا بھی ہے، تو آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں۔ (یہ مناسب نہیں)

جولوگ انبیاء کرام کوخصوصاً نبی کریم ﷺ کو بشری صفات کے ماوراء الٰہی صفات سے متصف ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے لئے مذکورہ آیات میں عبرت وموعظت کے لئے خاصا درس موجود ہے،اگر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تکوینی،تخلیقی اور ترزیقی امور میں تصرفات کا اختیار دے رکھا ہے اور الٰہی امور میں شریک کرلیا ہے تو پھر سورہ اسراء اور سورہ الحاقہ کی آیات میں آپ سے کسی فرضی خطا پر جووعید سنائی گئی ہے اس کا کیا معنی ہوگا؟

اس کے بعد دوسرے عنوان کے تحت تین آیتوں میں آپ کی زلات پر آپ کوتنبیہ کی گئی اگر نبوت اور رسالت، انسانیت اور بشریت سے مافوق کسی ہستی اور قوت وطاقت کا نام ہے تو پھر انبیاء کرام سے اور ہمارے نبی کریم ﷺ سے لغزشیں صادر کیسے ہوئیں اور ان پر آپ کوتنبیہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

حقیقت وہ نہیں جو ماضی کے کفار ومشرکین اور آج کے متبدعین نے سمجھ رکھا ہے کہ رسالت اور بشریت کا اجتماع ناممکن ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے انسانوں ہی میں سے اپنے کسی بندے کومنتخب کرتا ہے اور جس قوم کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے اس کا نبی اور رسول اسی قوم کا ایک باصلاحیت فرد ہوتا ہے،انہیں کی زبان بولتا ہے اور اللہ کا پیغام انہیں کی زبان میں پہنچاتا ہے تاکہ قوم کو اس کی بات کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو اور اجنبی ہونے کی وجہ سے قوم کو وحشت نہ ہو۔

انبیاء انسانی اوصاف سے متصف ہوتے تھے: مثلاً

نسیان: نسیان انسان کا خاصہ ہے انبیاء کرام میں بھی یہ خاصہ پایا جاتا ہے۔

۱۔ آدم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَى آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْماً﴾ (طٰہٰ:۱۱۵)

بیشک اس سے پہلے ہم نے آدم کو ایک حکم دیا تھا لیکن وہ اسے بھول گئے اور ہم نے ان میں وہ پختگی نہیں پائی۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفیق کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا﴾ (الکہف:۶۱)

جب وہ دونوں دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچے تو اپنے ساتھ کی مچھلی دونوں بھول گئے۔

۳۔ نبی کریم ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے۔

﴿وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ﴾ (الکہف:۲۴)

جب آپ بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کر لیا کریں۔

نسیان لازمۂ بشریت ہے انبیاء سابقین اور خود ہمارے نبی ﷺ سے بھی نسیان کا صدور ہوا ہے یہ چیز شان رسالت کے منافی نہیں ہے۔

ازواج واولاد: ازواج واولاد کا ہونا بھی انسان کا خاصہ ہے انبیاء سابقین اور خود ہمارے نبی کریم ﷺ بھی اس سے مبرا اور مجرد نہیں تھے۔

ا۔ تمام انبیاء کے بارے میں ایک عام اصول بتایا جارہا ہے۔

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجاً وَذُرِّيَّةً﴾(رعد:۳۸)

بیشک آپ سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے ہیں اور ہم نے ان کے لئے بیویاں اور اولاد بھی پیدا کی ہیں۔

۲۔ نبی کریم ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ﴾ (الاحزاب:۵۰)

اے نبی ہم نے آپ کے لئے آپ کی بیویوں کو حلال کر دیا ہے۔

جس کی بیوی اور بچے ہوں وہ ظاہر ہے انسان ہوگا۔ انسان سے اوپر نہ فرشتہ ہوسکتا نہ خدا ہوسکتا ہے۔

دعاءاوراستغفار

قرآن پاک میں بار بار اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ اللہ سے دعاء مناجات، استعاذہ اوراستغفار کرتے رہو اللہ تعالیٰ دعاء اوراستغفار سے خوش ہوتا ہے، غور کیا جائے تو آسانی سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ دعا، استغفار اور خشوع وخضوع آدمی اسی وقت اختیار کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو عاجز، مجبور، کمزور، نیازمند اور بے سہارا سمجھتا ہے اپنے عجز کا احساس جسے جتنا زیادہ ہوگا اسے اپنی بندگی اور عبدیت کے اظہار میں اتنا ہی زیادہ اخلاص ہوگا۔ مقام الوہیت اور مقام عبدیت کو انبیاء کرام سے زیادہ کوئی نہیں جانتا، اسی لئے ان کی دعاؤں میں جو اخلاص وسچائی، خودسپردگی اور عبدیت کی نمائندگی ہوتی ہے وہ کسی اور کی دعا میں نہیں ہوسکتی، اگر آپ قرآن پاک کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انبیاء کرام عبدیت کے اِس مقام عالی پر کامل اتر رہے ہیں خصوصاً انبیاء کے سردار ہمارے نبی اکرم ﷺ کی عبدیت اس معیار پر سب سے کامل ہے، چنانچہ جہاں آپ کی تکریم وتعظیم کا قرآن کریم میں ذکر خیر ہے وہاں آپ کو اللہ تعالیٰ نے لفظ''عبد'' سے یاد فرمایا ہے۔ خودسپردگی اور بندگی جتنی زیادہ ہوگی دعاء میں اخلاص اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ انبیاء کرام کا اور نبی کریم ﷺ کا اللہ سے دعاء اور استغفار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء کرام اور خود نبی کریم ﷺ اللہ کی جناب میں قولاً اور فعلاً دونوں طرح اپنے عجز اور اپنی مجبوری کا اعتراف کررہے ہیں کہ یہی شان بندگی کے لائق ہے کہاں اللہ کی قدرت کاملہ اور کہاں انبیاء کی عبدیت کاملہ؟ اس وضاحت کے بعد بھی انبیاء کرام کو بشریت کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کے مقام پر فائز کرنے کا عقیدۂ فاسد کسی عقل سلیم رکھنے والے کوراس آسکتا ہے؟

یہ چند باتیں بطور نمونہ ہم نے پیش کردی ہیں ورنہ اگر قرآن کریم کا مطالعہ کیا

جائے تو صاف پتہ چلے گا کہ انبیاء کرام بشر اور انسان تھے۔ انسان کے تمام دواعی اور تقاضے ان کا لازمہ تھے۔ حزن وغم، غیظ وغضب، خوف وہراس، ہنسنا بولنا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، بول وبراز، بیوی بچے، رشتہ ناتہ، موت وحیات، بھول چوک، زلات وانفعالات غرض وہ تمام عوارض جو کسی انسان کو لاحق ہوتے ہیں وہ سب آپ کے ساتھ بھی تھے، پھر اگر انسانیت میں ہم جیسے نہیں تھے تو کیا تھے؟ انسان کے تمام خواص جس کے اندر ہوں اگر وہ انسان نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ آپ کی بشریت کا سب سے بڑا ثبوت قرآن پاک کی شہادت ہے، فرض کیجئے اگر کوئی کہتا ہے کہ "قل انما انا بشر مثلکم" سے مراد انسان تو ہو سکتے ہیں لیکن ہم جیسے نہیں، تو میں کہتا ہوں کہ قرآن پاک تو "کتاب مبین" ہے، بیان ہونے کا تقاضہ تو یہ ہے کہ واقعی آپ ہم جیسے انسان ہوں۔ لیکن فرض کیجئے اگر آپ ہم جیسے انسان نہیں تھے تو اللہ تعالیٰ کو یہی کہلوانا چاہیۓ تھا کہ "اے نبی کہہ دو میں تم جیسا انسان نہیں ہوں" آخر صاف اعلان کرانے میں اللہ تعالیٰ کو کس کا ڈر تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کہے کچھ اور مراد لے کچھ اور؟

میرے بھائیو! قرآن کریم کی کسی آیت کا وہی معنیٰ بیان کیا جائے گا جو قرآن پاک کی دوسری آیات کے موافق ہو یا حدیث کے موافق ہو، یا صحابہ یا تابعین نے بتایا ہو، یا بعد کے مفسرین اور محدثین نے صحابہ وتابعین کے اقوال کی روشنی میں بتایا ہو اس کے علاوہ دوسری کوئی صورت جائز نہیں ہے۔ بشریتِ انبیاء کی آیات کا علماء امت نے جو معنیٰ بتایا ہے اس سے آپ انحراف کرتے ہیں پھر یہ دعوی کرتے ہیں کہ یہ آیات متشابہات سے ہیں اگر آپ کے دعوی کے مطابق آیات متشابہات سے مان لیا جائے تو آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ان متشابہ آیات کے پیچھے پڑیں آپ کو خاموش رہنا چاہیۓ اس لئے کہ آیات متشابہات کے پیچھے وہی لوگ پڑتے ہیں جن کے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ ہوتی ہے۔ آیت پڑھیۓ اللہ پاک کا ارشاد ہے:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾ (آل عمران:۷)

ترجمہ! پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں، فتنے کی طلب اور اس کی مراد کی جستجو میں، حالانکہ ان کی حقیقی مراد کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔

ایک سوال: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ''پردہ'' فرما گئے۔ کیا آپ کیلئے وفات یا مرنے کا لفظ استعمال کرنا ناجائز اور آپ کی شان میں گستاخی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

جواب: نبی کریم ﷺ انسان تھے اور ہر انسان پر طبعی موت طاری ہوتی ہے، آپ ﷺ پر بھی طبعی موت طاری ہو چکی ہے، آپ پر وفات، موت اور مرنے کا اطلاق درست اور جائز ہے اس سے آپ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں لازم آتی آپ کو یہ کہنا کہ آپ پردہ فرما گئے ہیں یہ عقیدہ کی زبردست گمراہی ہے۔ قرآن وحدیث سے دلیل سنیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ﴾ (زمر:۳۰)

یقیناً اے نبی آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں۔

۲۔ ﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ﴾ (انبیاء:۳۴)

آپ سے پہلے ہم نے کسی انسان کو دائمی زندگی نہیں دی، تو کیا آپ مر جائیں گے تو یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟

ظاہر ہے ہمیشہ کوئی نہیں رہے گا۔ کفار نبی کریم ﷺ کی دعوت وتبلیغ کو اپنے لئے ایک مصیبت سمجھتے تھے لیکن آپ کے زور بیان اور براہین قاطعہ کے سامنے ان کی

نہیں چل پاتی تھی اس لئے زچ ہو کر کہتے: آخر ایک دن اس کو مر ہی جانا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا! وہ مر جائیں گے تو کیا تم لوگ نہیں مرو گے؟ موت تو ہر انسان کو آتی ہے، محمد ﷺ بھی ایک انسان ہیں اس لئے اس اصول سے وہ مستثنیٰ نہیں ہیں اور تم بھی مستثنیٰ نہیں ہو۔ موت سب کو آنی ہے اور سب کو مرنا ہے۔

۳۔ ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئاً وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ (آل عمران:۱۴۴)

حضرت محمد ﷺ صرف رسول ہی ہیں ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر یہ بھی مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاؤ گے؟ سنو! جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جائے گا وہ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا، البتہ اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دیگا۔

غزوۂ احد میں مسلمانوں کی شکست کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کافروں نے یہ ہوا اڑا دی کہ محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے۔ یہ خبر سن کر بعض مسلمان دل برداشتہ ہو گئے، ان کے حوصلے پست ہو گئے اور جنگ سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس مناسبت سے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ کفار کے ہاتھوں محمد ﷺ کا قتل ہو جانا یا آپ پر موت کا طاری ہو جانا کوئی نئی بات تو ہے نہیں آپ سے پہلے بہت سارے انبیاء دنیا میں تشریف لائے اب ان میں سے ایک بھی نہیں ہیں، کوئی قتل کیا گیا، کوئی طبعی موت سے مرا، بالفرض اگر آپ بھی قتل یا موت سے دوچار ہو جائیں تو کیا تم ایمان لانے کے بعد ایمان سے پھر جاؤ گے؟ فرض کرو تم ایمان سے پھر ہی گئے تو کس کا بگڑا۔ تمہارا یا اللہ کا؟ ظاہر ہے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

بگڑے گا تمہارا۔

صرف تین آیتیں آپ کو سنائی گئیں ہیں، تینوں آیتوں میں صاف صاف نبی کریم ﷺ کی طرف موت کی نسبت کی گئی ہے، قرآن پاک سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی، اس سے معلوم ہوا کہ آپ پر لفظ موت کا اطلاق درست اور جائز ہے۔

حدیث سے بھی دلیل سن لیجئے اور حدیث میں سب سے صحیح حدیث، صحیح بخاری کی تسلیم کی گئی ہے اس لئے صحیح بخاری کی حدیث سماعت فرمائیں:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب المغازی کے اخیر میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے:

"باب مرض النبی ﷺ ووفاته وقول اللّٰہ تعالیٰ "انك ميت و انهم ميتون"

باب کے اثبات میں متعدد حدیثیں پیش کی گئی ہیں، آگے چل کر امام المحدثینؒ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث ذکر کرتے ہیں جس میں حضرت عائشہ اپنے والد محترم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خطبہ نقل کرتی ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی وفات پر وہاں موجود نہیں تھے جب آئے تو چادر ہٹا کر آپ کو بوسہ دیا اور فرمایا!"بابی انت وامی واللّٰہ لا يجمع اللّٰہ عليك موتتين اما الموتة التی كُتبت عليك فقد مُتها" میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ آپ پر دو موت جمع نہیں کرے گا جو موت آپ پر لکھی تھی وہ موت آپ مر چکے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں:"مَنْ كَانَ مِنْكُم يَعْبُدُ مُحَمَّداً فَإِنَّ مُحمداً قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ مِنكُم يَعْبُدُاللّٰہ فَإِنَّ اللّٰہ حَیٌّ لَا يَمُوت" (صحیح بخاری، مغازی)

جو کوئی محمد کی عبادت کرتا تھا تو وہ سن لے کہ محمد ﷺ مر چکے ہیں اور جو کوئی

اللہ کی عبادت کرتا تھا تو سن لے! بلاشبہ اللہ زندہ ہے اس کو موت نہیں آئے گی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے جتنے قریبی تھے اور آپ کو جتنا جانتے اور سمجھتے تھے اتنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی نہیں سمجھتے تھے آج کے بدعتی کیا سمجھ پائیں گے؟ مگر دیکھئے بار بار آپ کی طرف موت کی نسبت کررہے ہیں نہ کوئی بے ادبی ہورہی ہے نہ کوئی گستاخی، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی بات کی تائید اور دلیل میں سورہ آل عمران کی وہی آیت کریمہ پیش کررہے ہیں جو ابھی آپ کو سنائی جاچکی ہے۔

میرے بھائیو! آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بیمار پڑے، بیماری کے ایام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امامت کرائی، سوموار کے دن چاشت کے وقت آپ کی وفات ہوئی، جس طرح عام مُردوں کو کفن دفن کرتے ہیں اسی طرح آپ کو نہلایا گیا، کفن دی گئی، قبر کھودی گئی، نماز جنازہ پڑھی گئی اور مٹی کے اندر قبر میں آپ کو دفن کیا گیا۔ کیسے مان لیا جائے کہ آپ پر موت نہیں آئی کیا صحابہ کرام نے آپ کو زندہ دفن کردیا۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

رہ گیا یہ مسئلہ کہ آپ پردہ فرما گئے، تو ابتک قرآن وحدیث میں ہمیں کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکا جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ نبی کریم ﷺ نے پردہ فرمالیا، یا حجاب اختیار کرلیا اور یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ پر اللہ کی جانب سے دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اگر آپ حجاب فرمالیں تو یہ ذمہ داری ادا کیسے ہوگی؟ آپ کے بیوی بچے تھے، آپ مرد تھے اس لئے پردہ اور حجاب اختیار کرنا آپ کی شان کے خلاف بات ہوگی۔ پردہ تو عورتیں اختیار کرتی ہیں یا پھر مجرمین چھپے چھپے پھرتے ہیں اور الحمد للہ نبی کریم ﷺ ان میں سے کچھ بھی نہ تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ آپ پردہ فرماگئے ایک انتہائی لغو اور بے معنیٰ لفظ ہے جو آپ کی شان اقدس کے خلاف ہے۔

بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ''پردہ فرمانے'' کی اصطلاح وضع کرنے سے عقیدۂ

الوہیت کی بو آتی ہے، تو بجا ہے اس لئے کہ معبود اور الٰہ وہی ہو سکتا ہے جو "حــــی لا یـمـوت" ہو یعنی ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ اس پر کبھی موت طاری نہ ہو۔ مبتدعین نے چونکہ نبی کریم ﷺ کو الوہیت کا درجہ دیدیا ہے اس لئے ایسا عقیدہ ماننا لازم ہوا جو آپ سے موت کی نفی پر مشتمل ہو۔ الوھیت کا عقیدہ ذیل کے اشعار سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر
اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمد سے

دونوں اشعار بتا رہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو الوھیت کا درجہ دیدیا گیا ہے۔ اس لئے مجبوراً آپ سے موت کی نفی کا عقیدہ وضع کیا گیا اور اس کے لئے "پردہ فرمانے" کی اصطلاح گھڑی گئی حالانکہ کتاب وسنت میں اس اصطلاح کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

کچھ لوگ مرنے والے کے لئے موت اور وفات کا لفظ نہ استعمال کر کے "وصال" اور انتقال کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ حلول اور اتحاد کی خبر دیتے ہیں جو صوفیہ کا عقیدہ ہے اس لئے کوئی مشتبہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہئے۔ قرآن وحدیث میں موت اور وفات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لئے سیدھے سیدھے وہی لفظ استعمال کرنا چاہئے، اس سے کوئی گستاخی اور بے ادبی نہیں لازم آتی۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں اور آپ کو حق کی رہنمائی فرمائے۔ آمین

☆☆☆

وسیلہ کیا ہے

نکات:

(۱) استدلالی تک بندیاں۔

(۲) عبادات میں سختی۔

(۳) حلت وحرمت میں سختی۔

(۴) وسیلہ کا مفہوم۔

(۵) جائز وسیلہ! اسماء حسنیٰ۔

(۶) اعمالہ صالحہ۔

(۷) زندہ بزرگوں کی دعا۔

(۸) تھوڑی توجہ اور دیں۔

(۹) نبی ﷺ کو بھی نفع ونقصان کا اختیار نہیں۔

(۱۰) مردے نہیں سنتے۔

(۱۱) قائلین سماع کے دلائل اور ان کا جائزہ۔

(۱۲) تعارض کا جواب۔

(۱۳) خلاصہ بحث۔

(۱۴) حیات برزخ۔

کتاب وسنت کی تعلیمات اور ان پر عمل ایک سچے مومن کی روحانی غذا ہے، وہ اپنے ہر قول وعمل کیلئے کتاب وسنت سے دلیل تلاش کرتا ہے اور جب آدمی کتاب

وسنت کی شاہراہ سے ہٹ جاتا ہے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی باتیں بوجھ معلوم ہوتی ہیں۔آپ حدیث سنائیں گے تو اسکو نیند اور جمائی آئے گی، قرآن وحدیث چھوڑ کر کسی پیر، فقیر اور قبر والے کی جھوٹی کرامتیں اور جھوٹے قصے شروع کر دیجئے تو مگن ہو جائے گا اور سر ہلائے گا۔عوام کو بیوقوف بنانے اور باطل عقائد کی اشاعت کے لئے بیجا تک بندیوں کا بازار گرم ہے۔دلیل میں کتاب وسنت کی جگہ تک بندیوں سے کام نکال لیا جاتا ہے اس لئے اصل موضوع پر آنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ تک بندیوں کا کچھ نمونہ پیش کر دیا جائے۔

استدلالی تک بندیاں:

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

(۱) ﴿وَاسْتَعِينُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ﴾(بقرہ/۴۵)

صبر اور نماز کے ذریعہ مدد حاصل کرو۔

نماز اور صبر عمل صالح ہے اور عمل صالح کو وسیلہ بنا کر اللہ سے مدد مانگنا جائز ہے۔لیکن جو لوگ مردوں سے استغاثہ اور مدد مانگنا جائز کہتے ہیں وہ اس طرح استدلال کرتے ہیں۔

نماز کے ذریعہ مدد حاصل کرنا جائز ہے اور نماز ''غیر اللہ'' ہے لہٰذا ''غیر اللہ'' سے مدد مانگنا جائز ہے۔دلیل ہوگئی اب آپ کتا شاہ، چوہا شاہ، مغلانی بابا، پنیہوا بابا سے مدد مانگ سکتے ہیں۔

(۲) چھت پر جانے کیلئے سیڑھی کی ضروت ہے، لہٰذا اللہ تک رسائی کیلئے کسی سیڑھی اور وسیلہ کی ضرورت ہے، وہ وسیلہ کیا ہونا چاہئے اس سے بحث نہیں، زندہ،

مردہ، گھوڑا، گدھا سب ہو سکتے ہیں۔

(۳) کہا جاتا ہے! ''یارسول اللہ'' کہنا جائز ہے کیوں جائز ہے؟ دلیل کلمۂ توحید کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ میں کہا جاتا ہے ''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں'' جب ''ہیں'' تو ثابت ہو گیا ''زندہ ہیں'' اور ''ہر جگہ ہیں'' لٰہذا ''یارسول اللہ'' کہنا جائز ہو گیا۔

(۴) کسی کو برص کی بیماری ہے تو ''ایام بیض'' یعنی چاند کی ۱۳/۱۴/۱۵ تاریخ کو روزہ رکھے سفید داغ ختم ہو جائیں گے اس لئے کہ داغ بھی سفید اور ایام بیض بھی سفید۔ سفید۔ سفید کا تک بیٹھ گیا ہے اور دلیل ہو گئی۔

(۵) کسی کی بینائی کمزور ہے تو آیت کریمہ ''فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید'' کا ورد کرے کیوں؟ اس لئے کہ آنکھ کا پردہ ہٹانا ہے اور آیت میں آنکھ کے پردہ ہٹانے کی بات کہی گئی ہے دونوں کا تک بیٹھ گیا دلیل ہو گئی۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ یہ آیت کس پس منظر میں کہی گئی ہے۔

(۶) دعویٰ ہے! انبیاء کرام بشر نہیں تھے۔ دلیل کیا؟ دلیل یہ ہے کہ ان کی قوم نے اپنے انبیاء کو ''بشر'' کہا اور کافر ہو گئے۔ یعنی قوم اس لئے کافر قرار پائی کہ انھوں نے نبی کو بشر کہہ دیا۔ قوم نے انبیاء کی تکذیب کی، مذاق اڑایا، ان سے قتال کیا، ان کو قتل کیا، اللہ کا انکار کیا، کفر اور شرک کیا لیکن کافر نہیں ہوئے۔ بشر کہہ دیا اور کافر ہو گئے۔ یہ ہے دلیل۔

(۷) قبروں پر سجدہ کرنے کی ایک اور مزخرف دلیل سماعت فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کا سجدہ کریں۔ انھوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل کی، آدم کا سجدہ کیا اور اطاعت گزار قرار پائے۔ لیکن ابلیس نے آدم کا سجدہ نہیں کیا۔ اس نے کہا! اے اللہ میں صرف تیرا سجدہ کروں گا۔ غیر اللہ کا سجدہ نہیں

کروں گا۔ دیکھئے! ابلیس نے غیر اللہ کے سجدے کا انکار کیا تو راندۂ درگاہ اور گمراہ قرار پایا۔

اولیاء کی قبریں بھی غیر اللہ ہیں ان کے سجدے کا جو انکار کرے گا وہ بھی گمراہ اور راندۂ درگاہ ہوگا۔

سنا آپ نے کتنی آسانی سے شرک کا دروازہ کھول دیا گیا۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

میرے بھائیو! یہ استدلالی تک بندیوں کی چند مثالیں ہیں، ان کو کتاب وسنت سے دلیل نہیں چاہیے، تک بیٹھ گیا دلیل ہوگئی۔ کتاب وسنت کا موقف کیا ہے اس سے انھیں کوئی مطلب نہیں۔

لیکن میرے بھائیو! اسلام اس طرح کی تک بندیوں اور جوڑ توڑ کا نام نہیں ہے، اسلام کی عمارت پختہ اصولوں اور ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے۔ خصوصیت سے وہ امور جن کا عبادات سے یا حلت وحرمت سے تعلق ہے ان میں اسلام کی تعلیمات نہایت سخت ہیں جب عبادات میں قیاس نہیں چل سکتا تو ان تک بندیوں کی کیا حیثیت ہوگی؟

لیجئے ہم مثال سے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام نے عبادات اور حلت وحرمت کے مسئلے میں کتنا سخت موقف اختیار کیا ہے؟

عبادات میں سختی:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے متعدد صحابہ کرام سے سنا: ان میں سب سے بہتر میرے نزدیک عمر بن خطاب ہیں

(رضی اللہ عنہ) کہا "أن رسول اللہ ﷺ نهى عن الصلوة بعد الفجر حتى تطلع الشمس وعن الصلاة بعد العصر حتى تغرب الشمس" (جامع ترمذی/۱۸۳) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فجر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ سورج نکل جائے اور عصر کے بعد بھی منع فرمایا یہاں تک کہ سورج ڈوب جائے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے سترہ صحابہ کرام کا حوالہ دے کر اشارہ فرمایا ہے کہ اس مضمون کی روایات فلاں فلاں صحابی رسول سے بھی آتی ہیں۔ اور ان روایتوں میں بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایتیں بھی ہیں۔ اس سے آپ روایت کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

یہ روایت پیش کر کے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نماز جیسی عبادت میں وقت کی یہ پابندی کیوں عائد کی گئی؟ وجہ صرف اشتباہ سے بچنا ہے۔ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اوقات میں سورج کی پوجا کرنے والے اسکی پوجا کرتے ہیں اور شیطان کمبخت ان اوقات میں سورج کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ اسی بہانے میری بھی پوجا ہو جائیگی۔

ہم اور آپ خوب جانتے ہیں کہ ان اوقات میں اگر کوئی مسلمان نماز پڑھے گا تو اللہ کیلئے پڑھے گا نہ کہ سورج یا شیطان کے لئے۔ لیکن معمولی اشتباہ کیوجہ سے ان اوقات میں نماز پڑھنے ہی سے منع کر دیا گیا ہے۔ آپ اس مختصر تشریح سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ عبادات کے معاملہ میں اسلام کا موقف کتنا سخت ہے۔ اس لئے عبادت کے نام پر کوئی ایسا کام نہیں کیا جائے گا، جس کا قرآن وحدیث سے صریح ثبوت نہ ہو۔ مردوں سے استغاثہ میں اہل قبور جتنا کام کرتے ہیں سب کا تعلق عبادت سے ہے

اور ان کا کوئی ثبوت کتاب وسنت سے نہیں ہے۔

حلت وحرمت میں سختی:

کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا صرف اللہ کے اختیار میں ہے، یہ اختیار اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیا ہے، یہاں تک کہ اپنے آخری نبی فداہ ابی وامی ﷺ کو بھی یہ اختیار نہیں دیا ہے۔ مثال سماعت فرمائیں۔ صحیح روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ عصر کے بعد اپنی تمام ازواج مطہرات کے پاس تھوڑی دیر کیلئے خیریت معلوم کرنے جایا کرتے تھے اور یہ آپ کا روز کا معمول تھا۔ اتفاق سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس کہیں سے شہد آ گیا تھا۔ آپ جب ان کے پاس پہنچتے تو وہ شہد کا شربت تیار کرتیں اور آپ کو پلاتیں۔ اس لئے شربت تیار کرنے اور پینے میں ان کے پاس کچھ دیر ہو جایا کرتی، دوسری ازواج مطہرات کو معمول سے زیادہ حضرت زینب کے پاس آپ کا ٹھہرنا ناگوار گذرا۔ آپ کو روکنے کیلئے بعض ازواج مطہرات نے آپس میں مشورہ کیا اور آپ سے کہا: آپ کے منہ سے مغافیر (ایک گوند ہے جس میں بساندہ ہوتی ہے) کی بو آتی ہے۔ آپ نہایت نفاست پسند واقع ہوئے تھے، مہک کا نام سن کر آپ نے فرمایا: زینب کے یہاں شہد کا شربت پیا کرتا تھا اب نہیں پیوں گا۔

(صحیح بخاری، تفسیر سورہ تحریم، ۴۹۱۲)

شہد ایک پاکیزہ اور حلال چیز ہے اس کو آپ نے اپنے اوپر حرام کر لیا، اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ نازل فرمائی: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ﴾ اے نبی آپ کیوں اس چیز کو حرام کر رہے ہیں جس کو اللہ نے آپ کیلئے حلال کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ حلت وحرمت کا اختیار اللہ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے یہاں

تک کہ نبی کریم ﷺ کو بھی اختیار نہیں ہے۔تو پھر ان تک بندیوں سے قبروں کا سجدہ اور مردوں کا وسیلہ کیسے جائز ہو جائے گا؟

اب آیئے ہم آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ''وسیلہ'' کا مطلب کیا ہے اور کس کا وسیلہ جائز اور کس کا ناجائز ہے؟

وسیلہ کا مفہوم:

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالىٰ:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّٰهَ وَابْتَغُواْ إِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ﴾ (مائدہ/۳۵)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور اسکا قرب تلاش کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿أُولٰـئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ﴾ (اسراء/۵۷)

جنھیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب کے تقرب کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ان میں کون اللہ کا زیادہ قریبی ہے اور وہ خود اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

دو آیت کریمہ آپ کو سنائی گئی ہے ایک سورہ مائدہ کی ہے اور دوسری سورہ اسراء کی ہے۔

وسیلہ کا مفہوم کیا ہے؟ وسیلہ کب جائز ہے اور کب ناجائز ہے؟ یہ ایسی بحثیں ہیں جن پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ پھر بھی یہ بحث ختم ہونیکا نام نہیں لیتی، ناچیز سے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کے لئے کہا جا رہا ہے۔اس لئے

میں نے مناسب جانا کہ اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود عوام کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے کچھ اظہار خیال کی کوشش کروں وباللہ التوفیق۔

پہلے ہم وسیلہ کا مفہوم بیان کرتے ہیں۔ وسیلہ کے جواز اور عدم جواز کی بحث اور اس کے دلائل بعد میں بیان کئے جائیں گے۔

دونوں آیتوں میں ''وسیلہ'' کا لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ ایک ہی معنی مراد ہے یعنی اللہ کا تقرب حاصل کرنا دوسری آیت میں اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ مشرکین اللہ کو چھوڑ کر جن لوگوں کو پکارتے ہیں اور ان سے دعائیں کرتے ہیں وہ خود اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں، اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اللہ سے ڈرتے ہیں، چاہے وہ ان کی قوم کے انبیاء ورسول ہوں یا اولیاء اور صلحاء ہوں یا جنات وشیاطین ہوں سب اللہ کے سامنے مجبور ہیں وہ نہ کسی کی دعا قبول کر سکتے ہیں نہ کسی کی تکلیف دور کر سکتے ہیں نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں وہ تو خود اللہ کا تقرب حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کا تقرب حاصل کرنا مسلمانوں کا ایک اجماعی مسئلہ ہے، اس میں کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا اگر اس میں کسی نے ذرہ برابر اختلاف کیا تو وہ اسلام سے خارج ہو جائیگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کا تقرب کس طرح حاصل کیا جائے؟ اس کا کیا طریقہ اور کیا ذریعہ ہے؟ پہلے ہم کتاب وسنت کی روشنی میں ان مسائل کی وضاحت کر رہے ہیں جن سے اللہ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے قرآن وحدیث میں تتبع کے بعد علماء کرام نے لکھا ہے کہ اللہ کا تقرب (وسیلہ) تین چیزوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پہلا وسیلہ: اسماء حسنیٰ

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اللہ کے اسماء حسنیٰ کے ذریعہ اللہ سے دعا کرو۔ اسماء حسنیٰ سے مراد اللہ کی وہ صفات ہیں جو قرآن وحدیث میں وارد ہیں اور اللہ کی عظمت وجلالت اور شان کبریائی پر دلالت کرتی ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ الأَسْمَاء الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا﴾ (اعراف/۱۸۰)

اور اللہ ہی کے لئے اسماء حسنی ہیں لہٰذا تم انھیں کے ذریعے اللہ کو پکارو۔ صحیح بخاری کی روایت ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:

قَالَ: لله تسعةٌ و تِسعونَ اسماً. مِائةٌ اِلا واحدةً. لا يَحفَظُها أحَدٌ إلا دَخَلَ الجنةَ، وَهُو وِترٌ يُحِبُّ الوِترَ"

(صحيح بخاری، دعوات/ ٦٤١٠)

آپ نے فرمایا: اللہ کے ننانوے (ایک کم سو) نام ہیں، ان کو جو شخص یاد کرلے گا وہ جنت میں جائیگا۔ اللہ تعالیٰ طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ دعاء کرب میں ہیں۔

أَللّٰهُم إني أسألكَ بِكُل اسمٍ هُو لَكَ سَمَّيتَ بِه نَفسَك أو أنزَلتَه في كِتَابكَ أوعَلَّمتَه أحداً من خَلقِكَ أوإستأثرتَ به فِي علمِ الغيبِ عندَكَ، أنْ تَجعَلَ القُرآنَ رَبِيعَ قَلْبِي وَ نُورَ صَدرِي وَ جَلاءَ حُزنِي وَذَهابَ هَمِّي وَ غَمِّي۔ (شرح العقیدۃ الطحاویۃ، مستدرک حاکم)

اے اللہ! میں سوال کرتا ہوں تیرے ہر اس نام کے ذریعے جس سے تو نے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے یا اس کو اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے یا اس کو اپنی مخلوق

میں سے کسی کو سکھایا ہے یا اپنے علم غیب میں اس کو محفوظ رکھا ہے کہ تو قرآن کریم کو میرے دل کی بہار اور سینے کا نور بنادے اور میرے حزن وغم کی دوری کا ذریعہ بنادے۔خود نبی کریم ﷺ کثرت سے یہ دعا کیا کرتے تھے۔"يَا حَيُّ يَا قَيُّوم بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيث" (جامع ترمذی)

اے حی، قیوم (اللہ) میں تیری رحمت کے وسیلے سے تجھ سے فریاد کرتا ہوں۔

آیت کریمہ اور حدیث پیش کر کے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ کے وسیلہ کی ایک شکل اللہ کے اسماء حسنیٰ اور اس کی صفات عالیہ کا واسطہ ہے۔قرآن کریم میں صراحۃً اس کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ سے دعاء کرنی ہو یا کچھ مانگنا ہو تو اللہ کے اسماء حسنیٰ کے واسطے سے مانگو اور دعاء کرو۔

حدیث کے اندر بھی سوال کیلئے، استغاثہ اور فریاد کیلئے اللہ کے اسماء حسنیٰ ہی کا واسطہ اور وسیلہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔قرآن وحدیث دونوں ہی سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ عزوجل سے کوئی دعا کرنی ہو، کچھ مانگنا ہو، کوئی فریاد اور استغاثہ ہو تو پہلے اللہ کے اسماء حسنیٰ اور صفات جلیلہ کا ذکر کریں، اس کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کریں، اسکی رحمت وشفقت کا واسطہ دیں، اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا اسکی رضا حاصل ہوگی اور جب اللہ کی رضا حاصل ہوگی تو ہماری دعا اللہ کی جناب میں قبول ہوگی۔

معلوم ہوا کہ اللہ کی رضا اور اس کے تقرب کا سب سے پہلا وسیلہ اللہ کی حمد و ثنا اور اس کے اسماء حسنیٰ ہیں۔

دوسرا وسیلہ اعمال صالحہ:

اللہ کا وسیلہ یعنی تقرب حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دعا کرتے

وقت آپ اللہ کے حضور اپنے اعمال صالحہ کا واسطہ پیش کریں مثلاً آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے اس کی معافی چاہتے ہیں، آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہیں اس سے نجات چاہتے ہیں تو اللہ سے دعا کیجئے، دعا کے بہت سارے آداب ہیں ان کو اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے انھیں آداب میں ایک ادب یہ بھی ہے کہ اگر آپ نے کبھی اخلاص اور سچائی کے ساتھ کوئی نیکی کی ہے جس کے حق اور سچ ہونے پر آپ کو یقین کامل ہے کہ یہ نیکی میں نے محض اللہ کی خاطر کی ہے تو اس کا واسطہ اور وسیلہ اختیار کر کے اللہ سے دعا کریں اور امید رکھیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمائیں گے اور آپ کی پریشانی دور ہوگی آپ کی ضرورت پوری ہوگی۔ ایک حدیث سماعت فرمائیں یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں متعدد جگہوں پر نقل فرمایا ہے ہم کتاب الاجارۃ۔ "باب من استاجر اجیراً،، سے آپ کو سنا رہے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: آپ فرما رہے تھے کہ تم سے پہلے زمانے کا واقعہ ہے کہ تین آدمی سفر میں نکلے، رات گذارنے کیلئے پہاڑ کے ایک غار میں داخل ہو گئے اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اوپر سے ایک چٹان گری اور غار کا منہ بند ہو گیا۔ (یہ لوگ غار میں پھنس گئے) ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ اس چٹان سے نجات پانے کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ سب لوگ اپنے اپنے اعمال صالحہ کو وسیلہ بنا کر اللہ سے دعا کریں (تاکہ نجات حاصل ہو)

ان میں سے ایک آدمی نے یوں دعا شروع کی کہ اے اللہ: میرے بوڑھے والدین تھے اور میرا یہ معمول تھا کہ شام کو والدین سے پہلے میں اپنے بال بچوں اور لونڈی غلام کسی کو دودھ نہیں پلاتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن ایسا ہوا کہ کسی چیز کی تلاش

میں مَیں گھر سے بہت دور چلا گیا شام کو جب واپس آیا تو دونوں سو چکے تھے۔ خیر میں نے دودھ دوہا۔ دیکھا تو وہ ابھی سو رہے ہیں اور میں نے ان سے پہلے بچوں کو یا لونڈی اور غلام کسی کو دودھ پلانا پسند نہیں کیا۔ میں ہاتھ میں دودھ کا پیالہ لیکر ان کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ صبح ہوگئی تب دونوں بیدار ہوئے اور دودھ پیا۔ اے اللہ: اگر خالص تیری رضا کی طلب میں میں نے ایسا کیا ہے تو اس چٹان کی وجہ سے جس مصیبت میں ہم پھنسے ہیں اس سے نجات دیدے۔ اتنے میں وہ چٹان تھوڑی سی کھسک گئی لیکن اتنی نہیں کہ وہ نکل سکیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کہ دوسرے شخص نے کہا: اے اللہ میرے چچا کی ایک لڑکی تھی اور مجھکو اس سے بیحد محبت تھی میں نے اس سے برائی کرنی چاہی لیکن اس نے مجھ کو روک دیا۔ ایک سال ایسا ہوا کہ قحط پڑ گیا تو وہ (قرض مانگنے) میرے پاس آئی، میں نے اس کو اس شرط پر ایک سوبیس دینار دیئے کہ وہ مجھکو اپنے اوپر آزاد چھوڑ دے وہ راضی ہوگئی۔ یہاں تک کہ جب میں قابو پا گیا تو اس نے (بطور نصیحت) کہا: ناحق میری مُہر توڑنا تمہارے لئے حلال نہیں ہے (یہ سنکر) زنا کو میں نے گناہ جانا اور اس سے دور ہوگیا حالانکہ وہ مجھے سارے لوگوں سے محبوب تھی، اور جو دینار میں نے اس کو دیئے تھے اس کو بھی دیدیا۔ اے اللہ: اگر یہ کام میں نے تیری رضا کی طلب میں کیا ہے تو جس مصیبت میں ہم گرفتار ہیں اسے دور فرمادے۔ اتنے میں چٹان تھوڑی سی کھسک گئی مگر وہ لوگ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کہ تیسرے آدمی نے کہا: اے اللہ میں نے ایک کام پر چند مزدور رکھے تھے، سب کی مزدوری تو میں نے دیدی لیکن ایک مزدور اپنی مزدوری چھوڑ کر چلا گیا، میں نے اس کی مزدوری کو کام میں لگایا یہانتک کہ اس کا مال

بہت بڑھ گیا، ایک زمانے کے بعد وہ آیا اور کہا: اللہ کے بندے میری مزدوری میرے حوالے کرو، میں نے کہا: یہ اونٹ، گائے، بکری اور غلام جو تم دیکھ رہے ہو سب تمھاری مزدوری کا ہے (لے جاؤ) اس نے کہا: اللہ کے بندے مجھ سے مذاق نہ کرو، میں نے کہا: میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں، خیر وہ ہانک کر سب لے گیا کچھ نہیں چھوڑا۔ اے اللہ اگر یہ کام میں نے تیری خوشی کی طلب میں کیا ہے تو جس مصیبت میں ہم لوگ ہیں اس کو دور فرمادے فوراً چٹان کھسک گئی اور سب نکل کر چلے گئے۔

حدیث میں بہت سارے فوائد ہیں۔ والدین کی خدمت، بیٹی بیٹا پر والدین کی ترجیح، زنا اور معصیت سے بچنا، عورت کی نیکی اور نصیحت آموز باتیں، اس کی خشیت الٰہی، ایمان داری اور امانت، حقدار کے حق کی حفاظت وغیرہ۔

ہم بتانا یہ چاہ رہے تھے کہ اعمال صالحہ اللہ کے تقرب اور اسکی رضا کا وسیلہ ہوتے ہیں آپ نے سنا کہ چٹان گرنے کی وجہ سے تینوں آدمی غار میں اس طرح بند ہو گئے تھے کہ بظاہر اس سے نکلنا محال تھا، لیکن ہر مصیبت کو ٹالنے والا اللہ ہے۔ نہ کہ کوئی پیر اور فقیر۔ تینوں نے آپس میں طے کیا کہ اس مصیبت سے صرف اللہ ہی نجات دے سکتا ہے اس لئے اللہ کو خوش اور راضی کرنے کیلئے پہلے اپنی پچھلی زندگی کے اوراق الٹو، دیکھو زندگی میں کبھی کوئی ایسی نیکی نظر آتی ہے جہاں اخلاص کے سوا کچھ اور نہ ہو اگر زندگی میں ایسا کوئی واقعہ اور عمل صالح مل جائے تو اسی کو اللہ تک پہنچنے اور اسکی رضا کے حصول کے لئے وسیلہ اور واسطہ بنا کر دعا کرو اللہ ہماری مصیبت دور فرمادے گا اور ہم غار سے نکل سکیں گے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ نہیں ہے۔ چنانچہ تینوں نے اپنے ماضی کا جائزہ لیا اور ہر ایک کو ایسا عمل صالح مل گیا جس میں اخلاص تھا، سچائی تھی اس کو اللہ کی رضا کا وسیلہ بنایا جاسکتا تھا۔ اپنی اپنی دعاؤں میں تینوں نے انھیں اعمال صالحہ کا واسطہ دے

کر اللہ سے دعا کی اور اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور وہ غار سے باہر آ گئے۔

اسی واقعہ پر بات ختم نہیں ہوتی، اگر آپ غور کریں تو آسانی سے آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جنت کا دخول بھی اعمال صالحہ پر ہی منحصر ہے، اگر اعمال صالحہ کے ذریعہ ہم نے اللہ کو راضی کر لیا ہے تو جنت میں جانا ہمارے لئے ممکن ہو گا ورنہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رضا اور خوشنودی کا وسیلہ ہمارے اعمال صالحہ ہیں۔ نہ کہ قبروں کی چادر اور چڑھاوے کا مرغا۔

تیسرا وسیلہ: زندہ بزرگوں کی دعا:

آپ کسی پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہوں تو آپ کسی نیک بزرگ اور صالح آدمی سے دعا کی درخواست کر سکتے ہیں وہ آپ کی موجودگی میں یا تنہائی میں آپ کے لئے دعا کر سکتا ہے۔۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اگر قحط پڑتا تو آپ خود اللہ سے بارش کی دعا کرتے اور بارش ہوتی اور جب آپ کی وفات ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عہد میں قحط پڑنے پر نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو محترم اور بزرگ جان کر آگے کرتے اور ان سے دعا کی درخواست کرتے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ حدیث کے راوی ہیں۔

’’إن عُمرَ بنَ الخطاب رَضِی اللہ عنہ کَانَ إذَا قُحِطُوا إسْتَسْقیٰ بِالعَباسِ بنِ عَبدِ المُطلِب رَضِی اللہ عنہ فَقَال اَللّٰھم إنّا کُنَّا نَتَوَسَّلُ إلیکَ بِنَبِیِّنَا ﷺ فَتَسْقِینَا وَ إنا نَتَوَسَّلُ إلَیکَ بِعَمِ نَبِینَا فَاسقِنا قَالَ فَیُسْقَون‘‘ (صحیح بخاری، استسقاء/ ۱۰۱۰)

بیشک عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب لوگ قحط سالی میں مبتلا

ہوتے تو حضرت عمرؓ عباسؓ بن عبدالمطلب کے ذریعہ اللہ سے پانی مانگتے اور یوں کہتے: اے اللہ ہم اپنے نبی ﷺ کے ذریعہ تیرا وسیلہ پکڑتے تھے اور تو ہمیں سیراب کرتا تھا اب (نبی ﷺ نہیں رہے) تو ہم اپنے نبی کے چچا کے ذریعہ تیرا وسیلہ پکڑتے ہیں لہٰذا تو ہمیں سیراب کر۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں لوگ سیراب کیئے جاتے تھے۔

حدیث مذکور سے بہت ساری باتیں ثابت ہورہی ہیں۔

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے استسقاء کیلئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو آگے کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زندہ بزرگوں سے استسقاء کیلئے دعا کرائی جاسکتی ہے۔

(۲) زندہ بزرگوں کا وسیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

(۳) مردہ کا وسیلہ جائز نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو نبی ﷺ سے بڑھ کر کون بزرگ ہوسکتا ہے۔ آپ کی قبر شریف وہیں مدینہ مین موجود تھی لیکن حضرت عمرؓ نے آپ کا وسیلہ نہیں اختیار کیا آپ کو چھوڑ کر آپ کے چچا کا وسیلہ اختیار کیا اور تمام صحابہ کرام نے آپ کے فعل سے اتفاق کیا، کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زندہ کا وسیلہ اختیار کیا جائے گا۔ مردہ کا وسیلہ جائز نہیں ہے۔

آپ کے اطمینان کیلئے ہم ایک ایسی حدیث آپ کو سنا رہے ہیں جس سے آپ کو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ وسیلہ زندہ ہی کا اختیار کیا جاسکتا ہے نہ کہ مردہ کا۔

حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی ہیں وہ غزوہ اوطاس کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ روایت صحیح بخاری کی ہے۔

کہتے ہیں کہ حنین کی جنگ میں شکست کے بعد کفار وادی اوطاس میں جمع ہوئے۔ نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے (میرے چچا) ابوعامر اشعری کی کمان

میں اوطاس کی طرف لشکر بھیجا۔ اس میں بھی اللہ نے ہم کو فتح دی اور دشمن کو شکست ہوئی۔ لیکن دوران جنگ جشمی نے ایک تیر چلا کر میرے چچا ابو عامر کو مارا اور وہ تیر آ کر ابو عامر کے گھٹنے میں پیوست ہو گیا۔ (پتہ چلا تو) میں بھاگا ہوا ابو عامر کے پاس پہنچا اور میں نے پوچھا چچا جی بتائیے تو کس نے تیر مارا ہے؟ انھوں نے اشارہ کر کے ابو موسیٰؓ کو بتایا کہ وہ میرا قاتل ہے۔ ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں میں نے اس کا رخ کیا جب میں پہنچ گیا اور اس نے دیکھ لیا تو بھاگنے لگا، میں نے دوڑایا اور للکارا کہ بے شرم کہیں کا بھاگتا کیا ہے؟ رکتا کیوں نہیں؟ اس کو غیرت آئی رک گیا۔ ایک دو وار ہوا۔ آخر میں نے اس کو مار ڈالا۔ اور واپس آ کر میں نے ابو عامر کو خوشخبری دی کہ اللہ نے آپ کے دشمن کو مار دیا۔ ابو عامرؓ نے کہا: اچھا اب میرے گھٹنے سے یہ تیر نکالو، میں نے کھینچ کر تیر نکالا تو گھٹنے کا پانی بہہ گیا۔ (ابو عامر سمجھ گئے کہ اب میں نہیں بچوں گا) اس لئے ابو عامر نے کہا: میرے بھتیجے: نبی کریم ﷺ کو جا کر میرا سلام کہو اور آپ سے کہو کہ میرے لئے دعاء مغفرت کریں گے۔ ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں یہ کہا اور مجھکو اپنا جانشین بنایا اور تھوڑی دیر میں روح پرواز کر گئی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں واپسی پر رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا آپ ایک ننگی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور بادھ کے نشانات آپ کی پیٹھ اور پہلو پر پڑے ہوئے تھے، میں نے آپ کو پورا واقعہ سنایا اور آپ کو یہ بھی بتایا کہ ابو عامر نے آپ سے دعاء استغفار کی درخواست کی ہے۔ آپ نے فوراً پانی منگایا وضوء کیا اور دونوں ہاتھ دعا کیلئے اٹھائے اور فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعُبَيْدٍ أَبِي عَامِرٍ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَوْقَ كَثِيرٍ مِنْ خَلْقِكَ وَمِنَ النَّاسِ"

اے اللہ! عُبید ابو عامر کی مغفرت فرما، اور اے اللہ ان کو قیامت کے دن

بہت سارے لوگوں پر فوقیت دے۔ ابوموسی اشعری کہتے ہیں کہ آپ نے دعا میں ہاتھ اتنی اوپر اٹھائے کہ آپ کی بغل کی سفیدی میں نے دیکھ لی۔ مزید کہتے ہیں کہ جب آپ نے ابوعامر کیلئے دعا کی تو میں نے بھی درخواست کی اللہ کے رسول: میرے لئے بھی دعاء مغفرت فرمادیں۔ چنانچہ آپ نے میرے لئے بھی دعا کی اور فرمایا: ''اَللّٰھُم اغْفِرْ بِعَبدِ اللّٰہِ بنِ قَیسٍ ذَنْبَہٗ وَ أَدْخِلْہ یَومَ القِیَامَۃِ مُدْخَلاً کَرِیماً'' اے اللہ تو عبداللہ بن قیس (ابوموسی کا نام ہے) کے گناہوں کو معاف فرما اور قیامت کے دن ان کو عزت کی جگہ میں داخل فرما۔ ابوہریرہ (جو حدیث کے راوی ہیں) کہتے ہیں آپ نے دو دعا کی ایک ابوعامر کیلئے اور ایک ابوموسی کیلئے۔

(صحیح بخاری، مغازی، باب غزوۃ اوطاس/۴۳۲۳)

حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کے حسن انتظام، آپ کی سادگی اور زہد کا پتہ چلتا ہے، صحابہ کرام کی شجاعت و بہادری اور صبر وضبط کا پتہ چلتا ہے اور وضاحت کے ساتھ موضوع کا اثبات بھی ہو رہا ہے یعنی حضرت ابوعامر اور حضرت ابوموسی رضی اللہ عنہما کی درخواست دعاء مغفرت پر آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعاء فرمائی مذکورہ حدیث سے آپ نے یہ بھی جانا کہ صحابۂ کرام رسول اللہ ﷺ سے آپ کی حیات طیبہ میں دعا کی درخواست کرتے تھے اور آپ ان کی درخواست قبول فرما کر دعا کرتے بھی تھے۔

اب آپ کو ایک ایسی حدیث سناتے ہیں جس سے آپ جان سکیں گے کہ نبی کریم ﷺ اپنے اصحاب سے اپنے لئے بھی دعا کی درخواست کرتے تھے۔

غزوہ حنین سے فرصت پانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اللہ کے رسول زمانہ جاھلیت میں مَیں نے ایک رات کا اعتکاف کرنیکی نذر مانی تھی اور وہ نذر ابھی میرے ذمہ باقی ہے اگر آپ کی اجازت ہو

تو میں وہ نذر پوری کرلوں۔آپ نے ان کو نذر پوری کرنے کا حکم دیا اور فرمایا:"أيْ أخَيَّ أشْرِكْنَا فِي دُعَائِكَ وَلَا تَنْسَنَا" (جامع ترمذی،دعوات/٣٧٩٧) میرے بھائی اپنی دعا میں ہم کو بھی شریک کرنا دیکھو بھولنا مت۔

سنا آپ نے! خود نبی کریم ﷺ بھی اپنے صحابی سے جو بہر حال مرتبہ میں آپ سے کم ہیں مگر اس کے باوجود آپ ان سے دعا کی درخواست کررہے ہیں اور تاکید کررہے ہیں کہ دیکھو بھولنا مت۔مذکورہ تینوں حدیثوں میں زندہ سے دعا کرنیکی درخواست کی جارہی ہے، نہ کہ کسی مردہ سے۔معلوم ہوا کہ زندہ بزرگوں کا وسیلہ پکڑنا درست اور جائز ہے۔

لیکن ہمارے سماج اور معاشرے میں مردوں کا وسیلہ پکڑنا اور ان کو خوش کرنے کیلئے ان کی قبروں پر چادر چڑھانا ان کے نام پر نذرو نیاز کرنا مرغا کاٹنا عام بات ہے۔اوران تمام اعمال میں یہ عقیدہ کام کرتا ہے کہ مردہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں ہماری باتیں سنتے ہیں۔جبکہ یہ عقیدہ رکھنا کہ مردے سنتے ہیں کتاب وسنت کی صریح خلاف ورزی ہے، اگر عام ولیوں اور بزرگوں کو محض اس عقیدے کی بنیاد پر وسیلہ بنانا جائز ہوتا کہ وہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ہماری دعاؤں کو سنتے ہیں تو سب سے زیادہ یہ حق نبی کریم ﷺ کو پہنچتا ہے لیکن صحیح بخاری کے حوالے سے ایک حدیث آپ کو سنائی گئی کہ صحابۂ کرام اور صحابۂ کرام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو مزاج نبوت سے کافی حد تک میل کھاتے تھے نبی کریم ﷺ کی قبر شریف کو مرکز توجہ نہیں بنایا بلکہ آپ کے چچا حضرت عباس کو دعاء کیلئے وسیلہ بنایا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک یہ اجماعی مسئلہ تھا کہ مردے سنا نہیں کرتے اس لئے ان سے استغاثہ اور فریاد نہیں کی جاسکتی۔

تھوڑی توجہ اور دیں:

لیکن بہت سارے مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مردے زندوں کی طرح سنتے ہیں، نفع ونقصان کے مالک ہیں پکارنے والوں کی پکار سنتے ہیں اور ان کی دستگیری کرتے ہیں۔ بلکہ بعض کا تو یہاں تک عقیدہ ہے کہ جب یہ اولیاء زندہ تھے تو دنیاوی امور کے ساتھ مقید ہونے کی وجہ سے عاجز اور بے بس تھے مرنے کے بعد آزاد ہو جاتے ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کائناتی امور میں تصرف کی قدرت رکھتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد اولیاء بھی کائناتی امور میں تصرف کا اختیار رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر طرح کی قدرت دے رکھا ہے وہ جس طرح چاہیں کائنات میں تصرف کر سکتے ہیں، ان کو غوث، قطب اور ابدال وغیرہ کے القاب سے پکارا جاتا ہے۔ شرک کی اس دلدل میں عوام تو عوام اچھے خاصے علماء بھی پھنسے ہوئے ہیں۔

حالانکہ استمداد کے مسئلہ میں اگر تھوڑی سی توجہ دی جائے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ زندوں سے بھی انھیں امور میں مدد طلب کی جاسکتی ہے جن کی اللہ نے انھیں قدرت دے رکھی ہو اور ایسے امور جن کا تعلق اللہ سے ہو ان امور میں کوئی زندہ آدمی بھی مدد نہیں کر سکتا چاہے وہ جتنا بڑا ولی اور پیر ہو۔ مثلاً کسی کی ہدایت، شفا، بیماری، روزی، اور فراخی یہ ایسے امور ہیں جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں، ان میں سے کوئی چیز کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر اللہ چاہے گا تو کسی کو ہدایت حاصل ہوگی اسی طرح اگر اللہ چاہے گا تو کسی کو کشادگی اور فراخی حاصل ہوگی ورنہ نہیں۔

شاید آپ جانتے ہوں گے اگر نہ جانتے ہوں تو سن لیجئے نبی کریم ﷺ کے چچا ابو طالب آپ پر نہایت مہربان اور شفیق تھے، لیکن مشرک تھے اس لئے آپ کی دلی

خواہش تھی کہ ابو طالب کلمہ پڑھ لیں آپ نے یہاں تک ان سے کہا: آپ صرف کلمہ پڑھ لیں میں اللہ کے یہاں لڑ جھگڑ کر آپ کی بخشش کرا لوں گا۔

"يَا عَمِّ قُلْ لاالٰهَ إلا الله كلمةً أُحَاجُ لَكَ بِها عِندَ الله"

چچا صرف ایک بار کلمہ لاالہ الا اللہ" کہہ دیں، میں آپ کے لئے اللہ کے یہاں لڑ جھگڑ لوں گا۔ (صحيح بخاری، تفسير/ ٤٧٧٢)

آپ نے اپنے چچا کے ایمان کیلئے بھرپور کوشش کی لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا ایمان نہیں لا سکے، اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرما کر مسئلہ صاف کر دیا۔

ارشاد ہوا: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (القصص:٥٦)

یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ جسے چاہیں ہدایت دیدیں ہاں اللہ جسے چاہے ہدایت دے سکتا ہے کون ہدایت یاب ہوسکتا ہے اسے اللہ جانتا ہے۔

کتنی صاف ستھری بات قرآن پاک میں بتائی گئی ہے کون ھدایت کا مستحق ہے اور کون گمراہی کا مستحق ہے؟ اس کا علم اللہ کو ہے اس لئے کہ ھدایت اور گمراہی کا اختیار اللہ کے پاس ہے آپ ﷺ کو بھی اس میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور جب آپ کو اختیار نہیں ہے تو پھر کسی پیر فقیر اور مردے کو کیسے اختیار ہوسکتا ہے؟

نبی ﷺ کو بھی نفع نقصان کا اختیار نہیں

(۱) ﴿قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعاً وَلَا ضَرّاً إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾

(اعراف:١٨٨)

اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ میں اپنے لئے کسی نفع اور نقصان کی طاقت نہیں

رکھتا مگر جو اللہ چاہے۔

(۲) ﴿قُلْ إِنِّیْ لَا أَمْلِکُ لَکُمْ ضَرّاً وَلَا رَشَداً﴾ (سورہ جن:۲۱)

اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے کسی نقصان اور ھدایت کا اختیار نہیں رکھتا۔

(۳) ﴿قُل لَّا أَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرّاً وَلَا نَفْعاً إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ﴾

(یونس:۴۹)

اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ میں اپنے نفس کیلئے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے۔

تینوں آیتوں سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ نفع اور نقصان کا اختیار آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ نہ اپنی ذات کیلئے نہ اپنی امت کیلئے۔ جب آپ کو اپنے لئے اختیار نہیں ہے تو پھر اور کسی کیلئے بدرجہ اولیٰ نفع اور نقصان کا اختیار نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف اللہ کے لئے خاص ہے۔

اس بحث سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی میں جو بھی صلاحیت، قدرت اور طاقت عطا کی ہے وہ مرنے کے بعد سب ختم ہو جاتی ہے نہ وہ بولنے پر قادر ہے نہ سننے پر قادر ہے نہ چلنے اور پکڑنے پر قادر ہے۔، اور جب کسی چیز پر وہ قادر نہیں ہے تو کسی کے نفع و نقصان پر بھی قادر نہیں ہے قدرت موت کے بعد ہر انسان سے سلب کر لی جاتی ہے اس میں انبیاء، اولیاء سب برابر کے شریک ہیں اگر کسی کو اب بھی نہ سمجھ میں آئے تو کسی مردے کو وہ بلا کر دیکھ لے، سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں یا نہیں؟ پتہ چل جائیگا۔ لیجئے اب میں قرآن پاک سے ایسی چند آیتیں سناتا ہوں اور ترجمہ کر دیتا ہوں جس سے آپ کو پتہ چل جائیگا کہ مردے نہیں سن سکتے۔ ایک مسلمان کیلئے قرآن سے بڑھ کر دوسری کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔

(۱) ''وَمَا أنتَ بِمُسمِعٍ منْ فِي القُبُور'' تم ان لوگوں کونہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔

(۲) ﴿فَإِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ﴾ (روم/۵۲)

اے نبی تم مردوں کونہیں سنا سکتے نہ ان بہروں کو سنا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں۔

دونوں آیتیں مردوں کے عدم سماع کی واضح دلیل ہیں

(۳) ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُواْ لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِيْنَ، أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا﴾

(الاعراف:۱۹۴،۱۹۵)

ترجمہ: بیشک اللہ کو چھوڑ کر جنھیں تم پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح کے بندے ہیں، ان کو پکار کر دیکھو تمھاری پکار کا جواب دیتے ہیں؟ اگر تم اپنی بات میں سچے ہو۔ کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں جس سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں جس سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھ رکھتے ہیں جس سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں جس سے سنیں؟ (ظاہر ہے مردوں کے پاس ان میں سے کچھ نہیں ہے)

(۴) ﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ، قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَاماً فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِيْنَ، قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ، أَوْ يَنفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ، قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَ نَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ (الشعراء:۷۰-۷۴)

ترجمہ: یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ کن چیزوں

کی تم پوجا کرتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا چند بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور ہم انھیں پر جمے رہیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا: کیا جب تم انھیں پکارتے ہو تو وہ تمھاری پکار سنتے ہیں؟ اور کیا یہ تمھیں نفع اور نقصان پہونچاتے ہیں؟ (انھوں نے جواب دیا نہیں) بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔

یہ چار آیتیں آپ کو سنائی گئی ہیں جن سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ مردے سنتے نہیں ہیں۔

قائلین سماع کے دلائل کا جائزہ:

جو لوگ سماع کے قائل ہیں ان کے دلائل اور ان کا جواب سماعت فرمائیں:

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بدر کے دن حکم دیا کہ جنگ میں قریش کے جو چوبیس سردار مارے گئے ہیں ان کو ایک گندے اور ناپاک کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ آپ کا یہ معمول تھا کہ جب کسی قوم پر فتح پاتے تو وہاں میدان میں تین دن قیام فرماتے۔ اس لئے بدر کے میدان میں جب تیسرا دن ہوا تو آپ نے حکم دیا کہ سواری تیار کی جائے چنانچہ تیار کی گئی اس کے بعد آپ وہاں سے چل کر کنوئیں کی منڈیر کے پاس آئے اور آپ کے صحابہ بھی پیچھے پیچھے آئے، صحابہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ اپنی کسی ضرورت سے جا رہے ہیں لیکن آپ کنوئیں کی منڈیر پر کھڑے ہو گئے اور کنوئیں میں پھینکے ہوئے سرداروں اور انکے باپ دادا کے نام لے لے کر فرمانے لگے: اے فلاں ابن فلاں اب تمھیں اچھا لگ رہا ہوگا کہ تم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ اس لئے کہ ہمارے رب نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ ہم نے برحق پالیا۔ کیا تم نے بھی اپنے رب کا وعدہ برحق پایا؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سن کر کہا: اللہ کے رسول آپ ایسے لوگوں سے بات کرر ہے ہیں جو زندہ نہیں ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس وقت میری بات جتنا وہ سن رہے ہیں اتنا تم نہیں سن رہے ہو، راوی حدیث حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ ان کو ذلیل و رسوا کرنے اور حسرت وافسوس کیلئے اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ کر کے سنادیا تھا۔

(صحیح بخاری، مغازی ۶/ ۳۹۷)

آپ نے حدیث کا ترجمہ سن لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سوال کرنا بتا رہا ہے کہ ان کے نزدیک معروف بات یہی تھی کہ مردے نہیں سنا کرتے اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ ان کو یہ علم اللہ کے رسول ہی سے حاصل ہوا ہوگا۔ علم کا کوئی دوسرا ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا، پھر صحیح بخاری ہی کی دوسری روایت کا یہ لفظ ''انهم الآن يسمعون ما اقول'' اس وقت میں جو کہہ رہا ہوں اس کو وہ سن رہے ہیں۔ بتا رہا ہے کہ اس وقت وہ سن رہے تھے عام اوقات میں نہیں سنتے ہیں۔ اس معنی کی تائید حضرت قتادہ کی توجیہ سے بھی ہورہی ہے۔ ''قال قتادة احياهم الله حتى أسمعهم قوله'' یعنی اللہ نے انھیں زندہ کردیا تھا اور آپ کی بات ان کو سنادیا تھا۔

سماع موتیٰ کا مسئلہ آئینہ کی طرح صاف ہے یعنی مردے سنا نہیں کرتے اللہ تعالیٰ نے قریش کے ان سرداروں کو خصوصیت سے زندہ کردیا تھا اوران کی ذلت و رسوائی اور حسرت وافسوس میں اضافہ کرنے کیلئے وقتی طور سے اللہ نے سنادیا تھا۔ خود سننے کی ان کے اندر طاقت نہیں ہے۔

پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ مردے خود نہیں سنتے ہیں، عام انسان ہوں یا اولیاء، صلحاء اور انبیاء ورسل ہوں اور نہ کوئی انھیں سنا سکتا ہے۔ ہاں اللہ اگر چاہے تو وہ

سنا سکتا ہے یہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اور جب مردے سنتے نہیں ہیں تو ان کو پکارنا، مدد طلب کرنا، استغاثہ اور فریاد کرنا کتاب وسنت کی تعلیم کے خلاف ہے بلکہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک ہے اس کی دو وجہ ہے۔

ایک تو یہ کہ سارے امور عبادت کے اندر داخل ہیں اور عبادت اللہ کے علاوہ کسی کیلئے جائز نہیں ہے اگر کوئی شخص عبادت کا کوئی کام اللہ کے علاوہ دوسروں کیلئے انجام دیتا ہے تو وہ اللہ کی الوہیت میں دوسروں کو شریک کرتا ہے اور یہ شرک اکبر ہے۔ مشرکین مکہ کا شرک اسی قسم کا تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت کے خلاف ہر کسی کی پکار اور آواز کو سننا یہ صرف اللہ کی صفت ہے اب اگر آپ یہی صفت کسی مردہ پیر اور فقیر میں تسلیم کریں کہ ہم کہیں سے بھی پکاریں ہمارے تاج والے بابا ہماری پکار سنتے ہیں تو گویا آپنے صفت سماع میں اپنے تاج والے بابا کو اللہ کا شریک کر دیا یہ بھی کھلا ہوا شرک ہے۔ اللہ پاک قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے "لیس کمثله شيئ، وهو السميع البصير" اللہ کے مثل کوئی چیز نہیں ہے وہ سننے دیکھنے والا ہے۔ لہذا اس کا سننا اور دیکھنا بھی بے مثل ہے۔ اس میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔

برزخی زندگی:

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو شہداء کو قرآن پاک میں زندہ کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد زندگی باقی رہتی ہے۔ عرض ہے کہ یہ برزخی زندگی کا معاملہ ہے اور ہماری گفتگو دنیا کی زندگی سے متعلق تھی یعنی مرنے کے بعد کسی بھی شخص کو قبر میں دنیا کی زندگی نہیں حاصل ہوسکتی۔ ہاں برزخی زندگی حاصل ہوتی ہے ہم اس کا انکار

نہیں کرتے، اس سلسلہ میں ہم شیخ الحدیث علامہ عبید اللہ صاحب رحمانی صاحب مرعاۃ المفاتیح رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مختصر مگر جامع تحریر پیش کر رہے ہیں غور سے پڑھیں اور عقیدے کی اصلاح کریں۔ حیات برزخی کی نوعیت اور کیفیت کا ہم کو علم نہیں۔

''احادیث معتبرہ وقرآن سے ثابت ہے کہ حیات تین قسم کی ہے، ایک دنیاوی دوسری برزخی تیسری اخروی۔ سب سے اقویٰ حیات اخروی ہے۔ قرآن کریم میں شہداء پر میت کا اطلاق کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ان پر ''حی'' ہونے کا حکم لگایا گیا ہے اور یہ حیات برزخی ہے جس کی نوعیت اور کیفیت کا ہم کو علم نہیں ہے اور یہ حیات برزخی تمام مرنے والوں کے لئے ثابت ہے، جن میں انبیاء شہداء، عام مومنین، پھر کافر منافق، فاسق، فاجر سبھی داخل ہیں۔ حیات برزخی انبیاء کی شہداء سے اقویٰ اور شہداء کی حیات برزخی عام مومنین سے اقویٰ ہے۔

حیات برزخی اور حیات اخروی دونوں ہماری نظروں اور شعور واحساس سے غائب اور غیر معلوم اور غیر مدرک اور غیر محسوس ہیں۔ حیات اخروی قیامت کے قائم ہونے کے بعد محقق ہوگی، حیات برزخی کو حیات اخروی پر قیاس کرنا اور اس کے لئے حیات اخروی کے احکام ثابت کرنا قیاس غائب علی الغائب ہے اور یہ جہل قبیح ہے۔ اسی طرح حیات برزخی کو حیات دنیوی پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے یہ قیاس غائب علی الحاضر ہے اور یہ بھی جہل ہے۔ برزخ میں روح مع ذرات الجسم راحت یا تکلیف محسوس کرتی ہے، اسی کا دوسرا نام عذاب قبر ہے اور راحت فی القبر ہے''۔

(شیخ الحدیث علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ ماخوذ از مکاتیب رحمانی)

☆☆☆

جذبۂ اطاعت

نکات:

(۱) کتاب وسنت مقدم اجتہاد موخر۔

(۲) فوراً اطاعت۔

(۳) احتساب نفس۔

(۴) سنت کی پابندی۔

کتاب وسنت مقدم اجتہاد موخر

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ (الحجرات:۱۔۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! تم اپنی آواز نبی کی آواز کے اوپر نہ کرو اور نہ ان سے اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو (کہیں ایسا نہ ہو کہ) تمھارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

سورہ حجرات کی دو آیتیں آپ کو سنائی گئی ہیں۔ پہلی آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کی

تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے مسند احمد، ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ کے حوالے سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے اسے سماعت فرمائیں۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ جب یمن بھیج رہے تھے تو آپ نے ان سے پوچھا! معاذ تم کیسے فیصلہ کروگے؟ انھوں نے کہا: اللہ کی کتاب (قرآن پاک) سے۔ آپ نے پوچھا: اچھا اگر قرآن پاک میں نہ پاؤ تب؟ انھوں نے کہا: پھر رسول اللہ ﷺ کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے پھر پوچھا! اگر اس میں بھی نہ پاؤ تب؟ معاذ بن جبل نے کہا: اجتہاد کروں گا۔ (یہ جواب سنکر) رسول اللہ ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا (شاباشی دی) اور فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اللہ کے رسول (ﷺ) کے قاصد کو اس کی توفیق دی جو اللہ کے رسول کی مرضی کے مطابق ہے۔

معاذ بن جبل نے نبی کریم ﷺ کو جو جواب دیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے میں کتاب وسنت میں تلاش کروں گا اگر دونوں میں وہ حکم نہیں ملا تو میں رائے، قیاس اور اجتہاد سے کام لوں گا۔ گویا انھوں نے یہ کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مقدم اور میری رای مؤخر۔ اور اگر اسی کو الٹ دیا جائے، اجتہاد اور قیاس کو مقدم اور کتاب وسنت کو مؤخر کر دیا جائے تو یہی اللہ اور اسکے رسول سے آگے بڑھنا ہے اور اسی سے آیت کریمہ میں منع کیا جارہا ہے۔

آیت کریمہ سے یہ معلوم ہوا کہ دین کے معاملہ میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کیا جائیگا اگر کوئی مسئلہ تلاش کے باوجود قرآن وحدیث میں نہیں ملا تو قیاس کی گنجائش ہے لیکن صاف اور صریح آیات اور احادیث کے ہوتے ہوئے اپنی یا اپنے امام کی رائے اور بات پر اڑے رہنا۔ خود کو یا اپنے امام کو اللہ اور اسکے رسول سے آگے کرنا ہے۔ آیت کریمہ میں اسی سے منع کیا جارہا ہے۔

فوراً اطاعت!

دوسری آیت کریمہ میں صحابۂ کرام کو آداب مجلس کی تعلیم دی جارہی ہے۔ صحابۂ کرام کو حکم دیا جارہا ہے کہ جب تم نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ہوتے ہوتو نبی کی تعظیم، تکریم اور ان کے احترام کا تقاضا ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے بات کرو یا نبی ﷺ سے بات کرو، کسی حال میں تمہاری آواز نبی کی آواز سے اونچی نہ ہونے پائے اگر اس پر عمل نہیں کرو گے تو اس بات کا امکان ہے کہ تمہارے سارے اعمال اور ساری نیکیاں اکارت اور برباد ہو جائیں اور تمھیں احساس بھی نہ ہو۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مومنوں کی ہر مجلس میں ادب کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ کوئی ایسی مجلس جس میں علماء ہوں، اساتذہ ہوں، والدین ہوں یا گھر اور محلّہ کے بڑے اور بزرگ ہوں تو خاص طور سے ان کی موجودگی میں شور، ہنگامہ، بے تکلف انداز گفتگو نہیں ہونا چاہیئے۔ بڑوں کے مراتب اور آداب مجلس کا یہی تقاضا ہے۔

اس آیت کریمہ سے جہاں آداب مجلس کا درس ملتا ہے وہیں ہمیں ایک اور اہم درس ملتا ہے وہ ہے کتاب وسنت کی اتباع اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے سورہ حجرات کی اس آیت کریمہ کی تفسیر میں دو حدیثیں نقل فرمائی ہیں اور دونوں ہی حدیثیں اللہ اور اس کے رسول کا حکم سننے کے بعد فوری اطاعت پر دلالت کرتی ہیں۔ حدیث سماعت فرمائیں۔

عبداللہ بن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس قبیلہ بنوتمیم کا ایک وفد آیا۔ انکی امارت اور سرداری کی بات آئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو مشورہ دیا کہ قعقاع بن معبد کو ان کا امیر بنا دیجئے اور حضرت عمر رضی

اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ اقرع بن حابس کو امیر بنایئے۔ اختلاف رائ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ سے کہا: تم میری مخالفت کرنا چاہتے ہو حضرت عمرؓ نے کہا: میرا مقصد آپ کی مخالفت نہیں ہے (یہی میری رائ ہے) اس کہا سنی میں دونوں کی آواز اونچی ہوگئی تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ کا حال ایسا ہوگیا کہ وہ جب رسول اللہ ﷺ سے کوئی بات کہتے تو اتنی آہستہ سے کہتے کہ رسول اللہ ﷺ نہیں سن پاتے یہاں تک کہ آپ کو دوبارہ پوچھنا پڑتا کہ کیا کہتے ہو۔　(صحیح بخاری تفسیر سورہ حجرات)

دوسری روایت بھی سماعت فرمالیں۔ موسیٰ بن انس اپنے والد حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے خطیب حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ آپ کی مجلس سے غائب رہنے لگے جب آپ نے انھیں نہیں دیکھا تو ان کے بارے میں پوچھا۔ سعد بن معاذؓ نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ میں پتہ کر کے بتا تا ہوں کہ کیوں نہیں آرہے ہیں۔ وہ صحابی پتہ کرنے کے لئے ان کے گھر گئے۔ ملا قات ہوئی تو دیکھا کہ وہ اپنے گھر میں سر جھکائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پوچھا کیا حال ہے؟ (آپ کیوں اس طرح بیٹھے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں نہیں آتے) انھوں نے کہا: بہت برا حال ہے۔ (میری آواز اونچی ہے) اس لئے میری آواز ہمیشہ آپ کی آواز پر اونچی رہا کرتی تھی۔ میرا تو سارا عمل برباد ہوگیا اور میں جہنمی ہوگیا۔ سعدؓ بن معاذ وہاں سے واپس آئے اور رسول اللہ ﷺ کو ساری بات بتادی، موسیٰ بن انس کہتے ہیں دوبارہ سعدؓ بن معاذ ان کے پاس ایک بہت بڑی خوشخبری لیکر واپس گئے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: جاؤ ان سے کہہ دو: تم جہنمی نہیں بلکہ جنتی ہو۔

(صحیح بخاری تفسیر سورہ حجرات)

سنا آپ نے! آیت نازل ہوتے ہی حضرت عمر اور ثابت بن قیس رضی اللہ عنہما نے عمل شروع کر دیا۔ جذبۂ اطاعت اسی کا نام ہے۔ ہر مجلس کے کچھ آداب ہوتے ہیں ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، بڑوں کی مجلس ہو تو خاص طور سے ان کی عزت اور تکریم کا خیال رکھنا چاہئے۔

احتساب نفس

آپ نے دونوں حدیثوں سے یہ اندازہ کر لیا کہ حضرت عمر اور حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہما نے آیت کریمہ کے نزول پر فوراً عمل کیا، آج دینی اجتماعات میں، جلسوں اور جمعہ کے خطبوں میں علماء کرام معاشرے کے اندر پائی جانے والی برائیوں اور کمزوریوں کی نشاندھی کرتے ہیں۔ کتاب وسنت کی روشنی میں ان کی اصلاح کرتے ہیں، لیکن تقریروں اور خطبوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ جو لوگ جلسوں کے منتظمین ہوتے ہیں ان کے اندر بھی عملاً کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد جو چیز سننے میں آئیگی وہ یہ کہ فلاں مولانا کی تقریر بہت جمی اور فلاں کی نہیں جمی۔ اس سے زیادہ اور کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ جلسہ کے اخراجات ہوتے ہیں۔ انتظامات کی پریشانیاں اور دقتیں ہوتی ہیں۔ علماء سفر کر کے تشریف لاتے ہیں، ساری کاوشوں کا صرف یہ نتیجہ کہ جلسہ کامیاب رہا یا کامیاب نہیں رہا۔ سنتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔ علماء کرام کے مواعظ حسنہ کو سن کر اطاعت وفرمانبرداری کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے اور اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہئے کہ ہماری زندگی کیسی گزر رہی ہے، ہمارے قول وفعل میں مطابقت پائی جارہی ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے قول وفعل میں تضاد ہے۔ لیجئے ایک حدیث سنئے اور اندازہ کیجئے کہ صحابہ کرام سمع وطاعت اور ایمان وعمل

کے انتہائی اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود ہمہ وقت اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہتے تھے۔ حدیث کا مفہوم پیش کیا جارہا ہے۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے کاتبین وحی میں سے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے پوچھا حنظلہ کیسے ہو؟ میں نے کہا (کیا بتاؤں) حنظلہ تو منافق ہوگیا ہے، ابوبکرؓ نے تعجب سے کہا سبحان اللہ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا: دیکھئے بات یہ ہے کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ہوتے ہیں اور آپ ہم سے جنت وجہنم کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اور جب ہم آپ کے پاس سے نکل جاتے ہیں اور اپنے بال بچوں اور کھیتی باڑی میں مشغول ہو جاتے ہیں تو بہت ساری باتیں بھول جاتے ہیں (اسی تبدیلی کا نام نفاق ہے) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم ایسی کیفیت تو ہم بھی پاتے ہیں (گویا میں بھی نفاق میں مبتلا ہوں)

حضرت حنظلہؓ کہتے ہیں کہ میں اور ابوبکر دونوں چلے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے، میں نے کہا: نَافَقَ حَنظَلَةُ يَا رَسُولَ اللهِ: فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَمَا ذَاكَ؟ اللہ کے رسول حنظلہ تو منافق ہوگیا ہے آپ نے فرمایا: بات کیا ہے؟ میں نے کہا: اللہ کے رسول ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ جنت وجہنم کا ذکر فرماتے ہیں تو اس وقت ہمارے دل کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے ہم جنت وجہنم کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب نکل کر چلے جاتے ہیں اور بیوی بچوں میں، کھیتی باڑی میں، مشغول ہو جاتے ہیں تو بہت ساری باتیں بھول جاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم ہمیشہ اسی حالت میں رہو جس میں تم میرے پاس ہوتے ہو اور ہر وقت اللہ کی یاد میں لگے رہو تو فرشتے

تمہارے بستروں پر اور راستہ چلتے تم سے مصافحہ کریں گے۔ لیکن اے حنظلہ کبھی کبھی یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ (صحیح مسلم، توبہ)

صحابۂ کرام زہد اور ورع کے آخری درجے پر فائز تھے اس کے باوجود ہر وقت انھیں خوف لگا رہتا تھا کہ ہم سے کوئی ایسا کام صادر نہ ہو جائے جو ایمان کے منافی ہو مختلف کیفیات کا طاری ہونا انسان کی فطرت میں داخل ہے اس تغیر اور تبدیلی کا نام نفاق نہیں ہے لیکن دیکھئے کس طرح اپنے نفس کا محاسبہ کر رہے ہیں آپ جب اپنی مجلس میں وعظ و نصیحت کر رہے ہوں، جنت و جہنم کا ذکر فرما رہے ہوں اس وقت آپ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے کلمات کا جو اثر دل پر طاری ہوگا اسکی کیفیت بلاشبہ آنکھوں سے دیکھی جیسی ہوگی اور جب بیوی بچوں اور کاروبار میں مشغول ہو جائیں گے تو پہلے والی کیفیت زائل ہو جائیگی۔ اس طرح کے تغیر اور تبدیلی کا نام نفاق نہیں ہے لیکن صحابہ کرام کے زہد و ورع اور احتساب نفس کا تقاضا تھا کہ اس فطری تغیر کو نفاق سے تعبیر کریں۔ پوچھنے پر اللہ کے نبی ﷺ نے ان کی تشجیع فرما کر اس اضطرابی کیفیت کو دور فرما دیا۔

میرے بھائیو! ہم صحابۂ کرام کی خاک پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے ان کا مقام و مرتبہ اتنا اونچا ہے کہ اللہ تعالی نے قرآن میں بار بار ان کی تعریف فرمائی ہے لیکن اس کے باورجود وہ اپنے نفس کا ہمیشہ حساب لیتے رہتے تھے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ عصیان اور نافرمانی ہمارا شیوہ ہے۔ گناہوں میں ہر وقت ڈوبے رہتے ہیں نفس کا حساب لینا، گناہوں پر شرمندہ ہونا تو دور کی بات ہے ہم تو گناہ کر کے فخر کرتے ہیں، نفس کا حساب کہاں لیں گے؟

سنت کی پابندی

دین کے معاملے میں ہمیں اپنی عقل اور رای کو چھوڑنا پڑتا ہے دین کی باتیں اکثر عقل و قیاس کے خلاف پڑتی ہیں لیکن اس کے باوجود کتاب وسنت کی اتباع سے ہم چھٹکارا نہیں پاسکتے حدیث سماعت فرمائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب حجر اسود کو بوسہ لیتے تو کہتے:

"إنِّي أعلَمُ أنكَ حَجَر مَا تنفعُ وَلَا تَضُر، وَلَو لا أني رَأيتُ رَسولَ اللّٰهِ ﷺ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ" (متفق علیہ)

ترجمہ: میں جانتا ہوں کہ تم پتھر ہو، تم نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتے، اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تمھیں بوسہ دیتے ہوئے نہیں دیکھا ہوتا تو میں تمھیں بوسہ نہیں دیتا۔

اسے سنت کی پابندی کہتے ہیں۔ آپ کی عقل سلیم تسلیم کرے یا نہ کرے اگر اللہ کے رسول نے کیا ہے تو اس پر عمل کریں گے۔ منع کیا ہے تو باز رہیں گے۔

اگر آپ کسی کو سنت کے خلاف کام کرتے دیکھیں تو فوراً اسے منع کرنا چاہئے منع کرنے کے بعد بھی وہ نہیں مانتا تو اس سے قطع کلام اور ترک تعلق جائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک رشتے دار سے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ منع کرنے کے بعد بھی سنت کے خلاف کام کررہا تھا۔ صحیح بخاری کی روایت سنیں۔

عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے (اپنے ایک) آدمی کو دیکھا کہ وہ انگلیوں سے کنکری اڑا رہا ہے انھوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے کنکری پھینکنے سے اور اڑانے سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ کنکری اڑانے سے نہ شکار کیا جاسکتا اور نہ کسی دشمن کو مارا جاسکتا ہے۔ ہاں اتنا ہوگا کہ کسی کے دانت میں لگے تو

دانت ٹوٹ جائے آنکھ میں لگے تو آنکھ پھوٹ جائے۔ (منع کرنے کے بعد) پھر اسکو کنکری اڑاتے دیکھا تو عبداللہؓ بن مغفل نے کہا: میں تم کو اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث سناتا ہوں "أَنَّهُ نَهَى عَنِ الخَذْف،، اور تم مانتے نہیں۔ کنکری پھینکتے رہتے ہو۔ میں تم سے کبھی نہیں بولوں گا۔ (صحیح بخاری/ذبائح، ۵۴۷۹)

سنا آپ نے سنت کی خلاف ورزی کرنے پر ایک صحابی رسول نے اپنے ایک رشتے دار سے بولنا چھوڑ دیا اور اس سے قطع تعلق کر لیا۔ ہم ہر دن دسیوں بار خلاف ورزی خود کرتے ہیں اور دوسروں کو دیکھتے ہیں لیکن منع کرنے کی توفیق نہیں ہوتی اگر کسی نے ہمت کر کے منع کر دیا تو اس سے زبان درازی کی جائیگی اور ضد میں وہی کام پھر کیا جائیگا جس سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ہے ہمارا حال۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ سے کہا: اللہ کے رسول مجھے آپ سے ہر چیز سے زیادہ محبت ہے لیکن اپنی جان سے (گویا اپنی جان زیادہ نہیں ہے) آپ نے فرمایا: عمر "مَا أُكْمِلَتَ الإِيمَان" ابھی تمہارا ایمان مکمل نہیں ہوا۔ حضرت عمرؓ نے کہا! اگر ایسی بات ہے تو پھر اپنی جان سے بھی زیادہ۔ آپ نے فرمایا "الأن يا عمر،، اے عمر اب ایمان مکمل ہوا۔ (صحیح بخاری، أیمان ونذور)

ہم آپ کو سمجھانا یہ چاہتے ہیں کہ اتباع اور اطاعت کا جذبہ اتنا زیادہ ہونا چاہئے کہ کتاب وسنت کا حوالہ سن کر منٹوں میں دل کی کیفیت بدل جائے۔ حضرت عمر اور رسول ﷺ کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس میں کتنی دیر لگی ہوگی۔ یہ سنتے ہی کہ عمر تمھارا ایمان ابھی مکمل نہیں ہوا ان کے دل کی کیفیت بدل گئی اور اب ایمان کا یہ درجہ پیدا ہو گیا کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز اللہ کے نبی کی جان ہے، اپنی جان اللہ کے نبی کی جان پر فدا اور قربان ہے۔ جذبۂ اطاعت اس فداکاری کا نام ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کو کتاب وسنت پر چلنے اور حق کو سمجھنے کی توفیق دے۔ آمین۔

موت مومن کی نگاہ میں

نکات!

(۱) مصائب زندگی کا لازمہ ہیں۔

(۲) دعاء اور اس کا اثر۔

(۳) موت کا یقین۔

(۴) موت پر اظہار غم۔

(۵) جاہلیت کی پکار۔

(۶) غم کو چھپانا اور صبر کرنا۔

(۷) موت مومن کی نگاہ میں۔

(۸) کتنا فرق؟

(۹) تعزیت کی مجلس۔

(۱۰) تعزیتی کلمات۔

مصائب زندگی کا لازمہ ہیں:

جب تک انسان کی زندگی اور حیات باقی ہے اس وقت تک اس کو حادثات اور مصائب سے دوچار ہونا ہے، مصائب کی مختلف شکلیں اور نوعیتیں ہوتی ہیں، کبھی دشمنوں کا خوف لاحق ہوگا، کبھی غربت اور فاقہ کشی ہوگی، کبھی تجارت میں، کاروبار میں، باغات اور آراضی میں نقصان اٹھانا پڑے گا، کبھی کسی عزیز، رشتے دار، ماں اور باپ، آل اور اولاد، کی وفات ہو جائیگی۔ ایسے موقع پر آدمی کو طبعی اور فطری طور سے غم اور دکھ ہوتا ہے، اس غم کا علاج کیا ہے اور ہمیں حادثات اور مصائب کے پیش آنے پر کتاب و

سنت میں کیا تعلیم دی گئی ہے؟ اس کے بارے میں قرآن کریم کی آیات سماعت فرمائیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الأَمْوَالِ وَالأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ، الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعونَ، أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (بقرہ:۱۵۵۔۱۵۷)

ترجمہ:- اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمن کے خوف سے، بھوک سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے، اوران صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دیجئے جنہیں جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم خود اللہ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ کی برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور ایسے لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مصائب سے دوچار ہونے کے وقت مومن کی زبان سے یہ دعا نکلنی چاہیۓ ﴿انا لله و انا اليه راجعون﴾

ہم ہر دن مشاہدہ کرتے ہیں کہ دھواں، آگ، گرد وغبار اور ہماری آواز اوپر جا کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے اگر اس عقیدے پر ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ جہت فوق میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کے اوپر ہے تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر چیز اللہ کیطرف لوٹتی ہے، اسی طرح ہماری روح بھی جسم سے نکلنے کے بعد اللہ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر مملوک اپنے مالک کی طرف لوٹتا ہے ہم بھی اللہ کی مملوک اور مخلوق ہیں اس لئے ہم کو بھی اللہ کیطرف لوٹ کر جانا ہے، یہ دعا پڑھنا گویا اپنی عبدیت اور مملوکیت کا اللہ سے اعتراف کرنا ہے، جب بندہ اپنی عبدیت کا اعتراف اور اظہار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور جب خوش ہوگا تو

اپنی رحمتوں اور برکتوں کا نزول فرمائے گا۔اور بندے کا غم ہلکا ہوگا۔ یہ بات یقینی ہے۔ اسی لئے اللہ نے فوراً اپنی رحمت کا ذکر فرمایا۔

دعاء اور اس کا اثر:

حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿إنا لله وإنا إليه راجعون﴾ کے ساتھ یہ دعا بھی پڑھنی چاہئے۔''اَللّٰهُمَّ اٰجِرْنِي فِي مُصِيبَتِي وَأَخْلِفْ لِيْ خيراً مِنْهَا'' اے اللہ تو مجھ کو میری مصیبت سے پناہ دے اور اس سے بہتر بدلہ نصیب فرما۔

﴿إنا لله وإنا إليه راجعون﴾ پڑھنے کا کیا ثواب اور اس کا کیا اثر ہوتا ہے اس کے ضمن میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے مسند احمد کے حوالہ سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے جسکا مفہوم یہ ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک دن میرے شوہر ابو سلمہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے میرے پاس آئے اور کہا! آج رسول اللہ ﷺ سے میں نے ایک بات سنی ہے جس سے میری طبیعت بہت خوش ہے، کہتے ہیں:

آپ نے فرمایا! اگر کسی مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچے اور اس وقت وہ ﴿إنا لله وإنا إليه راجعون﴾ پڑھے پھر یہ دعا پڑھے''اَللّٰهُمَّ اٰجِرْنِي فِي مُصِيبَتِي وَأَخْلِفْ لِيْ خيراً مِنْهَا'' تو اس کی دعاء کے مطابق اس کا کام کر دیا جائے گا۔حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے وہ دعا یاد کر لی اور جب میرے شوہر ابو سلمہ کی وفات ہوئی تو میں نے ﴿إنا لله و إنا إليه راجعون﴾ پڑھا اور یہ دعا ''اَللّٰهُمَّ اٰجِرْنِي فِي مُصِيبَتِي وَأَخْلِفْ لِيْ خيراً مِنْهَا'' پڑھی پھر (میں نے معنی پر) غور کیا تو میں نے کہا بھلا ابو سلمہؓ سے بہتر شوہر کون ہوسکتا ہے؟ (لیکن پڑھتی رہی) جب میری عدت ختم ہوئی تو رسول اللہ ﷺ میرے گھر تشریف لائے اور اندر آنے کی

اجازت مانگی اس وقت میں ایک چمڑے کو دباغت دے رہی تھی خیر میں ہاتھ دھو کر تیار ہوئی اور آپ کو اندر آنے کی اجازت دی۔ میرے پاس چمڑے کا ایک تکیہ تھا اسی کو آپ کے لئے رکھ دیا آپ اس پر ٹیک لگا کر بیٹھے اور مجھ سے اپنی شادی کا پیغام دیا۔

جب آپ کی بات پوری ہوئی تو میں بولی! اللہ کے رسول ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ آپ پیغام دیں اور مجھے خواہش نہ ہو لیکن تین مشکل ہے۔

(۱) میں نہایت غیرت مند عورت ہوں (سوکنوں کو برداشت نہیں کر پاؤں گی) ممکن ہے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جائے جو میرے لئے عذاب کا باعث بنے۔

(۲) میں شادی کی عمر سے گذر چکی ہوں۔

(۳) میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کی کفالت کیسے ہوگی؟

نبی کریم ﷺ نے فرمایا! دیکھو! میں اللہ سے دعا کرونگا وہ تمہاری غیرت ختم کر دیگا۔ رہی عمر کی بات تو جس عمر میں تم ہو اسی عمر میں میں بھی ہوں۔ اس کے بعد رہے بچے تو سنو! تمہارے بچے میرے بچے ہیں میں کفالت کروں گا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بات مان لی اور میری شادی رسول اللہ ﷺ سے ہوگئی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بعد میں کہا کرتیں کہ اللہ تعالی نے میری دعا قبول فرمالی اور ابوسلمہ کے بدلے ان سے بہتر شوہر رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالی نے مجھے عطا فرمایا --- یہ دعا کا اثر ہے۔

دعاء کو عبادت کا مغز کہا گیا ہے اس لئے دعا کو معمولی اور حقیر جان کر اس سے غفلت نہیں برتنی چاہئے۔ اللہ تعالی دعاء سے خوش ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ نے دعاء اور دعاء کے آداب بیان فرمائے ہیں اس لئے مصائب کے وقت میں اخلاص کے ساتھ اللہ سے دعا کرنی چاہئے اللہ تعالیٰ بڑا سننے والا اور بڑا دینے والا ہے۔

موت کا یقین:

دنیا کے اندر جتنے حوادث پائے جاتے ہیں سب میں ہونے نہ ہونے کا امکان پایا جاتا ہے مثلاً بارش ہو بھی سکتی ہے نہیں بھی ہو سکتی، آندھی آ بھی سکتی ہے نہیں بھی آسکتی ہے، فصل اچھی بھی ہو سکتی ہے خراب بھی ہو سکتی ہے، آپ کی تجارت کامیاب بھی ہو سکتی اور ناکام بھی ہو سکتی ہے، آپ کی صحت اچھی بھی ہو سکتی ہے نہیں بھی ہو سکتی، غرض آپ جدھر نظر اٹھائیں آپ کو ہر چیز میں ہونے نہ ہونے کا احتمال ملے گا، تمام معلومات میں رات دن کی آمد یقینی چیز ہے لیکن اس کے لئے قیامت کا ایک ایسا دن اللہ کی جانب سے معین ہے کہ اس کے بعد رات اور دن کی آمد بھی ختم ہو جائے گی۔ صرف موت ایک ایسی یقینی چیز ہے کہ اس کے آنے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں جاندار اور ذی روح کا کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ آسمان و زمین کے بیچ جتنی چیزیں وجود میں آگئی ہیں سب کو فنا اور موت لازم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

(۱) ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (۵۵/۲۶۔۲۷)

زمین پر جتنی چیزیں ہیں سب فنا ہو جانے والی ہیں صرف تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا جو عزت اور عظمت والا ہے۔

موت کا آنا اتنا یقینی ہے کہ دو جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے موت کو ''یقین'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾ (۱۵/ ۹۹)

اے نبی آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔

﴿وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ، حَتَّى أَتَانَا الْيَقِينُ﴾ (۷۴/۴۶۔۴۷)

اور ہم قیامت کے دن کو جھٹلاتے رہے یہاں تک کہ ہم کو موت آ گئی۔

مذکورہ دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے موت کو یقین کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ظاہر ہے اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ تمام موجودات میں موت کا آنا جتنا یقینی ہے اتنا اور کسی چیز کا ہونا یقینی نہیں ہے اس لئے موت کیا ہے؟ سراپا یقین ہے۔

سورہ واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے اثبات میں موت جیسی یقینی چیز کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

(۴) ﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ، وَأَنْتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ، وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَكِن لَّا تُبْصِرُونَ، فَلَوْلَا إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ، تَرْجِعُونَهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ (۵۶/۸۲-۸۸)

ترجمہ! تو جب روح حلق تک پہنچ جائے، اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہو، اس وقت ہم تم سے زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں لیکن تم نہیں دیکھ سکتے، پھر اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو تو تم روح کو کیوں نہیں واپس لوٹا لیتے اگر اپنی بات میں سچے ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنی حاکمیت اور قدرت کاملہ کو ثابت کر رہا ہے اور فرما رہا ہے کہ اگر تم اپنے اوپر کسی ہستی کو حاکم اور اپنے کو اس کا محکوم نہیں مانتے تو میں تم سے کہتا ہوں کہ جب کسی مرنے والے کی روح حلق میں آ کر اٹک جاتی ہے اور تم سب اس مریض کی تیمارداری اور دوا علاج میں اس کے پاس موجود رہتے ہو، اس وقت میں بھی وہاں موجود رہتا ہوں بلکہ تمہاری بنسبت میں مریض کے زیادہ قریب رہتا ہوں لیکن تمہیں سوجھتا نہیں، اب میں تم سے کہتا ہوں کہ میں اسکی روح نکال رہا ہوں تم اس کی روح کو لوٹا لو۔

روح کا نکلنا اور موت کا آنا ایسا یقینی امر ہے جس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے، آج تک جتنے لوگ پیدا ہوئے سب کو موت کی راہ سے گذرنا پڑا۔

چاہے وہ نبی، ولی، مومن اور مسلم رہے ہوں یا اپنے وقت کے حاکم، بادشاہ اور کافر و مشرک رہے ہوں۔ جس طرح موت یقینی امر ہے اسیطرح اللہ کی بادشاہی اور اس کی قدرت کاملہ یقینی چیز ہے اس پر ایسا ہی یقین اور ایمان رکھنا چاہیے جیسے موت کے آنے پر یقین ہوتا ہے۔

موت و حیات اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا نظام ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَن يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْساً إِذَا جَاء أَجَلُهَا وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾

اور جب کسی کا مقررہ وقت آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ہرگز مہلت نہیں دیتا، اور جو کچھ تم لوگ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

موت پر اظہار غم:

میت چھوٹی ہو، بڑی ہو، مرد ہو یا عورت ہو یہ ایک ایسا حادثہ ہے کہ اس کے بعد اعزہ اقرباء، محلہ پڑوس کو فطری طور پر غم اور دکھ ہوتا ہے اور مرنے والے کی جدائی میں آنکھ سے آنسو ٹپک ہی جاتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ابوسیف لوہار کے پاس گئے اور ابوسیف رسول اللہ ﷺ کے صاجزادے حضرت ابراہیم کے رضاعی باپ تھے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم بیمار تھے ان کی عیادت میں ہم لوگ گئے تھے۔ آپ نے اپنے بیٹے ابراہیم کو اپنی گود میں لیا، ان کو بوسہ دیا اور چوما، ابراہیم کا حال یہ تھا کہ دم توڑ رہے تھے روح نکل رہی تھی، یہ کیفیت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن

عوف رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے آپ کو روتے دیکھا تو کہا! اللہ کے رسول! آپ اور آنسو؟ آپ تو لوگوں کو رونے سے منع کرتے ہیں آپ نے فرمایا! عوف کے بیٹے (عبدالرحمٰن) یہ بے صبری نہیں، رحمت وشفقت کی پہچان ہے، اس کے بعد پھر دوبارہ روئے اور فرمایا! إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْب يَحزُن، وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يُرضِيَ رَبَّنَا وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُون، بیشک آنکھ آنسوں گراتی ہے، دل رنجیدہ ہوتا ہے، لیکن ہم اپنی زبان سے وہی کہتے ہیں جو ہمارے رب کو خوش کرے، اے ابراہیم ہم تمہاری جدائی پر بلاشبہ غمزدہ ہیں۔ (صحیح بخاری، جنائز/۱۳۰۳)

ایک اور حدیث سماعت فرمائیں! عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سعد بن عبادہ بیمار پڑے تو ان کی عیادت کو رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ عیادت کے لئے عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم بھی گئے۔ جب آپ ان کے پاس پہنچے تو گھر کے لوگ جمع تھے ان کو گھیرے ہوئے تھے، آپ نے بھیڑ دیکھ کر پوچھا! کیا وفات ہوگئی؟ لوگوں نے بتایا نہیں اے اللہ کے رسول (ﷺ) کیفیت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ بھی رو پڑے، آپ کو روتے دیکھ کر سارے لوگ رونے لگے، آپ نے اس موقعہ سے فرمایا: ”أَلَاتَسْمَعُونَ أَنَّ اللهَ لَا يُعَذِّبُ بِدَمْعِ الْعَيْنِ وَلَا بِحُزنِ الْقَلْبِ وَلٰكِنْ يُعذِّبُ بِهٰذَا، وَأَشَارَ إِلىٰ لِسَانِه أَوْ يَرْحَمُ“

سنو! آنکھ سے آنسو نکلنے اور دل کے رنجیدہ ہونے پر اللہ تعالیٰ عذاب نہیں دیتا، آپ نے زبان کیطرف اشارہ کرکے فرمایا! اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عذاب دے گا یا رحم کرے گا۔ (صحیح بخاری، جنائز/۱۳۰۴)

دو حدیثیں آپ کو سنائی گئی ہیں دونوں حدیثوں میں خود رسول اللہ ﷺ کے رونے کا ذکر ہے۔ آپ نے مریض کی حالت اور کیفیت دیکھی اور آپ کی آنکھوں

سے آنسو بہہ پڑے، آپ انسان تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کے سینے میں ایک مہربان دل رکھا تھا آنسو کا بہہ جانا ایک طبعی اور فطری بات تھی۔ اسی لئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے اعتراض کرنے پر آپ نے آنسو کے گرنے کو رحمت وشفقت سے تعبیر کیا۔

دوسری حدیث میں اس بات کی صراحت ہے کہ آنسو گر جانے پر اللہ تعالیٰ عذاب نہیں دیتا یہ تو محبت کی پہچان ہے ہاں چیخے، چلائے، ہائے وائے کرے، زبان سے ناجائز اور نازیبا کلمات نکالے جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہوں تو وہ حرام ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ عذاب دیتا ہے۔

جاہلیت کی پکار:

زمانۂ جاہلیت میں مُردوں پر رونا پیٹنا فخر سمجھا جاتا تھا۔ جس پر جتنا زیادہ رویا اور چیخا جائے وہ اتنا ہی زیادہ معزز اور محترم مانا جاتا تھا۔ رئیسوں اور سرداروں کی موت پر چیخنے چلانے کا خاص اہتمام ہوتا تھا، کرائے پر رونے، نوحہ اور بین کرنے والی مخصوص عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ جب کوئی سردار اور رئیس مرتا تو کرائے کی عورتیں پہنچ جاتیں اور نوحہ، بین کرتیں، چیختیں اور چلاتیں۔ یہ ساری چیزیں اسلامی آداب کے خلاف ہیں، اسی لئے نبی کریم ﷺ اسلام لانے والی عورتوں سے جب بیعت لیتے تھے تو اس میں نوحہ نہ کرنے کی شرط رکھتے تھے۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ''اَخذَ عَلَينا النبیُ ﷺ عندَالبیعة أن لَّانَنُوحَ'' (بخاری، جنائز/۱۳۰۶)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیعت لیتے وقت ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ ہم نوحہ نہیں کریں گی، کسی میت پر گریبان پھاڑنے والی، بال نوچنے والی، اپنے منہ پر طمانچہ مارنے والی، دھول ڈالنے والی، چیخ، پکار کرنے والی کے بارے میں آپ کا

ارشاد گرامی ہے کہ ایسی عورت مسلمانوں کی جماعت میں نہیں شمار کی جائے گی۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُودَ وَشَقَّ الْجُيُوبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ (بخاری، جنائز/۱۲۹۶)

یعنی جو آدمی گالوں پر طمانچہ مارے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی پکار لگائے وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات پر کچھ عورتوں نے ان کے گھر نوحہ کرنا شروع کر دیا ان میں حضرت ابوبکر کی بہن ام عروہ بھی شامل تھیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو انہوں نے منع کیا لیکن وہ نہیں مانیں تو حضرت عمرؓ نے ہشام بن ولید کو حکم دیا کہ نہیں مانتیں تو انہیں کوڑے لگاؤ انہوں نے کوڑا لگانا شروع کیا تو جتنی نوحہ کرنے والی تھیں سب وہاں سے نکل بھاگیں۔

(صحیح بخاری خصومات رباب نمبر ۵)

غم کو چھپانا اور صبر کرنا:

دنیا مصائب کی آماجگاہ ہے، چھوٹا ہو بڑا ہو، حاکم ہو محکوم ہو، امیر ہو یا غریب ہو کسی کو مصائب اور حادثات سے چھٹکارا نہیں ہے چھوٹی یا بڑی مصیبت سے ہر ایک کو گذرنا ہے ان مصائب میں سب سے بڑی مصیبت کسی کی موت ہے۔ ایسے موقعہ پر ہمیں صبر کا راستہ اور اصحاب رسول کا اسوہ اختیار کرنا چاہیئے۔ شریعت کی نگاہ میں وہی صبر قابل قدر اور باعث ثواب ہے جو چوٹ لگتے ہی اختیار کیا جائے، مرور ایام کے بعد تو خود ہی صبر ہو جاتا ہے اس لئے اس صبر کی کوئی قدر و قیمت شریعت کی نگاہ میں نہیں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کا گذر ایک ایسی عورت کے پاس سے ہوا جو اپنے بیٹے کی قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، آپ نے

اس سے فرمایا! اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔ عورت آپ کو پہچانتی نہیں تھی اس نے جھٹ سے کہہ دیا "إِلَيكَ عَنِّي، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَبْ بِمُصِيبَتِي" چلو ہٹ جاؤ میرے پاس سے مجھے جو مصیبت پہنچی ہے اسے تم کیا جانو، بعد میں لوگوں نے بتایا کہ وہ نبی ﷺ تھے، تو وہ بھاگی ہوئی نبی ﷺ کے پاس آئی اور کہا! میں آپ کو نہیں پہچان سکی (گستاخی ہوئی، معاف فرمائیں) آپ نے فرمایا! "إِنَّمَا الصبرُ عِندَ الصَّدمَةِ الْأُولَى" چوٹ لگتے ہی جو صبر کیا جائے وہی حقیقی صبر ہے اور اسی پر ثواب مرتب ہوتا ہے۔ (صحیح بخاری، جنائز/۱۲۸۳)

معلوم ہوا کہ شریعت کی تعلیم کے مطابق مصائب پر صبر کرنا چاہیے اور صبر بھی اول مرحلہ میں کیا جائے تاکہ صبر پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثواب حاصل ہو، رونے، پیٹنے، نوحہ بین کرنے کے بعد اگر صبر کیا تو اس پر کوئی ثواب نہیں ملے گا بلکہ نوحہ اور بین جو شریعت کے نزدیک حرام ہے اس کے ارتکاب پر گناہ مل سکتا ہے اور عذاب بھی ہوسکتا ہے۔

غم کو چھپانے اور صبر کرنے کی ایک بہترین مثال سماعت فرمائیں!

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابوطلحہؓ کا ایک بیٹا بیمار پڑا اور مر بھی گیا حضرت ابوطلحہ اس وقت گھر پر نہیں تھے، ابوطلحہ کی بیوی (ام سلیمؓ حضرت انس کی ماں) نے دیکھا کہ لڑکا مر گیا ہے تو اس کو گھر کے ایک گوشے میں رکھ دیا اور گھر کا کھانا وغیرہ تیار کر کے خود بھی تیار ہو گئیں، جب ابوطلحہ رضی اللہ عنہ گھر تشریف لائے تو پوچھا لڑکے کا کیا حال ہے؟ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا! سکون سے ہے، میں سمجھتی ہوں کہ اب اس کو آرام ہو گیا ہے۔ ام سلیم کی بات سے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا کہ ام سلیمؓ صحیح کہہ رہی ہیں (یعنی واقعی بچہ آرام سے ہے) حضرت انس کہتے ہیں کہ ابوطلحہ رات کو ام سلیم کے پاس رہے صبح کو غسل کیا۔ جب باہر جانے لگے تو ام سلیم نے ان کو

بتایا کہ لڑکا مر چکا ہے۔ ابوطلحہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی اور آپ سے ام سلیم کا حال بیان کیا، نبی ﷺ نے فرمایا! ہوسکتا ہے آج کی شب باشی میں اللہ تعالیٰ تم دونوں کو برکت عطا کرے۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ! میں نے ایک انصاری آدمی کو کہتے سنا! کہ میں نے ان کے نو لڑکے دیکھے جو سب کے سب حافظ قرآن تھے۔

(صحیح بخاری، جنائز/۱۳۰۱)

سبحان اللہ! ایسی ہشیار، عقلمند، صابر و شاکر اور اللہ کی تقدیر پر راضی رہنے والی عورتیں کہاں ملیں گی، باپ کے مقابلے میں ماں کو اپنے کم سن بچے سے زیادہ محبت ہوتی ہے لیکن حضرت ام سلیم کا صبر و استقلال اور اللہ کے فیصلے پر رضا مندی کی شان دیکھئے کہ بچہ مر گیا ہے اور شوہر کو ایسے ڈھنگ سے سمجھایا کہ ابوطلحہ نے سمجھا کہ واقعی بچہ اچھا ہو گیا ہے، بچے کو غسل اور کفن دے کر کونے میں رکھ دیا، کھانا تیار کیا خود زیب و زینت اختیار کی شوہر کے ساتھ رات گذاری رات بیت گئی تو شوہر کو بتایا۔ کیوں؟ اس لئے کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب بچہ واپس نہیں آئے گا۔ خود پریشان ہونے اور شوہر کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ مصائب میں اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم ہے کہ صبر کیا جائے اس کا اللہ تعالیٰ بہترین اجر دیگا اور ہوا بھی یہی۔ اللہ نے اس رات میں برکت عطا کی بچہ پیدا ہوا اور اس بچہ کی اولاد میں نو عالم اور حافظ پیدا ہوئے۔

موت اللہ کا ایک اٹل فیصلہ ہے اس میں تقدیم و تاخیر بھی کسی کے بس میں نہیں ہے، مرنے والے کو واپس لانا تو دور کی بات ہے۔ اس لئے اس کا صرف ایک علاج ہے جسے شریعت نے صبر سے تعبیر کیا ہے۔

میرے بھائیو! حضرت ام سلیمؓ نے جو نمونہ پیش کیا ہے آج ہمارے معاشرے میں اس کی ادنیٰ جھلک بھی نہیں پائی جاتی بلکہ اگر ایسا آج کوئی عورت کر دے تو شاید وہ سارے معاشرے میں نکو ہو کر رہ جائے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ

کچھ حدیثیں سناؤں جس سے آپ اندازہ کرسکیں کہ ایک مومن کی نگاہ میں موت کی کیا حیثیت ہونی چاہئے؟

موت مومن کی نگاہ میں:

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ دنیا کے حادثات میں موت سب سے بڑا حادثہ ہے لیکن ایمان لانے کے بعد مومن کے دل میں ایمان کی گرفت اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ وہ موت سے محبت کرنے لگتا ہے، موت اس کی نگاہ میں ایک حقیر شی ہو جاتی ہے، مومن حیات پر موت کو ترجیح دیتا ہے، موت پر صبر کرتا ہے اور اللہ سے ثواب کی امید کرتا ہے۔ اس کے ایمان کا تقاضا ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی اللہ کے پڑوس اور قرب میں حائل ہے مرنے کے بعد آدمی اللہ کے پڑوس میں پہنچ جاتا ہے اور اللہ کا پڑوس دنیا کے پڑوس سے بہتر ہے اس لئے مومن موت کو حیات پر ترجیح دیتا ہے، حدیث سماعت فرمائیں!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں نبی ﷺ کی بیویوں میں سے بعض نے آپ سے پوچھا کہ ہم میں سب سے پہلے آپ سے کون ملے گی؟ (مرے گی) آپ نے فرمایا! ''أَطوَلُكُنَّ يدًا'' یعنی تم میں سے جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہیں، اب ازواج مطہرات ایک لکڑی لیکر سب کا ہاتھ ناپنے لگیں۔ ناپنے پر معلوم ہوا کہ حضرت سودہ کے ہاتھ سب سے لمبے ہیں، لیکن (سب سے پہلے حضرت زینب کی وفات ہوئی تو) ہم نے جانا کہ وہ زینب ہیں اور ہاتھ کی لمبائی سے مراد ہاتھ بڑھا بڑھا کر صدقہ کرنا ہے اس لئے کہ وہ ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ صدقہ کرتی تھیں۔ (صحیح بخاری/زکوۃ/۱۴۲۰)

صحیح بخاری کی ایک اور حدیث سماعت فرمائیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آپ کے (مرض الموت میں) آپ کی تمام ازواج مطہرات آپ کے پاس جمع تھیں، اتنے میں آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدل چلتی ہوئی آئیں، واللہ فاطمہ کی رفتار آپ کی رفتار کے بالکل مشابہ تھی، آپ نے جب انہیں دیکھا تو انہیں خوش آمدید کہا اور اپنے دائیں یا بائیں جانب بیٹھایا اور چپکے سے ان کے کان میں کچھ کہا۔ سنکر حضرت فاطمہؓ فوراً رونے لگیں اور بہت روئیں۔ جب آپ نے ان کا غم دیکھا تو پھر چپکے سے کچھ کہا۔ اب سنکر ہنسنے لگیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں عورتوں میں مَیں بھی تھی، میں نے کہا فاطمہ! ساری عورتوں کو چھوڑ کر صرف تم کو اللہ کے رسول نے اپنے راز میں شامل کیا اور تم روتی ہو؟ جب رسول اللہ ﷺ اٹھ گئے تو میں نے فاطمہ سے پوچھا! کیا چپکے سے کہا تھا۔ (اتنی جلد روتے اور ہنستے میں نے کبھی کسی کو نہیں دیکھا) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا! (چپکے سے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راز ہے) میں رسول اللہ ﷺ کا راز فاش نہیں کروں گی۔

پھر (چند ہی دنوں کے بعد) آپ کی وفات ہوگئی تو میں نے فاطمہ سے کہا! اب میں تم کو اپنے اس حق کی قسم دیتی ہوں جو میرا تم پر ہے۔ مجھکو بتلاؤ کہ رسول اللہ ﷺ نے اس روز تم سے کیا کہا تھا۔ انہوں کہا ہاں اب بتلاؤں گی۔

سنئے! پہلی بار جب مجھ سے کان میں کہا تھا تو اس وقت مجھکو یہ بتلایا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام ہر سال قرآن کا دور مجھ سے ایک بار کرتے تھے اس سال انہوں نے دوبار دور کیا ہے اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری موت قریب آ گئی ہے، لہذا تم اللہ سے ڈرو اور صبر اختیار کرو، میں تمہارے لئے آخرت کا اچھا پیش رفت ہوں۔ فاطمہؓ کہتی ہیں کہ اس وقت میں روئی تھی۔ پھر جب آپ نے میری بیقراری دیکھی تو دوبارہ مجھ سے کان میں کہا! فاطمہ! کیا تم یہ پسند نہیں کرتی کہ (جنت میں) مومنہ عورتوں کی

سردار بنو، یا یہ کہا اس امت کی عورتوں کی سردار بنو۔ (صحیح بخاری، استیذان/ ٦٢٨٥)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک دوسری روایت میں یوں وارد ہے۔ پھر مجھ سے سرگوشی کی اور بتایا کہ تم میرے گھر والوں میں سب سے پہلے مجھ سے ملوگی تو میں یہ سن کر ہنس پڑی۔ (صحیح بخاری، علامات نبوۃ/ ٣٦٢٦)

ابھی جو روایتیں آپ کو سنائی گئی ہیں ان کا تعلق آپ ﷺ کے مرض الموت سے ہے اور روایتوں میں ذکر یا تو ازواج مطہرات کا ہے یا آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔

موت ایک ایسا حادثہ ہے کہ آدمی اس سے بچنے اور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن آپ نے سنا کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن آپ سے ملنے اور اپنے مرنے کا وقت پوچھ رہی ہیں، موت انہیں اتنی پیاری تھی۔ اور حضرت فاطمہ کا یہ حال ہے کہ اپنی موت کی خبر سنتی ہیں تو خوش ہو جاتی ہیں اور رولائی ہنسی میں بدل جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ مومن کی نگاہ میں موت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مرنا جینا اللہ کا ایک نظام ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق چلتا رہے گا۔ حیات اس لئے نہیں کی اس پر خوشی منائیں اور موت اس لئے نہیں کہ اس پر غمی منائیں، اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا چاہئے۔

کتنا فرق؟:

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا عرب کی وہ مشہور شاعرہ ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں بے پناہ شہرت حاصل کی، مرثیہ گوئی میں پورے عرب کے اندر ان کی کوئی نظیر نہیں تھی، سوق عکاظ میں ان کے خیمے کے دروازے پر لکھا جاتا تھا "أرثی العرب" یعنی پورے عرب میں سب سے بڑی مرثیہ گو، انہوں نے جاہلیت اور اسلام

دونوں دور پایا ہے۔ ۸ ھ میں اپنی قوم کے وفد کے ہمراہ مدینہ آئیں اور مشرف باسلام ہوئیں۔

کہا جاتا ہے کہ ان کے دو بھائی تھے، معاویہ اور صخر، دونوں بھائی آگے پیچھے قبائلی جنگوں میں مار دیئے گئے۔ خنساء اپنے خاندان میں اکیلی لڑکی تھیں اس لئے پورا خاندان ان سے بیحد محبت کرتا تھا اور یہ بھی محبت کا جواب محبت سے دیتی تھیں ان کے بھائی معاویہ کا جب قتل ہوا تو ان کا غم ان سے برداشت نہیں ہو سکا اور بھائی کی جدائی میں شاعری شروع کر دی، مرثیہ ان کا خاص موضوع ہوتا۔ انتقامی جنگ میں ان کا دوسرا بھائی صخر بھی قتل کر دیا گیا، اکیلے معاویہ ہی کا غم نا قابل برداشت تھا دوسرے بھائی صخر کی جدائی نے خنساء کو پاگل بنا دیا، دن رات ان کا کام تھا رونا اور مرثیہ کہنا۔

یذکرنی طلوع الشمس صخراً

و أذکره لکل غروب شمس

صبح ہو یا شام ہر وقت مجھے صخر یاد آتا ہے۔

و ان صخراً لتأتم الهداة به

کانه علم فی راسه نار

صخر ایک ایسا شخص تھا جس کی اقتداء سردار لوگ کیا کرتے تھے، یوں سمجھو وہ ایک ایسا پہاڑ تھا جسکی چوٹی پر (رہنمائی کی) آگ جل رہی ہو۔

خنساء کی زندگی کا دو دور ہے پہلا دور جاہلیت کا جس میں وہ اپنے بھائیوں کی جدائی نہیں برداشت کر سکی، ادھر ادھر گھومتی، مرثیہ کہتی، اشعار پڑھتی اور روتی بلکتی، ایمان لانے کے بعد اس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اس دور کا ایک واقعہ سماعت فرمائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور خلافت ہے، اور ۱۶ھ ہجری میں قادسیہ کی جنگ

ہے۔ یہ بڑی خطرناک اور معرکۃ الآ راء جنگ تھی، خنساء کے چار بیٹے تھے۔ اپنے چاروں بیٹوں کو نصیحت کی، جوش دلایا اور جنگ میں بھیج دیا۔ بیٹوں نے ماں کی وصیت کے مطابق بڑی بے جگری اور بہادری سے جنگ میں حصہ لیا اور یکے بعد دیگر چاروں بیٹے شہید ہو گئے۔ جب بیٹوں کی شہادت کی خبر بوڑھی ماں کو پہنچی تو بے ساختہ اس کی زبان سے یہ کلمات نکلے، "الحمد للهِ الذی شَرَّفَنی بِقتلِهم، وأرجو اَنْ یَجمعَنِی بهم فی مستقر الرَّحمة" شکر ہے اس اللہ کا جس نے ان کی شہادت سے مجھے عزت بخشی اور اللہ سے امید ہے کہ وہ ہم سب کو اپنی رحمت کے مقام پر ملائے گا۔

سنا آپ نے! کتنا فرق ہے؟ ایمان اور کفر میں؟ جو عورت کفر کی حالت میں اپنے بھائی کا غم نہیں برداشت کر پا رہی تھی وہی عورت اسلام لانے کے بعد اپنے چار سگے بیٹوں کی موت کا غم برداشت کر رہی ہے اور اللہ کا شکر ادا کر رہی ہے۔ ایمان لانے کے بعد انسان کا دل روشن ہو جاتا ہے، اس کو حق و باطل کی تمیز حاصل ہو جاتی ہے، وہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ اللہ کی اس کائنات میں موت و حیات اور اس کے علاوہ جو بھی فیصلہ ہوتا ہے وہ سب اللہ کے حکم سے ہوتا ہے، موت و حیات بھی اللہ کا ایک فیصلہ ہے اس پر صبر و شکر کرنا چاہئے اور اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔ کسی کی موت پر جزع، فزع اور نوحہ، بین کفر کی پہچان ہے اور صبر و شکر ایمان کی پہچان ہے۔ خنساء کا یہ واقعہ ہماری تسلی کا بہترین سامان ہے۔

تعزیت کی مجلس:

مریض کی عیادت کے لئے جانا اور تعزیتی کلمات کہنا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے بلکہ خود نبی کریم ﷺ صحابہ کی عیادت کیلئے جایا کرتے تھے، اموات پر تعزیتی کلمات کہتے تھے، صبر کی تلقین فرماتے اور دعائیں سکھاتے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ

کو اور اپنی بیٹی حضرت زینب کو آپ نے تعزیتی کلمات کہے تھے، حضرت جعفر رضی اللہ کی شہادت کی جب آپ کو خبر ملی تو آپ مسجد میں اس طرح بیٹھے کہ آپ کے چہرے پر غم کے آثار ظاہر تھے اور لوگ وہاں آتے جاتے رہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک باب قائم کیا ہے "باب مَن جَلَسَ عندَ المصيبة يُعرَفُ فيه الحُزن" اور اس باب میں اسی حدیث کو ذکر کیا ہے۔ اس لئے اہل میت کے گھر جانا، ان کو تعزیتی کلمات کہنا اور ان کے کھانے (بھاتی) کا انتظام کرنا شرعاً درست اور جائز ہے۔

لیکن آہستہ آہستہ اس جائز کام میں زیادتی ہوتی گئی اور بعض جگہوں پر بدعت کی شکل پیدا ہوگئی مثلاً تعزیتی اجلاس کرنا اور اس میں تقریریں کرنا تیجہ اور فاتحہ کرنا، اہل میت کے ساتھ بہت سارے غیر متعلقین کو دعوت دینا، عید اور بقرعید کے موقع پر خصوصیت سے اہل میت کے گھر جانا۔ لوگ، ہمدردی اور تعزیت میں جاتے ہیں لیکن اس سے غم تازہ ہو جاتا ہے۔

موت کی اطلاع دینا جائز ہے صحیح حدیثوں سے ثابت ہے لیکن اطلاع دینا بھی اب ایک رسم بن گئی ہے ایسے ایسے لوگوں کو موت کی اطلاع دی جاتی ہے جن سے زندگی میں میت اور اہل میت سے کوئی شناسائی نہیں، کوئی راہ و رسم نہیں، لیکن جنازے میں حاضری بڑھانے کے لئے اجنبی لوگوں کو بھی اطلاع دیدی جاتی ہے۔ جنازے میں افراد کی کثرت بہت اچھی بات ہے لیکن کثرت پر ناز اور فخر کرنا اور جس کے جنازے میں کم لوگ شریک ہوں ان کی تنقیص کرنا بہت معیوب بات ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "بابُ مَن جَلَس عندَالمصيبة يُعرَفُ فيه الحزن" (یعنی مصیبت کے وقت اس طرح بیٹھنا کہ چہرے سے غم ظاہر ہو رہا ہو) قائم کرنے کے فوراً بعد ایک دوسرا باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے۔ "بابُ مَن لم يُظهِر حُزنه عندالمصيبة". یعنی جو شخص مصیبت کے وقت اپنا غم نہ ظاہر

کرے۔

پہلے باب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایت پیش کی ہے جس میں جنگ موتہ کے اندر زید بن حارثہ، جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ جو علی الترتیب اس جنگ کے کمانڈر تھے اور تینوں شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کی خبر سن کر آپ کو شدید دکھ ہوا اور اس کا اثر آپ کے چہرۂ مبارک سے ظاہر ہو رہا تھا۔

دوسرے باب میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے صبر کا ذکر ہے جو انہیں یوسف علیہ السلام کی جدائی سے پہنچا تھا۔ پھر حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو پیش کیا ہے جس میں بچے کی وفات پر ان کے صبر اور حسن انتظام کا ذکر ہے ابھی کچھ پہلے اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ دو باب قائم کر کے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جیسے ہر چیز میں اعتدال بہتر ہے اسی طرح مصائب کے پیش آنے پر بھی اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ لہذا اگر کسی کو بڑی مصیبت لاحق ہوئی مثلا موت اور ہلاکت کا واقعہ پیش آ گیا تو اظہار غم میں حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے کہ چیخنا، چلانا، بال نوچنا، گریبان پھاڑنا، منہ پیٹنا شروع کر دے کیونکہ یہ حرام ہے۔ اور اتنا صبر وثبات کا اظہار بھی نہ کرے کہ لوگ بے مروت اور سخت دل سمجھ بیٹھیں یا یہ قیاس آرائی شروع کر دیں کہ اس موت سے اس کو خوشی ہوئی ہے۔ اس لئے صبر اور اظہار غم دونوں میں اعتدال کی راہ اختیار کی جائیگی۔

تعزیتی کلمات

رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ حالات اور ظروف کے لحاظ سے آپ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے گھروں پر اور ان کے محلوں اور بیٹھکوں میں تشریف لے جایا

کرتے تھے اور ان کے مسائل سنتے اور حل کرتے تھے۔ چنانچہ

۱۔ قبا کے لوگوں میں ایک مرتبہ اختلاف ہو گیا تو آپ ان کا اختلاف دور کرنے کے لئے قبا تشریف لے گئے۔ (صحیح بخاری/۲۶۹۳)

۲۔ عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھنے کے لئے اپنے گھر بلایا تو آپ تشریف لے گئے (بخاری/۴۲۵)

۳۔ آپ کی بیٹی حضرت زینب نے اپنے بیٹے کی بیماری میں آپ کو بلایا تو آپ تشریف لے گئے۔ (بخاری/۳۸۴)

۴۔ ام سلمہؓ کی وفات پر آپ حضرت ام سلمہ کے پاس تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔ (تفسیر ابن کثیر سورہ بقرہ، ج۱)

۵۔ بنو سلمہ قبیلے میں ایک صحابی عباد بن بشر کی وفات پر تعزیت کے لئے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ (فتح الباری حدیث/۴۰، ص ۱۲۲)

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ تعزیت کے لئے اہل میت کے پاس جانا اور ان کو تعزیتی کلمات کہنا جائز ہے اس سلسلہ میں صاحب تحفۃ الاحوذی محدث مبارکپوریؒ کی مشہور کتاب ''کتاب الجنائز'' سے مولانا ہی کی عبارت نقل کر دینا ہم کافی سمجھتے ہیں۔ عبارت لمبی ہے لیکن مفید ہے۔ تعزیت کے بیان میں فرماتے ہیں:

''مصیبت والوں کی تعزیت کرنا یعنی ان کو صبر کی تلقین کرنا اور تسلی دینا سنت ہے، تعزیت سے اہل مصیبت کے مغموم دلوں کو تسلی ہوتی ہے، اور ان کو صبر و سکون حاصل ہوتا ہے اور تعزیت کرنے والوں کو ثواب ملتا ہے، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو مسلمان اپنے کسی بھائی کی مصیبت میں اس کی تعزیت کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن بزرگی کا حلّہ پہنائیگا۔ روایت کیا اس کو ابن ماجہ نے۔

تعزیت کی فضیلت میں اور بھی حدیثیں آئی ہیں، تعزیت کے واسطے کوئی

خاص الفاظ مقرر نہیں ہیں، ایسا مضمون ہونا چاہئے جس سے رنج وغم دور ہو اور صبر وتسلی حاصل ہو۔ تعزیت کے وقت میت کے واسطے دعا کرنا بھی آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک صاحبزادی کو جب کہ ان کا ایک لڑکا قضا کر گیا تھا، اس طرح تعزیت فرمائی کہ۔ اللہ تعالیٰ ہی کا تھا جو اس نے لے لیا، اور اسی کا ہے جو اس نے دیا، اور اس کے نزدیک ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے پس صبر کرنا چاہئے اور ثواب حاصل کرنا چاہئے۔ روایت کیا اس کو بخاری اور مسلم نے۔

یعنی لڑکا اللہ کی امانت تھا جو اس نے لے لیا، پس صبر کرنا چاہئے اور صبر کر کے ثواب حاصل کرنا چاہئے، اور اس لڑکے پر کیا موقوف ہے ہر ایک چیز کی ایک مدت مقرر ہے، پھر آخر اس کو فنا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو جب کہ ان کا لڑکا قضا کر گیا تھا اس طرح تعزیت کا خط لکھا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' یہ خط ہے محمد رسول اللہ کی طرف سے معاذ ابن جبل کو، سلام علیک، میں اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اما بعد! پس اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اجر زیادہ کرے اور تمہارے دل میں صبر ڈال دے، اور ہم کو اور تم کو صبر نصیب کرے۔ بلاشک ہماری جانیں، ہمارے مال اور ہمارے اہل اور ہماری اولاد اللہ تعالیٰ کی عمدہ بخششوں سے ہیں۔ اور اس کی عاریت دی ہوئی چیزوں سے ہیں، جن کی حفاظت اور نگہبانی کا ہم کو حکم کیا گیا ہے، ہم لوگ ان سے ایک مدت معین تک فائدہ اٹھاتے ہیں اور وہ ان کو وقت مقررہ پر لے لیتا ہے۔ پھر اس نے ہم لوگوں پر شکر کرنا فرض کیا ہے جب وہ دے، اور صبر کرنا فرض کیا ہے جب وہ مبتلا کرے۔ پس تمہارا لڑکا اللہ تعالیٰ کی عمدہ بخششوں سے تھا اور اس کی عاریت دی ہوئی چیزوں سے، جس کی حفاظت اور نگہبانی کا تم کو حکم کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس لڑکے سے بہت خوشی اور مسرت کے ساتھ متمتع کیا اور تم سے اسکو اجر کثیر کے ساتھ لے لیا۔ جو بخشش اور

رحمت اور ہدایت ہے اگر تم ثواب لینا چاہو تو صبر کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہاری بے صبری تمھارے اجر کو مٹا دے۔ پھر تم کو ندامت اٹھانا پڑے اور یاد رکھو بے صبری کسی چیز کو لوٹا نہیں لاتی۔ اور نہ رنج وغم دور کرتی ہے، اور جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ والسلام۔ (روایت کیا اس کو حاکم نے اور ابن مردویہ نے)

حضرت ابوبکرؓ کے پوتے قاسم بن محمد کی تعزیت میں محمد بن کعب قرظی نے جو مضمون بیان کیا تھا، اس کو یہاں لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مؤطا امام مالک ص۸۳ میں یحیٰ بن سعید سے روایت ہے کہ قاسم بن محمد نے کہا کہ میری ایک بیوی مرگئی تو محمد بن کعب قرظی تعزیت کے واسطے میرے پاس تشریف لائے اور بیان کیا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جو فقیہ، عالم، مجتہد اور عابد تھا اور اس کی ایک بیوی تھی جس پر وہ نہایت شیفتہ رہتا تھا اور بہت ہی محبت رکھتا تھا، اتفاق کہ اس کی وہ بیوی قضا کر گئی، پس وہ عابد نہایت ہی مغموم ہوا، اور اس درجہ اس کو رنج وغم ہوا کہ ایک گھر میں خلوت نشین ہو گیا۔ اور اندر سے گھر کو مقفل کر لیا۔ اور لوگوں سے ملنا جلنا بالکلیہ ترک کر دیا، کوئی شخص اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا، عابد کا یہ واقعہ سن کر ایک عورت آئی اور کہا کہ عابد سے مجھے ایک ضرورت ہے، ان سے مجھے ایک فتویٰ پوچھنا ہے مگر میں ان سے بالمشافہ اور رو برو ہو کر پوچھوں گی، بجز اس کے میری تشفی نہیں ہوگی، عابد کے دروازے پر جتنے لوگ تھے وہ تو چلے گئے مگر یہ عورت بیٹھی رہ گئی، اور کہا کہ بغیر پوچھے میں کسی طرح ٹل نہیں سکتی۔ کسی نے عابد سے کہا، ایک عورت آپ سے کوئی فتویٰ پوچھنے آئی ہے اور آپ سے وہ بالمشافہ پوچھنا چاہتی ہے۔ سب لوگ تو چلے گئے مگر وہ بیٹھی ہوئی ہے اور بغیر بالمشافہ پوچھے کسی طرح جانے کو نہیں کہتی۔ عابد نے کہا اچھا اس کو آنے کی اجازت دے دو۔ پس وہ عابد کے پاس آئی اور کہا کہ میں آپ سے ایک فتویٰ پوچھنے آئی ہوں۔ عابد نے کہا وہ کیا ہے؟ عورت نے کہا میں نے اپنی ایک پڑوسن سے ایک

زیور عاریت لیا تھا اور اس کو ایک زمانے تک میں خود بھی پہنتی تھی اور غیر کو بھی پہننے کو دیتی تھی، اب وہ پڑوسن اپنا زیور مجھ سے طلب کرتی ہے، تو کیا میں اس کا زیور اس کو دیدوں؟ عابد نے کہا ہاں واللہ اس کا زیور اس کو دیدے۔ عورت نے کہا اس کا زیور تو میرے پاس ایک زمانے تک رہ چکا ہے۔ عابد نے کہا! تب تو اور زیادہ ضرورت ہے کہ تو اس کا زیور اس کو دیدے عورت نے کہا!

حضرت! اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے اللہ تعالیٰ نے ایک چیز آپ کو عاریت دی تھی، پھر اس نے اپنی چیز لے لی۔ تو اس پر آپ اتنا غم کرتے ہیں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی چیز کا آپ سے زیادہ حقدار ہے۔ عورت کا اتنا کہنا تھا کہ عابد چونک پڑا اور متنبہ ہوگیا۔ اور عورت کی اس بات سے اس کو بہت نفع ہوا۔

(''کتاب الجنائز'' محدثؒ مبارکپوری۔ص۹۲۔۹۵)

تعزیت کے لئے مذکورہ کلمات بہت مناسب اور بہتر ہیں ان کے ساتھ حضرت ام سلیم، حضرت زینب، حضرت فاطمہ اور حضرت خنساء رضی اللہ عنہن کے واقعات کو بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ خنساء کے واقعہ کو چھوڑ کر تمام واقعات صحیح بخاری سے منقول ہیں اور ان میں تعزیت کا کافی سامان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کتاب وسنت کا متبع بنائے اور بدعات وخرافات سے محفوظ رکھے آمین۔

وضوءاور غسل کیسے کریں؟

نکات!

(۱) شریعت میں طہارت کا مقام۔
(۲) طہارت کس چیز سے حاصل کی جائے؟
(۳) پانی کب ناپاک ہوتا ہے
(۴) نجاست دور کرنے کا طریقہ۔
(۵) وضوء کی مشروعیت۔
(٦) وضوء کا طریقہ۔
(۷) نواقض وضوء۔
(۸) جن چیزوں سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔
(۹) غسل کب واجب ہوتا ہے؟
(۱۰) غسل کے آداب۔
(۱۱) کیا عورت اپنی چوٹی کھولے ہوگی؟
(۱۲) غسل میں کتنا پانی استعمال کریں؟
(۱۳) مردے کا غسل۔

شریعت میں طہارت کا مقام:

پاکی، طہارت اور صفائی وستھرائی ایک فطری چیز ہے، ہر شخص صاف ستھرے ماحول کو پسند کرتا ہے، گندگی اور نجاست سے گھن کرتا ہے، صفائی اور پاکیزگی پر خوشگوار

زندگی اور صحت عامہ کا انحصار ہے، صفائی کا تعلق جسم اور کپڑے سے ہو یا مکان اور صحن سے ہو ہر جگہ مطلوب اور مقصود ہے، صحت عامہ کی بقاء کیلئے حکومتیں بڑے بڑے منصوبے بناتی ہیں اور کثیر رقمیں خرچ کرتی ہیں، جبکہ شریعت اسلامیہ نے طہارت کو فرض عین اور نصف ایمان قرار دیا ہے، طہارت کی اہمیت کے بارے میں اسلام نے جو تعلیم پیش کی ہے، اس سے اوپر کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چند آیتیں اور حدیثیں سماعت فرمائیں۔

(۱) اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ﴾ (اعراف:۱۵۷)

اور وہ (نبی) ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا ہے اور گندی چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے۔

کھانا پینا انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے اگر انسان دانہ، پانی نہ پائے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ اب کون سا کھانا کھا کر انسان اپنی زندگی کو بچائے اور کون سا کھانا ہمارے پیٹ میں نہ جائے، اس کا ایک معیار قرآن کریم نے ہمیں یہ بتایا ہے جو چیز پاکیزہ ہو اور طیبات کی قبیل سے ہو وہ حلال ہے اس کو کھا سکتے اور پی سکتے ہیں اور جو کھانا گندگی اور خبائث کی قبیل سے ہو وہ حرام ہے اس کو نہیں کھا سکتے۔

سنا آپ نے انسان کی جو سب سے بڑی ضرورت ہے اس میں طیبات اور پاکیزہ چیزوں کو حلال رکھا گیا ہے، گندی اور نجس چیزوں سے بچنا ہے اس لئے ان کو حرام کر دیا گیا ہے۔

طہارت کے موضوع کو اللہ تعالیٰ نے متعدد آیتوں میں مختلف ناحیوں سے واضح کیا ہے۔ کسی آیت میں اللہ تعالیٰ پاکی اور طہارت اختیار کرنے کا حکم دے رہا

ہے، اور کسی آیت میں پاک رہنے والوں سے اپنی محبت کا اظہار کر رہا ہے اور کسی آیت میں ان کی تعریف کر رہا ہے۔ ارشاد ہے۔

﴿وَإِن كُنتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُواْ﴾ (مائدہ:٦)

اگر تم حالت جنابت میں رہو تو پاکی حاصل کرلو (غسل کرلو)۔

﴿فَاعْتَزِلُواْ النِّسَاء فِي الْمَحِيضِ وَلاَ تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىَ يَطْهُرْنَ﴾

(بقرہ:٢٢٢)

حیض کی حالت میں تم عورتوں سے دور رہو، ان کے قریب مت جاؤ یہاں تک کہ پاک ہو جائیں۔

﴿فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُواْ وَاللّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾

(توبہ/١٠٨)

اس میں ایسے لوگ ہیں جو خوب پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی خوب پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ (المدثر:٤-٥)

اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور گندگی سے دور رہو۔

یہ چند آیتیں آپ کو سنائی گئی ہیں ان کے علاوہ بہت ساری آیتیں قرآن کریم میں ایسی ہیں جو پاکی اور طہارت کی ترغیب دیتی ہیں۔ قرآن کے ساتھ آپ حدیث رسول کا تتبع کریں، نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ کی پوری زندگی نفاست اور نظافت سے تعبیر تھی، گندگی اور نجاست تو دور کی بات ہے معمولی سی مہک اور بساندھ بھی آپ کو برداشت نہیں تھی۔

آپ کو واقعہ یاد ہوگا کہ صرف اتنی شکایت پر کہ شہد سے مغافیر کی بو آ رہی

ہے۔آپ نے فرمایا؟ آج سے اس شہد کا شربت نہیں پیوں گا۔آپ کو کھانا پیش کیا گیا اس میں ایسی سبزی تھی جس سے کچھ مہک آ رہی تھی، آپ نے ہاتھ کھینچ لیا۔صحابۂ کرام نے دیکھا آپ نہیں کھا رہے ہیں تو انھوں نے بھی کھانے میں تامل کیا۔آپ نے ارشادفرمایا:

"كُلْ فَإنِي أُنَاجِي مَنْ لَاتُنَاجِي" (صحیح بخاری/۷۳۵۹)

تم کھاؤ! اس لئے کہ میں اس (فرشتے) سے سرگوشی کرتا ہوں جس سے تم نہیں کرتے۔

آپ نے کچی پیاز اورلہسن کھا کر مسجد میں آنے سے منع کر دیا۔"

مَنْ أَكَلَ مِن هَذهِ الشَّجَرةِ يَعنِي الثُّومَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنا "

(صحیح بخاری، اذان/ ۸۵۳)

یعنی جوشخص کچالہسن کھالے وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔

آپ اپنی امت کونفاست کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں"لَو لَا أنْ أشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي أو عَلَى النَّاسِ لَأمَرْتُهُم بِالسِّواكِ مَعَ كُلِّ صَلوةٍ"

(صحیح بخاری، جمعه/۸۸۷)

اگر میری امت پر مشقت کا خوف نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

صفائی اور پاکی کے پیش نظر جنبی اور حائضہ کوغسل کا حکم دیا گیا، ہر نماز کیلئے وضوء کی، جگہ کی اور بدن کی پاکی کی شرط رکھی گئی۔ پیشاب اور پائخانہ کے بعد پانی یا کم از کم ڈھیلا استعمال کرنے کا حکم دیا گیا،صحیح مسلم کی روایت ہے اللہ کے نبی ﷺ ارشاد فرماتے ہیں"الطُّهُورُ شَطْرُ الإيْمَان" (صحیح مسلم، طهارت) پاکی آدھا

ایمان ہے۔ یہ روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی مختلف کتابوں میں موجود ہے۔

غور فرمایئے! اسلام میں طہارت کی کتنی زیادہ تاکید ہے، زندگی کے تمام مراحل میں پاکی کا دخل ہے، دل کی پاکی زبان کی پاکی، خیالات کی پاکی، احساس و شعور کی پاکی، جسم کی پاکی، لباس کی پاکی، مکان کی پاکی، قول وفعل کی پاکی، نظام اور دستور کی پاکی، معاملات اور لین دین کی پاکی، اکل وشرب کی پاکی، نجاستوں اور گندگیوں سے پاکی، کہاں پاکی اور طہارت کی ضرورت نہیں ہے؟

ایک مومن کی زندگی کا ہر لمحہ آسمان کے پانی کی طرح پاک اور مشک وعنبر کی طرح معطر ہونا چاہئے۔

طہارت کس چیز سے حاصل کی جائے:

طہارت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ پاک ہیں آپ کا کپڑا پاک ہے، غسل کی ضرورت نہیں ہے لیکن مزید نفاست اور نظافت کیلئے آپ غسل کر رہے ہیں یا کپڑا دھو رہے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ ناپاک ہیں مثلاً جنبی ہیں یا عورت حیض ونفاس سے ہے یا آپ کے کپڑے اور بدن پر کوئی نجاست لگی ہوئی ہے۔ دونوں صورتوں میں طہارت کیلئے اصل پانی ہے۔ جنابت، حیض ونفاس یا محض نفاست کا غسل ہو ہر حال میں پانی ہی استعمال کیا جائے گا۔ بصورت مجبوری تیمم کی اجازت ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوراً﴾ (الفرقان:۴۸)

اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا جو پاک ہے پاک کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَإِن كُنتُم مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاء أَحَدٌ مِّنكُم مِّن الْغَآئِطِ أَوْ لاَمَسْتُمُ النِّسَاء فَلَمْ تَجِدُواْ مَاءً فَتَيَمَّمُواْ صَعِيداً طَيِّباً﴾ (النساء:۴۳)

اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو، یا پیشاب پاخانے سے نکلے ہو یا عورتوں سے جماع کئے ہو اور (پاکی حاصل کرنے کیلئے) پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو (تیمّم کرلو)۔

ایک تیسری آیت میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّن السَّمَاء مَاء لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ﴾ (انفال:۱۱)

اور آسمان سے تم پر پانی برسارہا تھا تاکہ اس کے ذریعہ تم کو پاک کردے۔

تینوں آیتوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے پانی کو پاکی کی اصل قرار دیا ہے، پانی خود پاک ہے اور پاک کرنے والا ہے، اگر پانی نہ ملے یا ملے لیکن نہانے، دھونے اور وضوء کرنے میں استعمال کریں تو پینے کیلئے نہیں ملے گا۔ ایسی مجبوری کی صورت میں پاک مٹی سے طہارت حاصل کرنے (تیمّم) کی اجازت ہے۔

پانی کب ناپاک ہوتا ہے؟

ہر پانی سے پاکی نہیں حاصل کی جاسکتی پانی کی مختلف قسمیں ہیں کچھ پانی تو ایسا ہوتا ہے جو خود پاک ہوتا ہے اور پاک کرنے والا ہوتا ہے مثلاً بارش کا پانی، برف اور اولے کا پانی، ندی اور تالاب کا پانی، کنوئیں کا پانی، نل اور بورنگ کا پانی، یہ سب

پانی خود پاک اور پاک کرنے والا ہے۔

کچھ پانی ایسا ہوتا ہے جس میں کسی پاک چیز کی آمیزش ہوتی ہے اس لئے وہ خود تو پاک ہوتا ہے لیکن پاک کرنے والا نہیں ہوتا۔ آپ اس سے پاکی حاصل کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، اس سے مطلق پانی کا نام سلب ہو جاتا ہے۔ مثلاً رنگائی کا پانی، صابن کا پانی، گلاب کا پانی، آٹے کا پانی وغیرہ۔ چونکہ اس قسم کا پانی خالص نہیں ہوتا اس لئے اس سے پاکی نہیں حاصل کر سکتے اگرچہ وہ خود پاک ہے۔

پانی کی ایک تیسری صورت یہ ہے کہ اس میں نجاست اور گندگی پڑ گئی ہو ایسی صورت میں دیکھا جائیگا کہ وہ پانی تقریباً ڈھائی سو لیٹر سے کم ہے یا زیادہ؟ اگر ڈھائی سو لیٹر سے کم ہے تو نجاست پڑنے سے پورا پانی گندہ ہو جائیگا، اس سے آپ پاکی نہیں حاصل کر سکتے، وضوء نہیں کر سکتے اور کپڑا نہیں دھو سکتے۔

اور اگر پانی ڈھائی سو لیٹر سے زیادہ ہے تو اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پانی میں تین وصف رکھا ہے: رنگ، بو، مزا، نجاست پڑنے کے بعد دیکھا جائیگا کہ تینوں وصفوں میں سے کوئی وصف بدلا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں بدلا ہے تو پانی پاک ہے اور پاک کرنے والا ہے، آپ اس سے طہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر نجاست کی وجہ سے کوئی وصف بدل گیا ہے مثلاً پانی میں بدبو پیدا ہو گئی ہے یا اس کا مزا یا اس کا رنگ بدل گیا ہے تو پانی ناپاک مانا جائیگا اور آپ اس سے طہارت نہیں حاصل کر سکتے۔ دلیل امت کا اجماع اور امام زہری کا یہ قول ہے جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے: ”لَا بَأسَ بِالْمَاءِ مَالَمْ يُغَيِّرْه طَعمٌ أو رِيحٌ أو لَونٌ“ (صحیح بخاری، کتاب الوضوء: باب ٦٧) پانی کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جب تک کہ اس کا مزہ، بو اور رنگ نہ بدل جائے۔

نجاست دور کرنے کے طریقے:

ابھی آپ کو بتایا گیا کہ نجاست دور کرنے کا اصل طریقہ پانی ہے۔لیکن پانی نہ ملنے کی صورت میں پاک مٹی سے تیمّم کر کے پاکی حاصل کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے، اس کے علاوہ بھی نجاست دور کرنے اور پاکی حاصل کرنے کے بعض دوسرے طریقے حدیث میں بتائے گئے ہیں۔مثلاً آپ کے جوتے میں نجاست لگی ہو تو پانی سے دھونا ضروی نہیں ہے، پاک زمین پر رگڑ دینے سے جوتا پاک ہو جائیگا۔ عورتوں کا دامن لمبا ہوتا ہے اگر کسی ناپاک جگہ سے ان کا گذر ہو اور دامن ناپاک زمین سے مس ہو جائے اور ظاہری نجاست نہ لگی ہو تو دھونا ضروری نہیں، بعد میں پاک زمین پر گھسٹ جانے سے پاک ہو جائیگا۔چھوٹا لڑکا ہے جو ابھی کھانا نہیں کھاتا ہے، اگر آپ کے اوپر پیشاب کر دے تو کپڑے کا دھونا ضروری نہیں، پانی کا چھینٹا مار دینے سے کپڑا پاک ہو جائیگا۔منی ناپاک ہے لیکن اگر گاڑھی اور خشک ہے تو کھرچ دینے سے پاک ہو جائے گی۔ یہ جتنے مسائل بتائے گئے ہیں، وہ سب حدیث سے ثابت ہیں اور جب حدیث سے ثابت ہیں تو آپ کی عقل تسلیم کرے یا نہ کرے ایمان کا تقاضا ہے کہ اس کو تسلیم کیجئے، اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نام اتباع سنت ہے۔

وضوء کی مشروعیت:

وضوء ان فرائض میں سے ہے جن کا حکم پہلے اور آیت بعد میں اتری ہے۔ اس لئے کہ وضوء کا حکم سورہ مائدہ کی آیت نمبر ٦ میں ہے اور سورہ مائدہ نماز کی فرضیت کے بہت بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہے سورہ مائدہ کی آیت کریمہ یہ ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلاةِ فاغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾

ترجمہ! اے ایمان والو جب تم نماز کیلئے اٹھو تو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنی سمیت دھولو، اور اپنے سروں کا مسح کرلو اور اپنے پاؤں کو گھٹی سمیت دھولو (المائدہ:٦)

چند حدیثیں بھی سماعت فرمالیں جن میں اللہ کے نبی ﷺ نے وضوء کی مشروعیت اور فضیلت بیان فرمائی ہے: " لَاتُقْبَلُ صَلٰوةُ مَنْ أَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأ" جس کا وضوء ٹوٹ جائے اس کی نماز نہیں قبول کی جائیگی یہاں تک کہ وضوء کرلے۔ (صحیح بخاری، کتاب الوضوء/١٣٥)

وضوء کے نشان سے قیامت کے دن اعضاء وضوء چمک رہے ہوں گے۔ (صحیح بخاری/١٣٦) پانی کے قطروں کے ساتھ اعضاء وضوء سے صادر ہونے والے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ (موطا امام مالک، جامع ترمذی)

وضوء کا طریقہ:

وہ وضوء جو شریعت کو مطلوب ہے اس کی پوری کیفیت حدیث نبوی میں موجود ہے لیکن لوگ وضوء کرنے میں افراط اور تفریط سے کام لیتے ہیں اس لئے وضوء کا جو طریقہ بتایا جارہا ہے اسے دھیان سے سنیں اور اس کو سنت جان کر عمل کریں۔

(۱) وضوء میں نیت ضروری ہے۔ دلیل! اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث "إنما الأعمال بالنيات" ہے۔ ہر شرعی عمل کیلئے نیت ضروری ہے اور وضوء بھی ایک شرعی عمل ہے اس لئے وضوء کیلئے پہلے نیت ضروری ہے۔

(۲) اگر ممکن ہو تو مسواک کرنا۔ دلیل!"لَو لَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُم

بِالسِّوَاكِ عِندَ كُلِّ صَلوٰةٍ" اگر اپنی امت پر مجھے مشقت کا خوف نہیں ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔ (صحیح بخاری، باب السواک)

(۳) پہلے دونوں ہتھیلیوں کو دھونا۔

(۴) کلی کرنا۔

(۵) ناک میں پانی چڑھانا اور ناک جھاڑنا۔

(۶) چہرہ دھونا (کان کی لوتک)۔

(۷) دونو ہاتھوں کو کہنی سمیت دھونا۔

(۸) پورے سر کا مسح کرنا۔

(۹) ٹخنوں سمیت دونوں پاؤں کو دھونا۔

دلیل! سب کی دلیل صحیح بخاری کی یہ حدیث ہے۔

حمران مولی عثمان کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پانی کا برتن مانگا اور اس سے پانی انڈیل کر تین بار دونوں ہاتھ دھوئے، پھر دایاں ہاتھ پانی میں ڈال کر پانی لیا اور تین بار کلی کیا اور ناک جھاڑا، پھر تین بار چہرہ دھویا، پھر تین بار کہنی سمیت دونوں ہاتھ دھوئے، پھر پورے سر کا مسح کیا، پھر اپنے دونوں پاؤں کو ٹخنوں سمیت تین بار دھویا، اس کے بعد کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص میرے اس وضوء کی طرح وضوء کرے، اس کے بعد حضور قلب سے دو رکعت نماز پڑھے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔ (صحیح بخاری / باب الوضوء ثلاثا ثلاثا / ۱۵۹)

اعضاء وضوء کو ایک بار دو بار اور تین بار دھونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ اس لئے تینوں پر عمل کرنا جائز ہے، سر کے مسح کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "بـاب مسح الرأس مرة" قائم کرکے یہ اشارہ کردیا

کہ سر کا مسح ایک بار راجح ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضوء کرنے کے بعد اس وضوء کو رسول اللہ ﷺ کا وضوء قرار دیا اس لئے اس وضوء کے اندر جتنے اعمال کا ذکر ہے وہ رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے اس لئے ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ نیت اور مسواک کی دلیل پہلے دیدی گئی ہے اور باقی تمام اعمال کی دلیل حضرت عثمان کی حدیث میں موجود ہے۔

(۱۰) داڑھی کا خلال کرنا۔ دلیل!" عن عثمانَ بنِ عفانَ أنّ النبیَ ﷺ کَانَ یُخَلّلُ لِحیَتَہ" حضرت عثمان بن عفان سے روایت ہے کہ نبی ﷺ (وضوء میں) اپنی داڑھی کا خلال کرتے تھے۔ (جامع ترمذی/باب تخلیل اللحیۃ)

(۱۱) انگلیوں کے درمیان خلال کرنا۔"قَالَ النَّبِیُ ﷺ إذَا تَوَضَّأْتَ فَخَلّلِ الأصَابع" جب تم وضوء کرو تو انگلیوں کے درمیان خلال کرو۔

(جامع ترمذی، باب تخلیل الأصابع)

دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ وضوء میں بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں، اعضاء وضوء پر صرف پانی بہالینا کافی سمجھتے ہیں، اس کو ملنا اور رگڑ نا ضروری نہیں سمجھتے، حالانکہ عبادت کیساتھ وضوء سے انقاء اور صفائی بھی مقصود ہے، آپ جانتے ہیں کہ وضوء میں وہی اعضاء دھوئے جاتے ہیں جو عموماً کھلے رہتے ہیں پورا جسم تو کپڑے میں ڈھکا رہتا ہے لیکن اعضاء وضوء جتنے ہیں وہ کھلے رہتے ہیں، اس لئے ان پر گرد اور میل بیٹھنے کا زیادہ امکان رہتا ہے، وضوء کے ذریعہ ان کی صفائی مقصود ہوتی ہے اگر صرف پانی بہانے پر اکتفاء کیا جائے تو مقصد نہیں حاصل ہوگا۔

حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن میری امت کی

خاص پہچان یہ ہوگی کہ امت کے اعضاء وضوء، وضوء کی وجہ سے چمکتے ہوں گے۔ اس لئے وضوء میں تین باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔ دلک یعنی مل کر دھونا، اسباغ یعنی مکمل دھونا، اطالت یعنی جہاں تک دھونا فرض ہے اس سے آگے بڑھا کر دھونا تاکہ قیامت کے دن اعضاء وضوء دور تک چمکتے رہیں۔

وضوء کے بیان میں ایک لفظ آتا ہے "استنشاق" یعنی ناک میں پانی چڑھانا۔ اس کے بارے میں خصوصیت سے حکم ہے کہ ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغے سے کام لو، بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ صرف ناک سے پانی لگانا کافی سمجھتے ہیں ناک میں پانی گیا یا نہیں اس کا کوئی اہتمام نہیں کرتے، حالانکہ استنشاق کا مطلب ہے ناک میں پانی کھینچنا۔ وضوء میں اس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔

وضوء کرتے وقت کچھ لوگ دعائیں پڑھتے رہتے ہیں، ہر عضو کی الگ الگ دعا پڑھتے ہیں، کلی کرنا ہو چہرہ دھونا ہو، ناک میں پانی ڈالنا ہو حالانکہ کسی عضو کیلئے کوئی مخصوص دعا ثابت نہیں ہے، بعض دعائیں جو منقول ہیں وہ نہایت ضعیف ہیں۔ ہاں وضوء کے بعد دعاء پڑھنے کا ثبوت ہے اس لئے وضوء کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہئے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ.

(جامع ترمذی، باب ما یقال بعد الو ضوء)

امام مسلم نے بھی اس حدیث کو اپنی صحیح میں نقل فرمایا ہے، لیکن اس میں "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" کا اضافہ نہیں ہے، جامع ترمذی میں یہ اضافہ ہے اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے، لیکن شیخ البانیؒ نے کہا ہے کہ یہ اضطراب مرجوح ہے۔

(ارواء الغلیل ج ۱ص ۱۳۵ رقم ۹۶)

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ پانی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اسی پر تمام زندگیوں کا انحصار ہے، انسان اور جانور ہوں یا درخت اور پودے سب کی زندگی پانی کے وجود سے قائم ہے۔ اس لئے اللہ کی اس نعمت کی قدر اور حفاظت کرنی چاہئے اور وضوء میں کم سے کم پانی خرچ کرنا چاہئے۔ اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ جیسے جیسے وقت گذرتا جارہا ہے فراخی اور کشادگی بڑھتی جارہی ہے۔ پہلے مساجد میں وضوء کے لئے لوٹا اور ڈبہ استعمال ہوتا تھا اور پانی کم خرچ ہوتا تھا اور اب اکثر مساجد میں ٹنکی اور نل کا انتظام ہوگیا ہے، بڑی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ وضوء کرنے بیٹھیں گے تو نل کھول دیں گے اور جب تک وضوء کرتے رہیں گے علی طول پانی گرتا رہتا ہے۔ وضوء میں جہاں ایک مد پانی خرچ ہونا چاہئے وہاں پانچ مد خرچ ہوجاتا ہے یہ کھلا ہوا اسراف اور پانی کا ضیاع ہے، نبی کریم ﷺ وضوء میں ایک مد (ایک لیٹر) پانی استعمال کرتے تھے اس اسراف سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ ہر بار پانی لینے کے بعد ٹونٹی بند کردی جائے۔

نواقض وضوء:

وضوء کرنے کا طریقہ آپ کو بتادیا گیا۔ اب آپ کو یہ بتایا جارہا ہے کہ وضوء کن چیزوں سے ٹوٹتا ہے اور تازہ وضوء کرنا پڑتا ہے۔ حدیث کی روشنی میں ایسی چار چیزیں ہیں جن سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔

(۱) پیشاب اور پائخانہ کے راستہ سے کوئی چیز خارج ہوجائے تو وضوء ٹوٹ جائیگا۔ مثلاً پیشاب اور پائخانہ، ہوا، خون، منی، مذی، ودی وغیرہ کا خارج ہونا۔

دلیل! اللہ کا یہ قول ہے۔ (أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنكُم مِنَ الْغَائِطِ) یا تم سے کوئی

پیشاب یا پائخانہ سے آئے۔اور اللہ کے رسول ﷺ کی یہ حدیث ہے "لَا تُقْبَلُ صَلٰوۃُ مَنْ أَحْدَثَ حَتّٰی یَتَوَضَّأ"

(صحیح بخاری، الوضوء، باب لا تقبل صلوۃ بغیر طہور/۱۳۵)

جس شخص نے حدث کیا تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ وضوء کرلے۔اس کے علاوہ اور بھی دلیلیں ہیں۔

(۲) لیٹ کر سو جانے ، یا گہری نیند اور گہری بیہوشی سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔

دلیل نبی ﷺ کی یہ حدیث ہے۔"قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنَّ الوَضُوءَ لَایَجِبُ إلَّا عَلَی مَن نَامَ مُضطَجِعاً" بیشک جو شخص لیٹ کر سو جائے اس پر وضوء واجب ہے۔ (جامع ترمذی، باب الوضوء من النوم)

(۳) کسی کپڑے وغیرہ کے آڑ کے بغیر شرمگاہ کے چھونے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے۔

دلیل "إذَا مَسَّ أحَدُکُمْ ذَکَرَہ فَلْیَتَوَضَّأْ" جب کوئی اپنی شرمگاہ چھو دے تو اس کو وضوء کرنا چاہئے۔(مشکوۃ، بحوالہ موطا)

(۴) اونٹ کا گوشت کھانے سے بھی وضوء ٹوٹ جائیگا کچا ہو یا پکا۔

دلیل "سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الوُضُوءِ مِن لُحُومِ الإبِلِ فَقَالَ تَوَضَّؤا مِنهَا" نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا اونٹ کا گوشت کھانے سے وضوء کرنا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! اس کی وجہ سے وضو کرو۔

(جامع ترمذی، باب الوضوء من لحوم الابل)

جن چیزوں سے وضوء نہیں ٹوٹتا:

کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں مشہور ہو گیا ہے کہ ان سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے حالانکہ ان کے ناقض وضوء ہونے پر کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں پائی جاتی مثلاً۔

(۱) شافعیہ کے نزدیک مشہور ہے کہ بغیر کسی کپڑے وغیرہ کے آڑ کے عورت کو چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ عورت کو چھونے سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں!

"أَنَّ النبيَ ﷺ قَبَّلَ بَعضَ نِسَاءِہ ثُم خَرَجَ إلى الصَّلوٰۃِ وَلَم یَتَوَضَّأْ"

(جامع ترمذی،طہارۃ۔ باب ترك الوضوء من القبلة)

نبی ﷺ نے اپنی ایک بیوی کا بوسہ لیا اور نماز کے لئے نکل گئے، وضوء نہیں کیا۔

(۲) حنفیہ کے نزدیک مشہور ہے کہ بدن کے کسی حصہ سے خون بہہ جائے تو وضوء ٹوٹ جائیگا۔ حالانکہ یہ مسئلہ ثابت نہیں ہے۔ وضوء نہیں ٹوٹتا۔ دلیل یہ ہے۔ "مَازَالَ المُسْلِمُونَ یُصَلُّونَ فِی جِرَاحَاتِهِم" (صحیح بخاری، الوضوء، باب من لم یر الوضوء الا من المخرجین)

جنگوں میں مسلمانوں کو زخم آتا تھا اور اس حالت میں مسلمان نماز پڑھتے رہتے تھے (تلوار اور نیزہ کا زخم ایک دوروز میں اچھا نہیں ہوتا ظاہر ہے نماز تو چھوڑی نہیں جائیگی اسی حالت میں نماز پڑھتے رہیں گے)

(۳) الٹی ہونے سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔ منہ بھر کر ہو یا کم۔ ٹوٹنے کی کوئی دلیل نہیں۔

(۴) قہقہہ لگا کر ہنسنے سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔ نماز کے اندر ہو یا نماز کے باہر۔ احناف کا یہ ایک عجیب مسئلہ ہے وہ کہتے ہیں کہ نماز کے اندر قہقہہ لگانا ناقض وضوء ہے اور نماز کے باہر ناقض نہیں ہے۔ حالانکہ جو چیز ناقض ہوگی وہ ہر حال میں ناقض ہوگی، نماز کے اندر ہو یا باہر۔ قہقہہ سے وضوء ٹوٹنے پر کوئی دلیل نہیں ہے

(۵) مردہ کو غسل دینے سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔ اس لئے کہ ٹوٹنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(٦) حدث کا شک پیدا ہو جانے سے وضوء نہیں ٹوٹتا۔ جب تک کہ وضوء ٹوٹنے کا یقین نہ ہو جائے۔ دلیل! "لَا یَنْصَرِفُ حَتّٰی یَسْمَعَ صَوتاً أَوْ یَجِدَ رِیحاً"

(صحیح بخاری/الوضوء، باب لا یتوضاء من الشک/١٣٧)

یعنی حدث کے شک، شبہے میں نماز نہیں چھوڑنی چاہیے، یہاں تک کہ آواز سن کر یا مہک پا کر حدث کا یقین ہو جائے۔

غسل کب واجب ہوتا ہے؟

غسل کا مطلب ہے پورے بدن پر پانی ڈالنا، دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے۔

(١) "وَإِن كُنتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوا" اگر تم حالت جنابت میں ہو تو پاکی حاصل کرلو۔ (غسل کرلو) (مائدہ/٦)

(٢) ﴿فَاعْتَزِلُواْ النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلاَ تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ﴾

(بقرہ/٢٢٢)

حیض کی حالت میں عورتوں سے دور رہو، ان کے قریب نہ جاؤ۔ یہاں تک کہ پاک ہو جائیں۔

چار صورتوں میں غسل کرنا واجب ہے۔

(١) شہوت کے ساتھ منی کا خارج ہونا غسل کو واجب کرتا ہے۔ نیند میں ہو یا بیداری میں مرد ہو یا عورت۔

دلیل! "الماء من الماء" (صحیح مسلم/حیض/٨١. جامع ترمذی طہارت/ باب ماجاء ان الماء من الماء) یہ روایت احتلام پر محمول کی جائیگی۔

(٢) مرد اور عورت کی شرمگاہوں کا مل جانا غسل کو واجب کرتا ہے۔ غسل کے

وجوب کے لئے دخول کافی ہے، منی خارج ہو یا نہ ہو۔

دلیل!"إِذَا جَاوَزَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ وَجَبَ الْغُسْلُ" (جامع ترمذی/باب ماجاء اذا التقی الختانان وجب الغسل)

یعنی جب مرد کی شرمگاہ عورت کی شرمگاہ کو پار کر جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔

(۳) حیض اور نفاس کا بند ہونا غسل کو واجب کرتا ہے۔

دلیل!"فَإِذَا أَقْبَلَتِ الْحَيضَةُ فَدَعِي الصَّلٰوةَ وَإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْتَسِلِي وَ صَلِّي" (صحیح بخاری رحیض، باب اقبال المحیض وادبارہ ۳۲۰)

آپ نے فاطمہ بنت ابی حبیش سے فرمایا! جب تمہارا حیض آئے تو نماز چھوڑ دو اور ختم ہو جائے تو غسل کرو اور نماز پڑھو۔

حیض اور نفاس دونوں کا وجوبِ غسل میں ایک حکم ہے، اس لئے کہ حیض پر نفاس کا اطلاق جائز ہے، امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے۔ "باب من سمی النفاس حیضا"

(۴) موت بھی غسل کو واجب کرتی ہے۔ مردے کو نہلا کر کفن دفن کیا جائیگا۔

دلیل!"فَقَالَ إِغْسِلْنَهَا ثَلاثاً أَوْ خَمساً وَ أَكْثَرَ مِنْ ذَلكَ إِنْ رَأَيتُنَّ"

(صحیح بخاری جنائز باب غسل المیت و وضوءہ)

حضرت ام عطیہ کہتی ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی (زینب) کو غسل دے رہی تھیں تو آپ نے فرمایا کہ ان کو تین بار، پانچ بار یا اس سے زیادہ جتنا تم مناسب جانو غسل دو۔

معلوم ہوا کہ میت کو غسل دینا واجب ہے۔ مرد ہو یا عورت، شُھداء اس سے

مستثنٰی ہیں۔

مذکورہ چار صورتوں کے علاوہ غسل کرنا مسنون ہے مثلاً جمعہ کا غسل، عیدین کا غسل، احرام کا غسل اور اسلام قبول کرتے وقت اگر پاک ہے تو غسل کرنا مسنون ہے واجب نہیں ہے۔ اگر ناپاک ہے تو واجب ہے۔

غسل کے آداب:

غسل ایک طبعی اور فطری چیز ہے اس لئے مسلم، کافر، مرد، عورت، پاک، ناپاک، چھوٹے بڑے، کالے گورے سبھی لوگ غسل کرتے ہیں۔ لیکن غسل صرف بدن پر پانی بہانے کا نام نہیں ہے، مسلمانوں کے غسل اور غیر مسلموں کے غسل میں بنیادی فرق ہے۔ لیکن بہت سارے ہمارے بھائی غسل کے آداب نہیں جانتے وہ صرف میل چھڑانے، صابن لگانے اور پانی بہانے کا نام غسل جانتے ہیں۔ اگر اسی کا نام غسل ہے تو پھر ہمارے اور غیر مسلموں کے غسل میں فرق کیا رہ گیا؟ ہمارے نبی، محسن اعظم ﷺ نے غسل کو ایک عبادت کا مقام عطا فرمایا ہے اور اس کے آداب و طریقے بتلائے ہیں ذیل کی سطور میں کتاب و سنت کی روشنی میں ان آداب کو بتلایا جا رہا ہے، آپ کو چاہئے کہ غسل کرتے وقت ان آداب کو ملحوظ خاطر رکھیں۔

(۱) نیت! اس لئے کہ غسل بھی عمل شرعی ہے۔ اور ہر عمل شرعی کیلئے نیت ضروری ہے۔

(۲) سب سے پہلے دونو ہاتھوں کو دھوئیں گے۔

(۳) شرمگاہ کو اچھی طرح اپنے بائیں ہاتھ سے صاف کریں گے۔

(۴) جسم پر یا کپڑے پر کہیں نجاست لگی ہو تو اس کو صاف کریں گے۔ اور ہاتھ مٹی یا صابن سے صاف کریں گے۔

(۵) اگر صابن لگانا ہے تو صابن لگا کر بدن صاف کریں گے۔

(۶) اس کے بعد نماز کے وضوء کی طرح پورا وضوء کریں گے۔ پاؤں کو چھوڑ دیں گے غسل کے بعد دھوئیں اور اگر پختہ فرش ہے تو پہلے بھی دھو سکتے ہیں۔

(۷) اپنے سر پر پانی ڈال کر بال کی جڑوں کو تر کریں گے۔

(۸) پھر دائیں جانب سے پورے بدن پر پانی ڈالیں گے۔ اس کے بعد بائیں جانب سے پورے بدن پر پانی ڈالیں گے، اس کے بعد سر سے پورے بدن پر پانی ڈالیں گے اور بغل، پیٹھ، سینہ، وغیرہ کو جتنا مل سکتے ہیں ملیں گے اس کے بعد پورے بدن پر پانی ڈالیں گے۔

یہاں دلیل کے طور پر ہم چند حدیثوں کا ترجمہ پیش رہے ہیں جس سے اوپر کے مسائل ثابت ہو جائیں گے۔

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول ﷺ جب جنابت کا غسل فرماتے تھے تو پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو دھوتے تھے، پھر نماز کے وضوء کی طرح وضوء کرتے تھے پھر غسل کرتے اور اپنے ہاتھوں سے اپنے بال کا خلال کرتے، جب یہ اندازہ ہو جاتا کہ بالوں کی جڑیں تر ہو گئی ہیں تو تین بار اپنے بالوں پر پانی ڈالتے پھر اپنے پورے جسم کو دھوتے۔ (صحیح بخاری/غسل/باب تخلیل الشعر)

(۲) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کیلئے غسل کا پانی رکھا تو آپ نے دونوں ہاتھوں پر انڈیلا اور ان کو دو دو یا تین تین بار دھویا، پھر اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر انڈیلا اور اپنی شرمگاہوں کو دھلا اس کے بعد اپنا ہاتھ زمین پر رگڑا، پھر کلی کیا، ناک جھاڑا چہرے اور ہاتھ کو دھویا، پھر اپنے سر پر تین بار پانی ڈالا پھر پورے جسم پر ڈالا، پھر وہاں سے ہٹ کر اپنے دونوں پاؤں کو دھویا۔

(صحیح بخاری/باب تفریق الغسل والوضوء/۲۶۵)

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ جب جنابت کا غسل کرتے تو حلاب (دودھ دوہنے کا برتن) جیسے برتن میں ایک برتن پانی مانگتے پھر پانی سر کے دائیں جانب ڈالتے پھر بائیں جانب ڈالتے پھر سر کے بیچ میں ڈالتے۔

(صحیح بخاری/غسل، باب من بدأ بالحلاب أو الطیب/۲۵۸)

کیا عورت اپنی چوٹی کھولے گی؟

اس مسئلے میں دو قسم کی روایتیں ہیں اور بظاہر دونوں روایتوں میں تعارض ہے۔ پہلے صحیح بخاری کی روایت سنیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ باب باندھتے ہیں "باب نقض المرأة شعرها عند غسل المحيض" یعنی حیض کا غسل کرنا ہو تو عورت اپنے سر کا بال (چوٹی) کھولے گی۔ اس مسئلہ کے اثبات میں امام بخاریؒ نے حضرت عائشہ کی روایت پیش کی ہے۔ نبی کریم ﷺ حضرت عائشہؓ کو حکم دیتے ہیں۔ "وانقضی رأسك وامتشطی" عائشہ تم اپنا سر کھولو اور کنگھی کرلو۔ (صحیح بخاری/الحیض)

باب اور حدیث سے ثابت ہوا کہ حیض کا غسل کرنا ہو تو عورت اپنی چوٹی کھولے گی۔

دوسری روایت ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنھا کی ہے اسکو امام ترمذی نے نقل فرمایا ہے اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

حضرت ام سلمہ کہتی ہیں کہ میں نے کہا! اللہ کے رسول ﷺ میں اپنے سر کا جوڑا سخت باندھتی ہوں تو کیا جنابت کا غسل کرنا ہو تو اس کو کھول دوں آپ نے فرمایا نہیں تم کو اتنا کافی ہوگا کہ اپنے سر پر تین لپ پانی ڈال لو۔ پھر پورے جسم پر پانی ڈال

لو، پاک ہو جاؤ گی۔ (جامع ترمذی رباب ھل تنقض المرأۃ شعرھا عند الغسل)

صحیح بخاری کی روایت پر نظر کریں تو معلوم ہو گا کہ حیض یا جنابت کے غسل کیلئے عورت کو سر کی چوٹی کھولنا ضروری ہے۔ اور جامع ترمذی کی روایت پر نظر کریں تو معلوم ہو گا کہ چوٹی کھولنا ضروری نہیں ہے۔ دونوں روایتوں کی بنیاد پر علماء کا اختلاف ہے۔ لیکن مسئلہ کو اس طرح حل کریں گے کہ اصل مسئلہ بال کی جڑوں تک پانی پہچانا ہے۔ اس لئے کہ جنابت کی ناپاکی ہر بال کی جڑ تک پہنچ جاتی ہے اس لئے بال کی جڑوں تک پانی کا پہنچنا ضروری ہے۔ اب کسی کے بال کم ہوں یا چوٹی سخت نہ باندھتی ہو اور بال کھولے بغیر پانی بال کی جڑوں تک پہنچ سکتا ہے تو اس کو چوٹی کھولنا لازم نہیں ہے۔ ام سلمہ کی حدیث کا یہی مطلب ہے۔

اور اگر کسی عورت کے بال زیادہ ہوں، لمبے اور گھنے ہوں یا چوٹی سخت باندھتی ہو، اس بات کا امکان ہے کہ بغیر چوٹی کھولے پانی بال کی جڑوں تک نہیں پہنچے گا تو ایسی عورت کو چوٹی کھولنی پڑے گی۔ حضرت عائشہ کی روایت کا یہی مطلب ہے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے اسے بھی سماعت فرمالیں تو بات اور واضح ہو جائے گی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ اطلاع پہونچی کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عورتوں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ عورتیں غسل کرتے وقت اپنی چوٹی کھول لیا کریں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا! عبداللہ بن عمر بھی عجیب آدمی ہیں۔ جب چوٹی کھولنے کا حکم دیتے ہیں تو سیدھے یہی کیوں نہیں کہتے کہ عورتیں اپنا سر منڈوالیں۔ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غسل کرتی تھی۔ ایک برتن میں پانی ہوتا تھا اور صرف تین بار میں اپنے سر پا پانی بہالیتی تھی۔ (مسلم، احمد)

معلوم ہوا کہ چوٹی کھولنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں کھول لیں تو بہتر ہے۔

غسل میں کتنا پانی استعمال کریں؟

پہلے بتایا گیا کہ پانی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے پانی ہی پر ساری زندگیوں کا انحصار ہے۔ اس لئے پانی کی قدر کرنی چاہیے اور اسراف سے بچنا چاہئے۔ غسل میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ لوگ بے تحاشہ پانی گراتے ہیں۔ کنوئیں سے نکالنا ہو یا کہیں سے ڈھو کر لانا ہو تو مروت آئے۔ ٹنکی اور پائپ کا پانی ہوتا ہے نل کھول دیا اور بے حساب پانی گر رہا ہے۔ کوئی مروت نہیں۔

میرے بھائیو! غافل نہ رہیں۔ اللہ نے یہ نعمت دی ہے اور وہ دیکھ رہا ہے، پائی پائی کا وہ حساب لینے والا ہے۔

ہمارے نبی ﷺ سے زیادہ پاک اور نفاست پسند کوئی نہیں ہو سکتا ایک حدیث سماعت فرمائیں اور اندازہ کریں کہ آپ غسل میں کتنا پانی استعمال کرتے تھے۔

”كَانَ النبيُّ ﷺ يَغسِلُ أو يَغتَسِلُ بِالصَّاعِ إلَى خَمْسَةِ أمْدَادٍ و يَتَوَضَّأُ بِالمُدِّ“ (صحيح بخاری / الوضوء / باب الوضوء بالمد / ۲۰۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ غسل میں چار یا پانچ مد اور وضوء میں ایک مد پانی استعمال کرتے تھے۔

سنا آپ نے! ایک صاع کا مطلب یہ ہے کہ پانچ لیٹر کے قریب پانی آپ غسل میں استعمال کرتے تھے پیچھے ایک روایت گزر چکی ہے اس میں ”حلاب“ کا ذکر ہے حلاب اس برتن کو کہتے ہیں جس میں دودھ دوہتے ہیں دودھ دوہنے کی بالٹی کتنی بڑی ہوتی ہے ہر شخص اسکا اندازہ کر سکتا ہے زیادہ سے زیادہ پانچ چھ لیٹر کی ہوگی۔

اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ نبی ﷺ غسل میں کتنا پانی استعمال کرتے تھے اور ہم کتنا استعمال کرتے ہیں؟ ہم بے دریغ پانی خرچ کرتے ہیں۔ اللہ اس اسراف سے بچائے۔

مردے کا غسل:

مردے کو غسل دینے کا وہی طریقہ ہے جو زندوں کے بیان میں گذر چکا ہے، لیکن مردہ خود اپنا غسل نہیں دے سکتا، دوسروں کو دینا پڑتا ہے، اس لئے اس کا طریقہ الگ سے بتایا جارہا ہے۔

میت کو جب غسل دینے کا ارادہ ہو تو پہلے اس کو تخت پر لٹادیں، اس کے جسم کے تمام کپڑوں کو اتار دیں، اگر کرتا یا بنڈی ہے تو اس کو قینچی سے کاٹ کر نکال دیں، لنگی اتارنا ہو تو پہلے شرمگاہ کو دوسرے کپڑے سے ڈھانک دیں اس کے بعد لنگی کھول کر کھینچ لیں، غسل دینے سے پہلے غسل دینے والے اپنے ہاتھ پر کپڑا یا ہتھی لپیٹ لیں اس کے بعد مردے کو استنجاء کرائیں، شرمگاہوں کو صاف کریں، جسم پر اگر کہیں اور نجاست لگی ہو تو اس کو بھی صاف کر دیں، اس کے بعد آہستہ آہستہ پیٹ سہلا کر دائیں، بائیں کروٹ آہستہ سے گھمائیں، پھر سر کی جانب ہاتھ لگا کر تھوڑا اوپر اٹھائیں تاکہ اگر پیٹ میں پیشاب پاخانہ رکا ہو تو باہر آجائے اور اس کو صاف کر دیا جائے۔ اس کے بعد اگر صابن لگانا ہو تو صابن لگا کر جسم صاف کر دیں، منہ یا ناک میں پانی نہ جائے اس سے بچانے کیلئے لوگ عام طور سے روئی کا پھاہا رکھتے ہیں یہ مناسب نہیں ہے اس لئے کہ روئی بھیگ جائیگی تو پانی اندر جائیگا جبکہ پانی اندر جانے سے بچانا ہے، اس لئے موٹے کپڑے کی ایک چیٹ منہ اور ناک پر رکھ دیں۔ موٹا کپڑا اندر پانی جانے سے روک دے گا جب بدن صاف ہو جائے تو غسل دیا جائیگا۔

لیکن غسل دینے سے پہلے نماز کے وضوء کی طرح مردے کا وضوء کرائیں گے، کلی کرانا اور ناک میں پانی چڑھانا ممکن نہیں ہے اس لئے وضوء کرانے والا اپنی انگلی پانی میں تر کر کے دانتوں اور مسوڑھوں پر مل دے، اسی طرح انگلی تر کر کے ناک کے نتھنوں میں پھرا دے، اگر انگلی پر کپڑا لپیٹ لے تو اور بہتر ہے۔

میت اگر عورت ہے تو اس کے سر کی چوٹیاں کھول کر سر دھوئیں اور چوٹیوں کا بال پیچھے ڈال دیں۔

غسل دینے سے پہلے پانی میں بیر کا پتہ ڈال کر خوب پکالیں پھر اس کو سادے پانی میں ملا دیں، اسی پانی سے دو بار مردے کو غسل دیں گے اور تیسری بار سادے پانی میں کافور ملا دیں گے۔ اگر بیر والے پانی میں کافور ملا دیں تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

مردے کو تین غسل دینے کے بعد بھی ضرورت ہو تو پانچ بار اور سات بار بھی غسل دے سکتے ہیں، ضرورت کے مطابق جتنی بار غسل دینا ہو دے سکتے ہیں لیکن طاق ہونے کا خیال رکھیں۔

پہلے داہنی طرف سے غسل دیں گے وہ اس طرح کہ دایاں پہلو اوپر اٹھا کر اچھی طرح پورے جسم پر پانی ڈالیں گے، اس کے بعد بایاں پہلو اٹھا کر اچھی طرح پورے جسم پر پانی ڈالیں گے یہ ایک غسل ہو گیا، اسی طرح دو بار پورے جسم پر پانی ڈالیں، تو یہ تین بار غسل ہو گیا۔

تین بار غسل دینے کے بعد اگر میت سے نجاست خارج ہو گئی تو اس کو دھو دینا کافی ہے اگر غسل دیدیا جائے تو اور بہتر ہے۔

غسل دینے کے وقت بہت زیادہ لوگ بھیڑ لگا دیتے ہیں، اس سے پرہیز کرنا چاہئے، ہاں گھر کے لوگ رہیں تو کوئی حرج نہیں ہے بلکہ غسل دینے میں اگر ہاتھ لگا دیں تو اور بہتر ہے اس لئے کہ مرنے والے کی یہ آخری خدمت ہے۔ اگر میت سے

کوئی اچھی چیز دیکھیں مثلاً خوشبو، چہرے پر روشنی وغیرہ تو اس کو بیان کرنا چاہئے اور اگر کوئی بری چیز دیکھیں مثلاً چہرے کا سیاہ پڑنا سفید داغ یا بدبو وغیرہ تو اس کی پردہ پوشی کریں، اس لئے کہ حدیث میں مُردوں کی خوبیاں کرنے اور عیوب کی پردہ پوشی کرنے کا حکم ہے۔

مسئلہ

(۱) اگر کوئی عورت مر جائے اور وہاں عورتیں نہ ہوں جو اس کو غسل دیں، نہ شوہر ہو نہ کوئی محرم ہو تو اس عورت کو تیمم کرائیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی مرد مر جائے اور اس کو غسل دینے والا کوئی مرد نہ ہو نہ اسکی بیوی ہو تو عورتیں اس کو تیمّم کرائیں گی۔

(۲) شوہر اپنی بیوی کو اور بیوی اپنے شوہر کو غسل دے سکتی ہے۔

(۳) کافروں اور مشرکوں کی جنگ میں اگر کوئی شہید کر دیا جائے تو اس کو غسل نہیں دیا جائیگا، کپڑوں اور خون سمیت اس کو بغیر نماز جنازہ کے دفن کر دیا جائیگا۔ اس کے علاوہ تمام مردوں کو غسل دینا واجب ہے۔

(۴) مردے کو غسل دینے سے غسل دینے والے پر غسل واجب نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر غسل کر لے تو بہتر اور مستحب ہے۔ (ماخوذ، کتاب الجنائز، محدث علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ)

☆☆☆

تعارض انکار کی دلیل نہیں ہے

نکات:

(۱) حدیث میں تعارض۔

(۲) قرآن کریم کی آیات میں تعارض۔

(۳) علماء کے فتاوے اور اجتہادات میں تعارض۔

(۴) عدالت کے فیصلوں میں تعارض۔

(۵) اختلاف انسان کی فطرت ہے۔

اسلام ایک ایسا صاف شفاف مذہب ہے کہ اس کو داغدار کرنیکی ہر کوشش ناکام ہے، اس کی بنیاد ایسے پختہ اصولوں پر قائم ہے کہ اس میں تشکیک پیدا کی جاسکتی ہے نہ تذبذب، اس کے باوجود بعض مغرب زدہ مسلمان مسلم معاشرے میں ایسے مسائل کو موضوع بحث بناتے رہتے ہیں جن سے حدیث نبی کی صحت اور ماخذ شریعت کی عظمت میں تشکیک کا دروازہ کھلے۔

انکار حدیث کی بیماری کوئی نئی نہیں ہے، صرف چہرے نئے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب اخبار الاٗ حاد'' کا عنوان قائم کر کے خبر واحد کے مسئلے کو نہایت ٹھوس دلائل سے حل کیا ہے۔ امام بخاری کا اس بحث کو چھیڑنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ خبر واحد کے نام پر حدیث کے قتل عام کا سلسلہ بڑا قدیم ہے اور آج بھی اہل سنت کے ایک بڑے طبقہ میں یہ وبا پائی جارہی ہے۔ محدثین کرام نے اس بیماری کا جنازہ نکال دیا تھا لیکن انحطاط کے اس دور میں جہم واعتزال کے بہت سارے

مسائل کو جس طرح پھر سے زندہ کیا جارہا ہے اسی طرح انکار حدیث کا بھی گڑا مردہ اکھاڑا جارہا ہے، اور اسلام مخالف طاقتیں بعض مغرب زدہ اور بکاؤ مسلمان کو آلۂ کار بنارہی ہیں۔ اس سے ان کا مقصد اسلام کو نقصان پہنچانا نہیں ہے اس لئے کہ اسلام کو نقصان پہچانا ممکن ہی نہیں ہے۔ مقصد صرف مسلمانوں کی صفوں میں انتشار اور ماخذ شریعت میں تشکیک پیدا کرنا ہے۔

حدیث میں تعارض

حدیث پر ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ احادیث میں تعارض پایا جاتا ہے اس لئے حدیث کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً حدیث میں ہے ''لاعدوی ولا طیرۃ'' پھر دوسری حدیث میں ہے ''فر من الجذم کما تفر من الأسد'' پہلی حدیث میں چھوت چھات کی نفی کی گئی ہے اور دوسری حدیث میں کہا جارہا ہے کہ جذامی سے ایسے بھاگو جیسے تم شیر کو دیکھ کر بھاگتے ہو۔ جذامی سے بھاگنے کا حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ چھوت چھات کا وجود ہے، دونوں حدیثیں صحیح ہیں اور دونوں میں کھلا ہوا تعارض ہے۔ اس لئے حدیث کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کس کو لیں اور کس کو چھوڑیں؟ یہ ہے انکار حدیث کی وجہ۔

مذکورہ دونوں حدیثوں میں جو تعارض نظر آرہا ہے اس کو علماء کرام نے اور شراح حدیث نے حل کردیا ہے، حافظ ابن قیم نے زادالمعاد اور المفتاح میں، حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری اور نزھۃ النظر میں تعارض کو دور کیا ہے، بلکہ علماء کرام نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور متعارض حدیثوں کو جمع کرکے اطمینان بخش توجیہات کی ہیں۔ امام ابن قتیبہ کی کتاب ''تاویل مختلف الحدیث،، اور امام طحاوی کی

''شرح مشکل الآثار'' وغیرہ مشہور کتابیں ہیں ان کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صحیح حدیث میں تعارض ہو ہی نہیں سکتا، یہ ناممکن ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی زبان سے دو متضاد باتیں نکلیں اس لئے یہاں نقص یا تو ہماری سمجھ کا ہے یا حدیث کے پرکھنے کا۔

ہمارا موضوع متعارض حدیثوں میں تطبیق دینا نہیں ہے ان کا جواب تو دیا جا چکا ہے، آج ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ منکرین حدیث انکار کیلئے جو بہانہ تلاش کر رہے ہیں کیا عقل سلیم اسے تسلیم کر سکتی ہے؟ آیئے زمینی حقائق کی بنیاد پر اس کا جائزہ لیا جائے۔

آپ کہتے ہیں حدیث میں تعارض ہے اس لئے اس کا انکار کر دیا جائے، میں کہتا ہوں اگر تعارض ہی کسی چیز کے انکار کی دلیل ہے تو آپ کس کس چیز کا انکار کریں گے؟

(۱) قرآن کریم کی آیات میں تعارض:

جس طرح کے تعارض کا آپ نے ذکر کیا ہے اگر اسی طرح کا ظاہری تعارض قرآن پاک کی دو آیتوں کے درمیان نظر آ جائے تو بتایئے آپ کیا کریں گے؟ اور یہ یقین مانئے ایسا ظاہری تعارض قرآن کریم میں ہے۔ آیت کریمہ سنئے: ارشاد ہے ﴿فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ﴾ (۱۰۱/۲۳) دوسری آیت ہے ﴿وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ﴾ (۲۷/۳۷)

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن لوگ ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن لوگ ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ بتایئے ظاہری تعارض ہے یا نہیں؟ مزید سنئے: ارشاد

ہے ﴿وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا﴾ (۴۲/۴) دوسری آیت ہے ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ﴾ (۲۳/۶) (صحیح بخاری، کتاب التفسیر حم سجدہ)

یہاں بھی پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اللہ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے۔ دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین جھوٹ بول کر اپنے شرک کو چھپائیں گے۔ بتایئے دونوں آیتوں میں ظاہری تعارض ہے یا نہیں؟ یہاں ہم آیتوں کا تعارض نہیں دور کریں گے آپ تفسیر کا مطالعہ کریں جواب مل جائیگا اور تعارض دور ہو جائیگا۔

ہم تو آپ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر اختلاف اور تعارض ہی کسی چیز کے انکار کی دلیل ہے تو آپ قرآن پاک کو کیا کریں گے؟ جو پریشانی آپ کو حدیث کے ماننے میں آرہی ہے وہی پریشانی قرآن پاک کو ماننے میں آرہی ہے، ظاہری تعارض دیکھ کر آپ نے حدیث کا انکار کر دیا اگر یہی تعارض دیکھ کر قرآن پاک کا بھی انکار کردیں تو ایمان کیلئے آپ کے پاس بچا کیا؟ سنئے! قرآن اور احادیث صحیحہ کے درمیان تعارض ممکن ہی نہیں ہے اگر کہیں آپ کو تعارض نظر آرہا ہے تو وہ آپ کی فہم کا قصور ہے یا قلت مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

(۲) مزید سنئے: اگر اختلاف ہی کسی چیز کے انکار کا سبب ہے تو لغت کی کتابوں میں جو معانی بتائے جاتے ہیں ان میں بھی کافی اختلاف ہوتا ہے، ہر زبان کے کلمات میں معانی کا یہ اختلاف پایا جاتا ہے، عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگلش، سنسکرت، کسی بھی زبان کی لغت کی کتاب اٹھایئے آپ کو ایک لفظ کے کئی کئی معنی ملیں گے بلکہ ایک ہی کلمہ کے دو متضاد معنی ملیں گے۔ اب بتایئے اس اختلاف اور اس تضاد کیوجہ سے آپ کیا کریں گے؟ لغت کی تمام کتابوں کا انکار کردیں گے؟ سب کو

جلا ڈالیں گے؟ اگر آپ ایسا کریں یا ایسا کہیں گے تو پھر لوگ آپ کو کیا کہیں گے؟

(۳) علماء کے فتاوے اور اجتہادات میں تعارض:

آپ نے فرمایا: احادیث میں تعارض ہے اس لئے اس کا انکار کر دیا جائے گا۔ ہم پوچھتے ہیں ائمہ، محدثین، فقہاء اور علماء امت کے اقوال، فتاوے، اجتہادات اور قیاسات میں بھی اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ کے خود اپنے اقوال میں بھی اختلاف ہے۔ ان کے مشہور شاگردوں میں امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے شاگردوں نے دو تہائی مسائل میں اپنے استاد سے اختلاف کیا ہے اور پھر انھیں پر کیا بس؟ ائمہ اربعہ، فقہاء سبعہ، اور علماء امت کے اقوال اور فتاوٰں میں اختلاف کا ایک طویل سلسلہ ہے، مفسرین کے نزدیک تفسیر میں، ترجمہ میں، معانی اور بیان میں، اعراب میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں اس اختلاف کی وجہ سے حدیث، تفسیر، فقہ، اصول، مصطلح اور شروحات کی تمام کتابوں کو آپ کیا کریں گے؟ انھیں دریا برد کر دیں گے؟ امید تو یہی ہے کہ آپ ایسی بات نہیں کہیں گے، پھر یہی بات آپ حدیث کے بارے میں کیوں کہتے ہیں؟

(۴) عدالت کے فیصلوں میں تعارض

رعایا کو حق اور انصاف دلانے کے لئے دنیا بھر میں عدالتیں قائم ہیں، ان میں ہزاروں کیس زیر سماعت ہیں، عدالتیں اپنے طریقہ اور اصول کے مطابق تحقیق کرتی ہیں اور فیصلے سناتی ہیں، فیصلہ ایک کے حق میں ہو تو دوسرے کے خلاف ہوگا۔ آپ نے اپنا ایک کیس عدالت میں داخل کیا کیس چلا، بحث ہوئی، گواہ گذرے، آپ نے پوری کوشش کی فیصلہ میرے حق میں ہو اس لئے کہ میں حق پر ہوں، ساری کوشش

کے باوجود قاضی نے یا جج نے فیصلہ آپ کے خلاف سنا دیا۔ آپ کے نزدیک فیصلہ ظالمانہ تھا آپ کی حق تلفی ہو رہی تھی اس لئے آپ نے اپنا کیس دوسری عدالت میں داخل کر دیا، وہاں کیس کی دوبارہ تحقیق ہوئی، بحث ہوئی اور فیصلہ آپ کے حق میں ہو گیا، کیس ایک، مدعی اور مدعیٰ علیہ وہی، لیکن عدالت دوسری، یہاں فیصلہ بدل گیا، ہاں کا نہیں ہو گیا، ظالم مظلوم اور مظلوم ظالم ہو گیا، دونوں عدالتوں نے اپنی تحقیق کے مطابق حق ہی کا فیصلہ کیا تھا لیکن دونوں فیصلوں میں اختلاف ہے بلکہ تضاد ہے، ایک آپ کو ظالم ٹھہرا رہی ہے دوسری آپ کو مظلوم ٹھہرا رہی ہے۔ بولئے کیا کریں گے؟ اگر اب بھی آپ کو سمجھ میں نہیں آیا تو کیا دنیا کی تمام عدالتوں کو مٹا دیں گے؟ اقوام متحدہ، راجیہ سبھا، پارلیامنٹ، اسمبلی، سپریم کورٹ، ہائی کورٹ اور عدالت زیریں سب کو ختم کر دیں گے؟ اس لئے کہ ان کے فیصلوں میں اختلاف اور تضاد ہے، سب کے بعد پھر آپ کو بھی خودکشی کرنی پڑے گی اس لئے کہ آپ کی اپنی رائے بھی صبح، شام بدلتی رہتی ہے، یہ ہے آپ کی عقل پرستی کا نتیجہ۔

اختلاف انسان کی فطرت ہے:

اختلاف سے بھاگ کر آپ کہاں جائیں گے، اختلاف کا حل تلاش کیجئے، انکار کرنے سے کام نہیں چلے گا، جس اختلاف اور جس اتفاق کی آپ بات کر رہے ہیں اگر خالق کائنات نے اسی نہج پر یہ کائنات بنائی ہوتی تو آج دنیا سے تہذیب وثقافت اور عروج وترقی کا جنازہ نکل چکا ہوتا۔ بلکہ یہ لایعنی بحث کرنے کیلئے آپ کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ پوچھئے کیوں؟ تو میں آپ کو بتاؤں! آج اگر یہ اختلاف نہ ہوتا، تو جو آپ پسند کرتے وہی سب پسند کرتے، جو آپ کرتے وہی سب کرتے، جو کپڑا آپ خریدتے

وہی سب خریدتے، جو پھل آپ خریدتے وہی سب خریدتے، جس عورت کو آپ پسند کرتے، اسی کو سب پسند کرتے پھر اس کے بعد کیا ہوتا وہ آپ بتائیں؟

میرے بھائی فکروں کا اختلاف اور رایوں کا تعارض نہ رہے تو دنیا کی ساری ترقی ٹھپ ہو کر رہ جائے، یہ تو اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے انسان کی فطرت میں الگ الگ صلاحیتیں ودیعت کی ہیں، تاکہ دنیا کے کاروبار میں وسعت اور پھیلاؤ ہو، عروج اور ترقی ہو، اگر ایسا نہ ہو تو سارے لوگ ایک ہی راہ پر چل پڑتے اور عمل کا دائرہ سکڑ کر ایک نقطے پر آجاتا اس کے بعد جو اختلاف اور مارا ماری ہوتی اسے شاید آپ بھی نہ بیان کر پائیں۔

میرے بھائی: آپ نے کسی سے سن لیا کہ حدیث میں تعارض ہے بس آپ کو مسالہ ہاتھ لگ گیا اور حدیث کا انکار کر دیا۔ تعارض کہاں نہیں ہے؟ اختلاف اور تعارض کا حل تلاش کیا جاتا ہے اس کی وجہ سے کسی حقیقت کا انکار نہیں کیا جاتا ہمارے علماء کرام، محدثین عظام نے تعارض دور کرنے کے اصول اور ضابطے بنائے ہیں۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، علم حدیث کا یہ ایک مستقل فن ہے، آپ کو اگر حق کی تلاش ہے تو ان کتابوں کی طرف رجوع کریں انشاء اللہ آپ کو تشفی ہو جائیگی۔ اور ہمیشہ یہ یاد رکھیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے کلام میں اختلاف نہیں ہو سکتا، اگر آپ کو اختلاف نظر آتا ہے تو آپ کی سمجھ کا یا آپ کی تحقیق کا قصور ہے۔

اللہ تعالی ہم سب کو اختلاف و انتشار سے بچائے اور دین کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنے کی توفیق بخشے آمین۔

☆☆☆

حدیث کے بغیر قرآن کا سمجھنا ناممکن ہے

نکات:

(۱) قرآن کریم کی گواہی۔

(۲) حدیث پاک کی گواہی۔

(۳) باعتبار قرآن حدیث کی قسمیں۔

(۴) قرآن کریم پر حدیث کی تقدیم۔

(۱) قرآن کریم کی گواہی

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (النحل/۴۴)

ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) نازل فرمایا تا کہ آپ لوگوں کو کھول کھول کر بیان کر دیں ہوسکتا ہے لوگ غور وفکر سے کام لیں۔

معلوم ہوا کہ قرآن پاک کی تشریح اور توضیح آپ کا منصب ہے، قرآن پاک میں زیادہ تر احکامات ایسے ہیں جن میں اجمال ہے، ان کی تفسیر آپ کے قول اور فعل سے ہوتی ہے، کتنی باتیں ایسی ہیں جن کا صرف اشارہ قرآن پاک میں ہے لیکن اس کا حکم یا اس کا طریقہ یا اس کا واقعہ قرآن پاک میں کہیں نہیں بیان ہوا ہے آپ جب تک اس آیت کے پس منظر میں حدیث کا مطالعہ نہیں کریں گے اور حدیث کی طرف رجوع نہیں کریں گے آیت کا مطلب سمجھ ہی نہیں سکتے، اس لئے حدیث کو

مانے بغیر قرآن پاک کو نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کی چند آیتیں آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ قرآن کریم ہی کی طرح حدیث رسول بھی اللہ کی وحی اور ماخذ شریعت ہے۔

(۱) ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ﴾ (۲/۱۴۳)

جس قبلے پر پہلے سے آپ تھے اسے ہم نے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم جان لیں کہ رسول کا سچا تابعدار کون ہے؟ اور کون ہے جو ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے۔

آیت کریمہ میں تحویل قبلہ کا ذکر ہے، اختصار کے ساتھ اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کو بدل کر خانہ کعبہ کو جو مکہ میں ہے قبلہ بنا دیا۔ قبلہ اولیٰ یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کرنا اور قبلۂ ثانیہ یعنی خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرنا دونوں اللہ کے حکم سے ہے۔ دوسرے کی تفصیل آیات میں موجود ہے، لیکن بیت المقدس کو کب قبلہ بنایا گیا کس آیت کے ذریعہ بنایا گیا؟ اس کا ذکر قرآن پاک میں کہیں نہیں ہے، آیت مذکورہ میں "**جعلنا**" کا لفظ بتا رہا ہے کہ بیت المقدس اللہ کے حکم سے قبلہ بنایا گیا تھا، اگر آپ حدیث کو نہ مانیں تو "**وما جعلنا القبلة التی کنت علیها**" کا معنی واضح نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی جانب سے آپ کو احکامات دینے کا ذریعہ قرآن پاک کے علاوہ اور بھی تھا۔ اسی کو حدیث اور سنت کہتے ہیں۔

(۲) غزوہ بنونضیر کے موقع پر کھجور کے باغات جنگی راہ میں حائل ہو رہے تھے،

جنگی سہولت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے بعض درختوں کو کٹوا دیا، چونکہ کھیتی یا باغات کو نقصان پہنچانا اصول جنگ کے خلاف ہے، اس لئے یہود اور مشرکین نے واویلا مچایا کہ (نعوذ باللہ) محمد (ﷺ) کا ظلم اتنا بڑھ گیا ہے کہ درختوں کو بھی نہیں چھوڑتے ان کو بھی کٹوا دیتے ہیں، ان کے اس پروپگنڈہ کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (۵۹/۵)

آپ نے کھجور کے جو درخت کاٹ ڈالے یا جنھیں آپ نے ان کی جڑوں پر باقی رکھا یہ سب اللہ کی اجازت سے تھا۔

بلا شبہ آپ نے اللہ کی اجازت ہی سے درخت کٹوائے تھےلیکن اس آیت کے علاوہ قرآن پاک میں آپ کوئی دوسری آیت نہیں دکھا سکتے جس سے اجازت کا پتہ چل سکے اور یہ آیت تو کاٹنے کے بعد آپ کی تصویب میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے علاوہ وحی کا کوئی اور طریقہ بھی تھا جس کے ذریعہ اللہ تعالی اپنے نبی کو احکامات دیا کرتا تھا۔ وہ حدیث اور سنت ہے۔

(۳) ٦ ھ میں حدیبیہ کے سفر میں نکلنے سے پہلے آپ ﷺ نے اعلان کرا دیا تھا کہ میں عمرہ کرنے کیلئے جانے والا ہوں، جسے جانا ہو تیاری کر لے اور ساتھ میں چلے، حالات کے تناظر میں مکہ جانا گویا موت کے منہ میں جانا تھا۔ اس کے باوجود چودہ سو صحابہ پر مشتمل ایک جماعت عازم سفر ہوئی اور مصلحت پرست پیچھا دکھا گئے۔ آپ حدیبیہ پہنچے، کچھ ردوقدح کے بعد چند شرطوں پر مکہ والوں سے صلح ہوگئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے عرب میں آپ کے سب سے بڑے دشمن قریش کو خاموش کر دیا اور فتح کا

دروازہ کھول دیا۔ فتح ہوگی تو مال غنیمت حاصل ہوگا، مصلحت پرست جب یہ دیکھیں گے کہ مال غنیمت ملے گا تو شور مچائیں گے کہ ہم بھی اس جنگ میں جائیں گے، صلح حدیبیہ کے فوراً بعد خیبر کی جنگ ہونے والی تھی اور اس میں بہت زیادہ غنیمت حاصل ہونے کی امید تھی، اللہ تعالی نے اپنے نبی کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جو لوگ حدیبیہ کے غزوہ میں شریک نہیں ہوئے ہیں وہ لوگ اگلی فتح اور غنیمت میں بھی شریک نہیں ہو سکتے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ قُل لَّن تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِن قَبْلُ﴾ (۴۸/۱۵)

جب تم غنیمتیں لینے کے لئے جانے لگو گے تو فوراً یہ پیچھے چھوڑے ہوئے لوگ کہیں گے ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے، وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں۔ آپ کہہ دیجئے: کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے اللہ تعالی اسی طرح پہلے ہی فرما چکا ہے۔

آیت کریمہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ منع کر چکا ہے، اگر حدیث کو نہیں مانیں گے تو پھر وہ آیت قرآن پاک میں کہاں ہے؟ جس سے یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالی پہلے ہی منع کر چکا ہے، کوئی دکھا دے۔ اگر نہیں دکھا سکتے اور بلا شبہ نہیں دکھا سکتے تو پھر مانئے کہ قرآن کریم کے علاوہ بھی وحی کا کوئی اور طریقہ ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالی اپنے نبی ﷺ سے مخاطب ہوتا ہے۔

(۴) اللہ کا فرمان ہے ﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا

فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (التوبہ/۳۴)

جو لوگ سونا چاندی کو خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دیدو۔

آیت کریمہ میں ''کنز'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور لغوی معنی کے اعتبار سے ''کنز'' ہر اس مال کو کہا جائیگا جو زمین میں دفن کیا گیا ہو یا جمع کر کے رکھا جائے۔ خواہ کم ہو یا زیادہ ہو، زکوۃ ادا کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو، اسی لئے جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو لغوی معنی پر نظر ہونیکی وجہ سے صحابہ کرامؓ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ اس لئے کہ مال بچا کر تو ہر شخص رکھنا چاہتا ہے اور آیت کریمہ میں مال جمع کرنیوالے کو ''عذاب الیم'' کی وعید سنائی جارہی ہے۔ اس وعید سے تو کوئی نہیں بچ سکتا لیکن جب حدیث پر نظر کی گئی تو عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، حضرت جابر رضی اللہ عنہم کی روایتوں سے معلوم ہوا کہ:

''أیما مال أدیت زکوته فلیس بکنز،،

یعنی جس مال کی زکوۃ ادا کر دی جائے وہ کنز نہیں ہے۔ اشکال دور ہو گیا۔ لیکن کنز کا یہ معنی قرآن کریم میں آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔

(۵) اللہ عز وجل کا ارشاد ہے: ﴿أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ (بقرہ/۲۷۵)

اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔

دوسری آیت میں ہے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (آل عمران/۱۳۰)

اے ایمان والو: تم چند در چند کر کے سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔

دیکھئے! پہلی آیت میں مطلق ''ربوا،،کوحرام کہا گیا ہے، دوسری آیت میں ''اضعافا مضاعفة'' یعنی سوددرسود سے مقید کیا گیا ہے۔

اگر احادیث کونظر انداز کر دیا جائے تو ''ربوا،، کا معنی واضح ہی نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ''ربوا،، کا لغوی معنی مطلق زیادتی کے ہے، لہذا اطلاق کا تقاضا ہے کہ ہر قسم کی زیادتی حرام ہوخواہ وہ جائز نفع ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح اگر صرف قرآن کریم کے الفاظ کو مدنظر رکھا جائے تو وہی سود حرام ہونا چاہیئے جو ''اضعا فاً مضاعفة'' یعنی سود درسود ہو اگر اکہرا سود ہوتو حرام نہیں ہے،''اضعافا مضاعفة'' کی قید کا یہی تقاضا ہے، حالانکہ ہر قسم کا سود شریعت میں حرام ہے۔اس کا پتہ حدیث سے چلتا ہے۔

(٦) اللہ تعالی کا ارشاد ہے:﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا﴾ (المائدۃ/٣٨) چوری کرنے والے مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دو۔

قرآن پاک کا حکم عام ہے اگر آپ حدیث کونہیں مانتے تو کیا سوئی کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹ دیں گے؟ پھر اس کا ہاتھ کہاں سے کاٹیں گے؟ کلائی سے؟ کہنی سے؟ یا کندھے سے''ید'' کا اطلاق تینوں پر ہوتا ہے۔ پھر یہ بتایئے کہ دایاں ہاتھ کاٹیں گے یا بایاں کاٹیں گے؟ اس کا پتہ قرآن سے نہیں حدیث رسول سے چلتا ہے۔ ان کے علاوہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ، نکاح، طلاق اور بیع وشراء کے مسائل بھی قرآن کریم میں اجمالاً بیان ہوئے ہیں ان کی تفصیل اور توضیح آپ کو حدیث رسول میں ملے گی، اس لئے مسلمان رہتے ہوئے کوئی شخص حدیث رسول سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

ابھی تک ہم آپ کو یہ سمجھا رہے تھے کہ قرآن کریم میں احکامات کا ذکر ہے لیکن اکثر جگہ اجمال ہے تفصیل نہیں ہے یا کسی حکم اور واقعہ کی طرف صرف اشارہ ہے وضاحت نہیں ہے۔ جب ہم حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں تو قرآن کریم کے

بیان کردہ احکام کی تفصیل ملتی ہے یا واقعہ کی وضاحت ملتی ہے اور آیت کا مطلب صاف ہو جاتا ہے۔

اب آیئے ہم آپ کو کچھ ایسی حدیثیں سناتے ہیں جن میں وحی کا، کتاب اللہ کا اور حکم کا ذکر ہے لیکن قرآن کریم میں اس کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ اس سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ بھی وحی کا طریقہ تھا وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت مستقلاً ان مسائل میں بھی واجب ہے، جنھیں قرآن کریم نے تو نہیں بیان کیا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا ہے اور صحیح سند سے ثابت ہیں۔

(۲) حدیث پاک کی گواہی

حدیث سنیں: (۱) حضرت بریرہ ایک لونڈی تھیں وہ حضرت عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں اور کہا: آپ میری مدد کر دیں کہ میں اپنے مالکان کو زرمکاتبت ادا کر کے آزاد ہو جاؤں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا تمھارا کل پیسہ میں یکمشت ادا کر دیتی ہوں اور تم کو آزاد کر دیتی ہوں البتہ ''ولاء،،، یعنی آزادی کا رشتہ میری طرف منسوب ہوگا۔ حضرت بریرہ نے اپنے مالکان سے جا کر کہا۔ لیکن ان کے مالکان ''ولاء'' دینے پر راضی نہ ہوئے۔ حضرت بریرہ نے حضرت عائشہ کو اور حضرت عائشہ نے رسول اللہ ﷺ کو پورا واقعہ بتایا آپ نے فرمایا: بریرہ کو خرید کر آزاد کر دو اور ''ولاء'' یعنی نسبت آزادی کا حق اس کو ہوگا جو آزاد کرے، پھر آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا ''مَا بَالُ النَّاسِ يَشْتَرِطُونَ شُروطاً لَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ؟ مَنِ اشْتَرَطَ شَرطاً لَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَهُو بَاطِلٌ'' (صحیح بخاری/بیوع/۲۱۵۵) کیا

بات ہے کہ لوگ ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں نہیں ہیں، جو شخص ایسی کوئی شرط لگائے گا جو اللہ کی کتاب میں نہیں ہے تو وہ باطل ہوگی۔

حدیث میں کتاب اللہ کا ذکر ہے لیکن قرآن کریم کا آپ مطالعہ کر جائیے اس میں آپ کو نہ بریرہ کی آزادی کا واقعہ ملے گا نہ ''الولاء لمن اعتق'' کا فرمان ملے گا اور نہ مالکان بریرہ کی شرطوں کا بطلان ملے گا۔ یہ آپ ﷺ منصب رسالت سے فرما رہے ہیں اور اسی کو کتاب اللہ کا مقام دیا جا رہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک حدیث بیان فرمائی: اللہ تعالیٰ گودنے والیوں اور گدوانے والیوں، چہرے کے بال اکھاڑنے والیوں اور خوبصورتی کیلئے دانتوں کے درمیان کشادگی پیدا کرنے والیوں پر لعنت نازل کرے کیوں کہ یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی شکل میں تبدیلی کرتی ہیں۔

(صحیح بخاری تفسیر/۴۸۸۶)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی اس حدیث کا علم ایک عورت کو ہوا وہ آپ کے پاس آئی اور کہا: میں نے سنا ہے آپ فلاں فلاں قسم کی عورتوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''وَمَالِی لَا أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَمَنْ هُوَ فِي كِتَابِ اللهِ''

میں اس پر کیوں نہیں لعنت بھیجوں گا جس پر اللہ کے رسول نے لعنت بھیجی ہو اور جو اللہ کی کتاب کے مطابق بھی ملعون ہو۔ اس عورت نے کہا: میں نے تو پورا قرآن پڑھ لیا مگر اس میں کہیں یہ بیان مجھ کو نہیں ملا۔ آپ نے فرمایا: کیا تم کو قرآن کریم میں یہ آیت نہیں ملی ''وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا '' رسول جو تمھیں دیں اسے لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔

اس عورت نے کہا: ہاں یہ آیت تو ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ کام کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمایا ہے۔

دیکھا آپ نے: حضرت عبداللہ بن مسعود اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی لعنت کو اللہ کی لعنت قرار دے رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام وجوب اطاعت میں قرآن کریم اور حدیث رسول میں تفریق نہیں کرتے تھے، دونوں کو یکساں واجب الا طاعت مانتے تھے اور احادیث رسول کو قرآن ہی کا مقام اور مرتبہ دیتے تھے۔

(۲) حضرت یعلیٰ بن امیہ اسلام لائے تو انھیں نزول وحی کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے کا شوق ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے انھوں نے کہا: نزول وحی کی حالت میں آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کو دکھایئے اس وقت آپ جعرانہ مقام پر ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے، اتنے میں ایک دیہاتی آیا اور اس نے آپ سے سوال کیا کہ ایک شخص خوشبو لگائے ہوئے ہے اور اس کو عمرہ کرنا ہے اب وہ کیا کرے؟ رسول اللہ ﷺ تھوڑی دیر خاموش رہے اتنے میں نزول وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یعلی بن امیہ کو اشارہ کر کے بلایا اور خیمے کا کپڑا دبا کر آپ کو نزول وحی کی حالت میں دکھایا۔ آپ کا چہرہ سرخ تھا، سانس شدت وحی کی وجہ سے کھڑ کھڑا رہی تھی، پھر وحی کی کیفیت دور ہوئی، آپ نے پوچھا وہ سائل کہاں ہے؟ وہ آدمی بلایا گیا آپ نے اس سے فرمایا: اِغْسِلِ الطِّيبَ الَّذِي بِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، وَ انْزِعْ عَنْكَ الْجُبَّةَ، وَاصْنَعْ فِي عُمْرَتِكَ كَمَا تَصْنَعُ فِي حَجَّتِكَ" (صحيح بخاری / حج / ١٥٣٦)

جو خوشبو تم لگائے ہو اس کو تین بار دھولو، جو جبہ پہنے ہو اس کو اتار دو اور عمرہ

میں ویسے ہی کرو جیسے اپنے حج میں کرتے ہو۔

دیکھئے یہاں وحی کا اترنا ثابت ہے لیکن قرآن کریم میں اس وحی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ نہ عمرے کا ہے، نہ خوشبو کا، نہ خوشبو کے دھونے کا، نہ جبہ کے اتارنے کا۔ معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے علاوہ بھی نزول وحی کی صورتیں ہیں، اوران کا مقام بھی وجوب اطاعت میں وہی ہے جو قرآن کریم کا ہے "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى" (۴/۵۳)

(۳) حضرت ابوہریرہ اور زید بن خالد جہنی کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں تھے۔ اتنے میں ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے آپ سے کہا: میں اللہ کی قسم دے کے کہتا ہوں آپ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کریں، اس کے بعد اس کا فریق کھڑا ہوا جو اس سے زیادہ سمجھ دار تھا، اس نے بھی کہا اللہ کی کتاب سے ہمارے بیچ فیصلہ کریں اور بولنے کی اجازت پہلے مجھے دیجئے۔ آپ نے کہا: کہو: اس نے بیان شروع کیا اور کہا کہ میرا بیٹا اس آدمی کے یہاں مزدوری کرتا تھا، اور اس دوران اس نے اس آدمی کی بیوی سے زنا کرلیا، تو اپنے بیٹے کی جانب سے میں نے فدیہ میں ایک سو بکری اور ایک لونڈی اس آدمی کو دیا، بعد میں اہل علم سے میں نے دریافت کیا تو لوگوں نے بتایا کہ میرے بیٹے کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال کیلئے جلاوطن کیا جائیگا۔ اور اس آدمی کی بیوی کو رجم کیا جائیگا۔

نبی کریم ﷺ نے جب پوری بات سن لی تو آپ نے فرمایا: "وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللّٰهِ جَلَّ ذِكْرُهُ" قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، بلا شبہ میں تم دونوں کے بیچ اللہ جل ذکرہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔

آپ نے فرمایا: دیکھو تمھاری ایک سو بکری اور ایک لونڈی تم کو واپس ہو گی اور تمھارے بیٹے کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال کیلئے جلا وطن کیا جائے گا۔ رہی اس کی عورت تو اُنیس تم اس کے پاس جاؤ تحقیق کرو اگر وہ اعتراف کرتی ہے تو اس کو رجم کر دو۔ حضرت انیس گئے اس عورت نے اعتراف کر لیا اس لئے اس کو رجم کر دیا گیا۔ (صحیح بخاری/حدود/٦٨٢٨)

نہایت مشہور حدیث ہے۔ آپ نے پوری حدیث سن لی، اس میں دونوں فریق کہہ رہے ہیں اللہ کی کتاب کے مطابق آپ فیصلہ کریں اور خود رسول اللہ ﷺ بھی قسم کھا کر کہہ رہے ہیں کہ اللہ کی کتاب ہی سے فیصلہ کروں گا۔

اب آپ قرآن کریم میں تلاش کریں کہیں آپ کو یہ واقعہ نہیں ملے گا۔ اور آپ نے جو فیصلہ کیا وہ فیصلہ بھی نہیں ملے گا، یہاں تک کہ رجم ثابت ہے مگر وہ بھی قرآن کریم میں نہیں ملے گا۔ ہاں غیر شادی شدہ زانی کی سزا کا حکم ملے گا۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنے فیصلے کو کتاب اللہ کا فیصلہ قرار دیا اور صحابہ کرام نے بھی اسے کتاب اللہ ہی کا فیصلہ سمجھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے نزدیک اور آپ کے صحابہ کرام کے نزدیک آپ کا حکم قرآن کے حکم کے مساوی تھا۔ اور آپ کا فیصلہ کتاب اللہ کا فیصلہ تھا۔

باعتبار قرآن حدیث کی قسمیں:

عبدالوہاب خلاف نے اپنی کتاب ''علم اصول الفقہ،، میں قرآن کریم کے اعتبار سے سنت کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

(١) جو حکم قرآن کریم میں ہے بعینہ وہی حکم حدیث میں بھی ہے، جیسے نماز،

روزہ، اور حج، زکوۃ وغیرہ کا حکم قرآن میں ہے اور بعینہ وہی حکم حدیث میں بھی ہے، ایسی صورت میں حدیث قرآن کریم کی مؤید اور مؤکد ہوگی۔

(۲) کوئی حکم قرآن کریم میں اجمالاً ہے اور وہی حکم حدیث میں تفصیلاً بیان ہوا ہے، جیسے نماز، روزہ اور حج وزکوۃ کا حکم قرآن میں ہے لیکن نماز کیسے پڑھیں، روزہ کیسے رکھیں، زکوۃ کیسے ادا کریں؟ اس کی تفصیل اور طریقہ قرآن میں نہیں بتایا گیا ہے وہ آپ کو حدیث میں ملے گا، رکوع کتنا، سجدہ کتنا؟ سری کب؟ جہری کب؟ زکوۃ کتنے میں کتنی؟ سال میں ایک بار یا زندگی میں ایک بار یہ سب تفصیل آپ کو حدیث میں ملے گی، ایسی صورت میں حدیث کی حیثیت مفسر اور مبین کی ہوگی۔

(۳) حدیث میں کچھ ایسے احکامات بھی ملیں گے جو قرآن کریم میں نہیں ہیں، صرف حدیث ہی میں ہیں۔ مثلاً عورت سے حالت حیض ونفاس میں نماز معاف ہے، کتا اور درندہ حرام ہے، مردہ مچھلی اور ٹڈی حلال ہے، اسی طرح قرآن کریم نے صرف دو سگی بہنوں کو ایک ساتھ ایک نکاح میں جمع کرنیکو منع کیا ہے، جبکہ خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کو بھی ایک ساتھ جمع کرنا حرام ہے، یہ سارے مسائل قرآن کریم میں نہیں ہیں، حدیث سے ثابت ہیں مگر ساری امت ہمیشہ سے ان مسائل کو تسلیم کرتی چلی آرہی ہے، ایسی صورت میں حدیث کی حیثیت سنت منشئہ اور مثبتہ کی ہوگی۔

تینوں صورتوں میں پہلی اور دوسری صورت بالکل واضح ہے اور ان کو تسلیم کرنے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، تیسری صورت کو یہ کہکر منکرین حدیث رد کرتے ہیں کہ یہ زائد علی القرآن ہے، حالانکہ ایسے مسائل، جن کو قرآن کریم نے نہیں بیان کیا ہے صرف حدیث میں بیان کیا گیا ہے، ان کو تسلیم کرنا قرآن کریم کی آیات سے ثابت ہے۔ اس لئے کہ متعدد آیات میں اللہ تعالی نے واضح کردیا ہے کہ رسول کی اطاعت

مستقلاً ہے، اب اگر کوئی حدیث کے انھیں احکامات کو تسلیم کرے جن کو قرآن کریم نے اجمالاً یا تفصیلاً مس کیا ہے تو یہ اللہ کی اطاعت ہوئی رسول کی اطاعت کہاں ہوئی؟ آیات سماعت فرمائیں۔

(۱) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ (نساء/۵۹)

آیت کریمہ میں تین لوگوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، لیکن ''اطیعوا'' کا صیغہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لایا گیا اور ''اولی الأمر'' کے ساتھ نہیں لایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت مستقلاً ہے اور ''اولی الأمر'' کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کے ضمن میں ہے، لہٰذا رسول کی اطاعت اس امر میں بھی کی جائے گی جس کا حکم صرف آپ نے دیا ہے، قرآن کریم نے نہیں دیا ہے۔

(۲) ''وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى'' آپ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے آپ جو کہتے ہیں وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے۔

آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں بولتے آپ جو بولتے ہیں وہ اللہ کا حکم اور اللہ کی وحی ہوتی ہے، جب وحی ہے تو اس پر عمل واجب ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر ہو یا نہ ہو۔

(۳) ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (نساء:۶۵)

آپ کے رب کی قسم: لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جبتک وہ اپنے اختلافات میں آپ کو حکم نہ تسلیم کرلیں پھر اپنے دل میں آپ کے فیصلے کی جانب سے

کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اسے پورے طور سے تسلیم کرلیں۔

آیت کریمہ میں علی الاطلاق کہا جارہا ہے کہ جب تک لوگ آپ کے فیصلے کو شرح صدر کے ساتھ نہ قبول کرلیں اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے، خواہ آپ کا وہ فیصلہ قرآن کریم میں موجود ہو یا نہ ہو۔ تین آیتیں پیش کی گئی ہیں ان کے علاوہ سورہ حشر کی آیت نمبر ۷، سورہ احزاب کی آیت نمبر ۳۶ کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

(۴) قرآن کریم پر حدیث کی تقدیم:

لیجئے صحیح بخاری کی ایک حدیث سنا کر ہم بحث کرتے ہیں۔ اس حدیث سے آپ کو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ صحابۂ کرام کے نزدیک واجب الاطاعت ہونے میں قرآن وحدیث دونوں برابر ہیں۔

"جَاءَ رَجُلٌ إِلٰى ابنِ عُمَر فَقَالَ: نَذَرَ رَجُلٌ أَنْ يَّصُومَ يوماً قَالَ أُظُنّه قَالَ: الإِثْنَين، فَوَافَقَ يَوْمِ عِيدٍ، فَقَالَ ابنُ عُمر أَمَرَ اللّٰهُ بِوَفاءِ النذرِ، وَنَهى النبيُّ ﷺ عَن صَومِ هَذَا اليومِ .

(صحیح بخاری، صوم، باب صوم یوم النحر/ ۱۹۹۴)

ترجمہ: ایک شخص عبداللہ بن عمر کے پاس آیا اور کہا: ایک آدمی ایسا ہے کہ جس نے ہر سوموار کو روزہ رکھنے کی نذر مانی ہے، اتفاق سے سوموار کے دن عید پڑ گئی (اب کیا کرے؟) عبداللہ بن عمر نے جواب دیا کہ اللہ تعالی نے نذر پوری کرنے کا حکم دیا ہے اور نبی ﷺ نے عید کے دن روزہ رکھنے سے منع کیا ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا جواب خوب واضح نہیں ہے، اس لئے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہاں دو متعارض دلیلیں

جمع ہوگئی ہیں ایک دلیل تو یہ ہے کہ نذر کے بارے میں قرآن کا حکم ہے کہ اسے پوری کرو۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے اور یہ حکم نبی ﷺ نے دیا ہے۔ ظاہر ہے ایک ساتھ دونوں دلیلوں پر عمل نہیں کیا جا سکتا اور کسی کو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ لہٰذا طریقۂ عمل یہ ہوگا کہ نہی کو امر پر مقدم کریں گے، یعنی عید کے دن روزہ نہیں رکھیں گے، لیکن روزہ نذر کا ہے اور اللہ کا حکم ہے ”ولیوفوا نذورھم“ یہ امر ہے، اس امر پر عمل بعد میں ہوگا یعنی بعد میں کسی دن نذر کی قضا کریں گے۔ دونوں دلیلوں پر عمل ہو گیا۔ یہ حدیث پیش کر کے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک جلیل القدر، ذی علم صحابی رسول ہیں۔ ان کے سامنے دو دلیلیں ہیں ایک قرآن کی اور ایک حدیث کی تعارض کے وقت نہ صرف یہ کہ دونوں کو قابل حجت مانتے ہیں بلکہ حدیث رسول کو قرآن کریم پر مقدم کرتے ہیں۔ عید کے دن روزہ رکھنے کی ممانعت حدیث رسول سے ثابت ہے اور نذر پوری کرنا قرآن کریم سے ثابت ہے، لیکن فرماتے ہیں پہلے نہی پر عمل کریں گے اگرچہ وہ حدیث رسول سے ثابت ہے۔

سنا آپ نے: عبداللہ بن عمرؓ کا قرآن کے ساتھ حدیث رسول کو پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حدیث رسول صحابہؓ کرام کے نزدیک قرآن کی طرح حجت ہے۔

اے اللہ تو ہم سب کے دلوں میں قرآن و حدیث کی محبت پیدا کر اور حق کی رہنمائی فرما کہ تو ہدایت دینے اور بخشنے والا ہے۔

☆☆☆

محدثین کرام کی امانت اور صداقت

نکات:

(۱) جھوٹ ایک فطری جرم۔

(۲) محدثین کرام کا تتبع۔

(۳) محدثین کرام کا کمال احتیاط۔

جھوٹ ایک فطری جرم

جھوٹ معاشرے کا ایک طبعی اور فطری جرم ہے، انسان کی فطرت جھوٹ کا انکار کرتی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اسلام لانے سے قبل حضرت ابوسفیان نبی ﷺ کے بدترین دشمنوں میں سے تھے، جنگ احد میں مشرکوں کی کمان ابوسفیان ہی نے کی تھی، لیکن دیکھئے کفر اور اسلام دشمنی کے باوجود ان کو کذب سے کتنی نفرت تھی، ابھی اسلام نہیں قبول کیا ہے، ہرقل کے دربار میں انھیں بلایا گیا اور ہرقل نے نبی ﷺ کے بارے میں ان سے بہت سارے سوالات کئے، ایسے وقت میں آپ سے نفرت اور دشمنی کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ کو بدنام کرنے کے لئے ابوسفیان جھوٹ بول دیتے، لیکن ایک بات بھی جھوٹ نہیں کہہ سکے، جو کہا وہ سب حقیقت اور واقعہ کے مطابق تھا جھوٹ نہ بولنے کی وجہ خود انھیں کے الفاظ میں سنئے کہتے ہیں۔

فَوَ اللّٰہِ لَو لَا الحَیَاءُ مِنْ أَنْ یَّأثُروا عَلَیَّ کَذِباً لَکَذَبتُ عَنه"

(صحیح بخاری ۱/۷)

اللہ کی قسم یہ فکر دامن گیر تھی کہ آج اگر جھوٹ بول دوں گا تو قیامت تک لوگ

مجھے جھوٹا کہیں گے، ورنہ آپ کے بارے میں جھوٹ کہہ دیتا۔ اندازہ کیجئے ابوسفیان ابھی حالت کفر میں ہیں لیکن یہ گوارہ نہیں کہ جھوٹ کا داغ میرے کردار پر لگے جو کہا صحیح کہا۔

اسلام کی تعلیمات کے مطابق جھوٹ گناہ کبیرہ ہے، اس کی مذمت اور برائی قرآن وحدیث میں کثرت سے بیان کی گئی ہے، خصوصیت سے اس شخص کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے جو حدیث گھڑے، جھوٹ بولے اور نبی ﷺ کی طرف اسکی نسبت کردے۔ آپ نے فرمایا ہے۔

''مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ'' (صحیح بخاری/۱۰۷)

جس نے میرے اوپر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔ متعدد سندوں سے یہ حدیث آتی ہے اور محدثین کے بیان کے مطابق یہ حدیث تواتر کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن منکرین حدیث کا کمال دیکھیئے کہ جن راویوں نے کذب کی مذمت میں حدیثیں بیان کیں انھیں راویوں کو ان لوگوں نے کاذب اور جھوٹا کہہ دیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر وہ خود جھوٹ بولتے ہیں تو جھوٹ کی مذمت میں حدیثیں کیوں بیان کرتے ہیں؟

جھوٹے اور سچے دنیا میں ہمیشہ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، جھوٹے اور سچے اپنی خلقت سے نہیں پہچانے جاتے، جھوٹ اور سچ کے دلائل اور قرائن ہوتے ہیں جن سے تمیز کرلی جاتی ہے، کبھی اعتراف سے کبھی دعوی کی غلطی سے، کبھی قرائن اور انداز گفتگو سے، بات یہاں راویان حدیث کی چل رہی ہے، ان راویوں میں جہاں، عادل ثقہ اور صادق لوگ ہیں وہیں ان راویوں میں بعض بدعتی وضّاع اور کذّاب بھی ہیں۔ لیکن محدثین کرام نے چھان پھٹک کر کوڑا، کباڑہ سب الگ کردیا ہے، راویوں کے حالات کا

بھرپور تتبع کیا، اس کے لئے اصول اور ضابطے بنائے، مستقل فنون ایجاد کئے اسماء الرجال پر، القاب و کنیٰ پر کتابیں لکھیں، کسی راوی پر حکم لگانے سے پہلے اس کے تمام حالات زندگی کا جائزہ لیا اس کے بعد فیصلہ کیا کہ اس راوی کی حدیث قبول کی جائیگی یا نہیں؟ حدیث کی کتابیں اٹھایئے مطالعہ کیجئے تو آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ حدیث نبی کے اخذ و تحمل میں راویانِ حدیث نے کس حزم احتیاط کا ثبوت دیا ہے۔ اخیر میں ہم اس کی مثالیں پیش کر کے ان کی امانت و دیانت کو واضح کریں گے۔ (ان شاءاللہ)

یہاں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ منکرین حدیث راویانِ حدیث کو بڑی آسانی سے جھوٹا کہہ دیتے ہیں۔ فرض کیجئے اگر محدثین نے خیانت اور کذب سے کام لیا ہے تو آپ دین کو کہاں تلاش کریں گے۔ قرآن پاک کو بھی تو انھیں راویوں نے ہم تک پہنچایا ہے۔ روایت حدیث میں اگر کذب کا احتمال ہے تو انھیں راویوں نے ہم تک قرآن کو بھی پہنچایا ہے، قرآن پاک کے حفظ و نقل اور جمع و ترتیب میں بھی یہ احتمال پیدا کیا جا سکتا ہے۔ پھر دین کیلئے ہمارے پاس بچا کیا؟

محدثین کرام کا تتبع

میرے بھائیو! دین کی حفاظت کیلئے اللہ پاک نے اپنے فضل خاص سے محدثین کی جماعت کو پیدا کیا تھا، محدثین کرام جیسی عادل، صادق، امین، حافظ، ضابط، جماعت دنیا کی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ قیامت تک دیکھ سکتی ہے۔ محدثین کرام نے حدیث کی صحت اور ضعف کو جاننے کیلئے نہایت سخت اور کڑے اصول بنائے اور انھیں کی روشنی میں راویوں کے حالات کا تتبع کیا! نام کیا ہے؟ لقب کیا ہے؟ کنیت کیا ہے؟ پیشہ کیا ہے؟ باپ کون ہے؟ دادا کون؟ خاندان کون، قبیلہ کون؟ تاریخ پیدائش کیا؟

تاریخ وفات کیا؟ کہاں پیدا ہوئے؟ کہاں وفات ہوئی؟ حصول علم کے وقت عمر کیا تھی؟ سماج اور معاشرے میں ان کا مقام کیا تھا؟ اخلاق کیسے تھے؟ عقیدہ کیسا تھا؟ صدق وکذب کا حال کیا ہے؟ حفظ واتقان کی تحقیق ہوئی، سوء حفظ کی بیماری تو نہیں تھی؟ ہوٹل بازی تو نہیں کرتے تھے؟ حصول علم کیلئے کہاں کہاں کا سفر کیا؟ کب کیا؟ ایک ہی شہر کا کتنی بار سفر کیا؟ کن شیوخ سے حدیث اخذ کی؟ شیوخ کا علمی مقام کیا تھا؟ حافظہ کیسا، اخلاق کیسے؟ عقیدہ کیسا تھا؟ اس شیخ سے براہ راست سنا ہے؟ یا اس کی کتاب اور بیاض سے روایت کررہا ہے؟ اگر سنا ہے تو درس میں تنہا تھا یا دوسرے ساتھی بھی تھے؟ اگر دوسرے ساتھی بھی تھے تو عبارت خود پڑھی یا دوسرے نے پڑھی؟ یا استاد نے پڑھی؟ پھر کس عمر میں حدیث لیا۔ جوانی میں یا بڑھاپے میں؟ حدیث لی تو درس میں لی یا برسبیل تذکرہ اور راہ چلتے؟ سنا تو کیا استاد نے درسگاہ میں بیٹھنے کی اجازت دی تھی یا نہیں دی تھی؟

یہ اور ان کے علاوہ ایسی ایسی کرید اور چھان بین ہوئی کہ رواۃ کی زندگی کا کوئی پہلو مخفی نہیں رہ سکا اور اگر مخفی رہ گیا تو وہ راوی مجہول الحال قرار پایا اور اس کی روایت رد کردی گئی۔ حالات کا علم ہوا تو کسوٹی پر رکھنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ روایت قبول کی جائے یا نہیں؟

علم اسماء الرجال کی ایجاد امت محمدیہ پر اللہ کا ایک ایسا انعام ہے جس سے دنیا کی ساری قومیں محروم ہیں۔ نہایت دقت اور باریکی کے ساتھ لاکھوں راویوں کے حالات زندگی کو قلمبند کرنا محدثین کرام اور ائمہ جرح وتعدیل کا ایسا عظیم کارنامہ اور امت مسلمہ کا ایسا قیمتی سرمایہ ہے جو اس ترقی یافتہ دور میں بھی کسی قوم کو حاصل نہیں ہو سکا "ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء" حدیث رسول ہی کی صحت اور ضعف کو

جانچنے کیلئے فن مصطلح کی ایجاد ہوئی جس کے ذریعہ حدیث رسول کا معیار اور درجہ مقرر کیا گیا، حدیث کے اخذ ورد کیلئے اصول اور ضابطے بنائے گئے ایسے ضابطے جو دنیا کے تمام ضابطوں سے سخت اور کڑے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ فیصلہ اکثریت پر ہوتا ہے لیکن فن حدیث وہ علم ہے کہ یہاں فیصلہ اقلیت پر ہوتا ہے اور حکومت اقلیت کی ہوتی ہے، مثلاً کسی حدیث کے اگر پانچ طبقات ہیں اور ہر طبقے میں راویوں کی کثرت ہے لیکن کسی ایک طبقے میں صرف ایک ہی راوی ہے تو اسی ایک کا اعتبار ہوگا اور پوری حدیث پر غرابت اور تفرد کا حکم لگا دیا جائیگا۔

یہ چند باتیں بطور نمونہ آپ کی خدمت میں پیش کر دی گئیں۔ اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ محدثین کرام کی اس جماعت حقہ نے صیانت حدیث کے کیسے کیسے اصول اور ضابطے بنائے، خود کتنی محنتیں کیں، کتنے اسفار کئے، بال کی کھال نکالی، ایک ایک راوی کا بخیہ ادھیڑا۔ بتائیے اب بھی ان علماء صادقین کی صداقت اور امانت پر شبہ کیا جا سکتا ہے؟ اس کے بعد بھی اگر کسی کو اطمینان نہیں ہوتا تو میں محدثین کرام کے حزم واحتیاط اور صداقت وامانت کی چند مثالیں پیش کر کے بتاتا ہوں کہ دیکھئے محدثین کرام نے روایت حدیث میں کس کمال احتیاط سے کام لیا ہے جو رواۃ اپنے اساتذہ اور شیوخ کے بارے میں اتنے محتاط ہیں وہ رسول اللہ ﷺ پر کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں؟ یہ ناممکن ہے۔

محدثین کرام کا کمال احتیاط:

دنیا کے اندر مکہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں جدال وقتال حرام اور ناجائز ہے، یہاں

تک کہ آپ مکہ کی گھاس بھی نہیں اکھاڑ سکتے ۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ایک مخصوص وقت میں وہاں قتال کی اجازت دی تھی، مکہ کو چونکہ شرک وکفر کی آلائشوں سے پاک کرنا تھا اس لئے آپ کو یہ اجازت فتح مکہ کے موقع پر دی گئی، اس کے بعد پھر مکہ کی حرمت وعظمت واپس آگئی اور ہمیشہ کیلئے وہاں جدال وقتال ممنوع ہو گیا۔

بنوخزاعہ نبی ﷺ کا حلیف قبیلہ تھا۔ اس قبیلے کے ایک آدمی کو بنولیث قبیلے کے لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے کسی موقع سے مار ڈالا تھا۔ مکہ فتح ہوا تو بنوخزاعہ کے لوگوں نے موقع کو غنیمت جانا اور انتقام میں بنولیث کے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ نبی ﷺ کو جب پتہ چلا تو آپ نے ایک تفصیلی خطبہ دیا، خطبہ کے جس حصہ سے ہمارا استدلال ہے، ہم اس کو پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"ان اللہ حبس عن مکة القتل او الفیل" یعنی اللہ تعالیٰ نے مکہ سے قتل کو یا ہاتھی کو روک دیا۔ دیکھئے روایت میں شک کے ساتھ ہے "القتل أو الفیل" اس کے بعد امام بخاریؒ فرماتے ہیں۔

"قال محمد واجعلوہ علی الشک، کذاقال ابو نعیم القتل او الفیل" یعنی امام بخاری کہتے ہیں: اس لفظ کو شک کے ساتھ ہی رکھو، اس لئے کہ میرے استاد ابو نعیم نے ایسے ہی روایت کیا ہے "القتل او الفیل" اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں "وغیرہ یقول" الفیل" یعنی میرے استاد ابو نعیم کے علاوہ دوسرے لوگ جب روایت کرتے ہیں تو بغیر شک کے صرف "الفیل" کہتے ہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب کتابة العلم) "فیل" سے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو نبی ﷺ کی پیدائش کے سال پیش آیا تھا۔ حبشہ کے بادشاہ نے ہاتھیوں کے ذریعہ خانہ کعبہ کو ڈھانے کیلئے چڑھائی کی تھی اور اللہ نے اس کو وادی محسر میں ہلاک کر

دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ فیل میں اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے۔

سنا آپ نے: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے احتیاط اور تورع کو، دوسرے شیوخ بغیر شک کے صرف ''الفیل'' روایت کرتے ہیں لیکن ابونعیم فضل بن دکین جب روایت کرتے ہیں تو شک کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں ''القتل أوالفیل'' چونکہ یہاں روایت ابونعیم کی ہے اس لئے امام المحدثین تاکید کرتے ہیں کہ اس روایت میں شک کے ساتھ ہی پڑھا جائے اس لئے کہ میرے استاد نے ایسے ہی پڑھایا ہے۔ اگرچہ دوسرے شیوخ کی روایتوں کو سامنے رکھئے تو یہ شک دور ہو جاتا ہے۔ لیکن ابونعیم کی روایت میں بغیر شک کے پڑھنا امانت کے خلاف ہے۔ یہ ہے محدثین کرام کے صدق، امانت، دیانت، تورع اور احتیاط کی ایک مثال دوسری مثالیں سماعت فرمائیں۔

(۲) ''کتاب الادب'' ''باب یبل الرحم ببلالھا'' میں صلہ رحمی کے تعلق سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک حدیث نقل کی ہے حدیث کا لفظ اس طرح ہے ''ولکن لھم رحم أبلھا ببلائھا'' حدیث میں ''ببلائھا'' کا لفظ آیا ہے جس کا معنی واضح نہیں ہے۔ صحیح لفظ جو آیا ہے وہ ''ببلالھا'' ہے اور اس کا معنی واضح ہے۔ لیکن امام بخاری کو جو لفظ جس سند سے پہنچا ہے اسکو من وعن اسی طرح بیان کرتے ہیں۔ چاہے اس کا معنی صحیح بنے یا نہ بنے اس لئے کہ امانت کا تقاضا یہی ہے پھر امام بخاری خود ہی اسکو یوں صاف کرتے ہیں: ''قال ابو عبداللہ کذا وقع، و ببلالھا اجود واصح و ببلائھا لااعرف لھا وجھا'' یعنی ''ببلالھا'' صحیح ہے کہ اس کا معنی واضح ہے لیکن ہم کو اپنے شیوخ سے ''ببلائھا'' پہنچا ہے اس لئے ہم وہی بیان کرتے ہیں اگرچہ اس کی کوئی توجیہ نہیں معلوم۔

(۳) انس بن مالک رضی اللہ عنہ حدیث کے راوی ہیں۔ سفرِ جہاد کا ذکر ہے۔

سمندر میں کشتی پر سوار مجاہدین کو اللہ کے رسول ﷺ تشبیہ دیتے ہوئے یوں فرماتے ہیں کہ وہ اس طرح اطمینان سے سمندر کا سفر کریں گے جیسے بادشاہ اپنے تخت پر اطمینان سے بیٹھے ہوتے ہیں۔حدیث کا لفظ ہے"یرکبون ثبج هذا البحر ملوكاً على الأسرة أو مثل الملوك على الأسرة" اس حدیث میں "ملوكا على الأسرة"یا"مثل الملوك على الأسرة "ہےاس میں انس بن مالک کے شاگرد اسحاق بن عبد اللہ کو شک ہو گیااور انھوں نے اپنے شک کو بلا تأمل ظاہر کر دیا اس لئے کہ شک ظاہر نہ کرنا امانت کے خلاف تھا۔

(۴) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب جامع ترمذی میں سب سے پہلا باب قائم کرتے ہیں"باب ماجاء لاتقبل صلوة بغير طهور"یعنی بغیر پاکی کے نماز قبول نہیں ہوگی۔اس باب میں جو حدیث لائے ہیں وہ امام ترمذی کو دو شیوخ سے پہنچتی ہے(۱)قتیبہ بن سعید(۲)ھناد بن السری۔امام ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث مجھ سے قتیبہ بیان کرتے ہیں تو"بغیر طہور"کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ہناد بیان کرتے ہیں تو"الا بطہور"کا لفظ ادا کرتے ہیں۔

لفظ کوئی بھی استعمال کیا جائے مفہوم ادا ہو جاتا ہےلیکن امام ترمذی کو یہ فرق بتانے پر جس چیز نے مجبور کیا وہ ان کی امانت تھی۔

(۵) کتاب الزکوۃ"باب خرص التمر"میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کرتے ہیں اور اس حدیث میں تین قسم کا فرق بیان کرتے ہیں۔

۱۔ ایک راوی کہتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ کے قریب پہنچے اور احد پہاڑ نظر آنے لگا تو آپ نے فرمایا"هذا جبل يحبنا و نحبه" دوسرا راوی اسی کو

یوں بیان کرتا ہے''احد جبل یحبنا و نحبه دیکھئے دونوں عبارتوں میں صرف ''ہذا'' اور''احد'' کا فرق ہے۔ دونوں میں سے جو لفظ بھی ہو مفہوم ادا ہو جاتا ہے اور کوئی اختلاف بھی نہیں ہوتا۔ لیکن امام بخاری کی امانت کا تقاضا تھا کہ جس سند سے جو لفظ ملا ہے اس میں وہی لفظ بیان کریں۔

۲۔ نبی ﷺ انصار کے محلوں کی فضیلت بیان کر رہے ہیں۔ محلوں کی ترتیب ایک راوی شک کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے''ثم دور بنی ساعدة او دور بنی الحارث بن الخزرج'' دوسرا راوی بغیر شک کے یوں بیان کرتا ہے''ثم دور بني الحارث بن الخزرج ثم بني ساعدة'' امام بخاری نے دونوں کے الفاظ نقل کر دیا اس طرح شک بھی دور ہو گیا اور امانت کا حق بھی ادا ہو گیا۔

۳۔ اس حدیث میں امام بخاری کے شیخ سہل بن بکار ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حدیث بیان کرتے کرتے ابن بکار جب اس مقام پر پہنچے کہ ''رسول اللہ ﷺ جب مدینہ کے قریب پہنچے'' تو میرے استاد ابن بکار نے جو لفظ استعمال کیا اس کو میں ٹھیک سے نہیں سن سکا اس لئے مجھے شک ہے لیکن اس کا مفہوم یہ ہے ''اشرف علی المدینة'' امام بخاری کو اپنے استاد کے کلمے میں شک تھا لیکن اس شک کے اظہار کو بھی انھوں نے امانت کا تقاضا سمجھا۔ شیخ کے کلمات کی ادائیگی میں احتیاط کا یہ کمال ہے تو حدیث رسول میں احتیاط کا کیا مقام ہوگا؟

(۶) جہنم کی گہرائی کے بارے میں ایک حدیث ہے جس کو حسن بصری، صحابی رسول عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں یہ حدیث بیان کرنے کے بعد امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حسن بصری کا سماع عتبہ بن غزوان سے ثابت نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ واقعہ بصرہ کے منبر کا ہے اور عتبہ بن غزوان بصرہ حضرت عمر

کے اخیر زمانے میں آئے تھے اور حسن بصری کی پیدائش حضرت عمرؓ کی شہادت سے دو سال پہلے ہے۔ اب تاریخ ملائیے تو معلوم ہوگا کہ عتبہ بن غزوان جب بصرہ آئے تھے اس وقت حسن بصری کی عمر زیادہ سے زیادہ دو سال رہی ہوگی، دو سال کا بچہ حدیث لینے کا اہل نہیں ہوتا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی سند کے اندر تاریخی اعتبار سے جو کمزوری تھی اسے واضح کر دیا۔ اور یہ بتا دیا کہ اس روایت کے اندر انقطاع ہے۔ جبکہ حدیث کا مضمون فی نفسہ صحیح ہے۔

(جامع ترمذی، باب ماجاء فی صفة قعر جهنم/ ۲۷۰۱)

(۷) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ''کتاب المناقب'' باب قول النبی ﷺ **اللهم امض لاصحابی هجرتهم. الخ**'' میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ اس حدیث میں امام بخاری کے تین شیخ ہیں اور الفاظ حدیث میں معمولی سا فرق کرتے ہیں۔ ایک استاد بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں ''**ان تذر ذریتک**'' اور دو استاد بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں ''**ان تذر ورثتک**'' لفظ کا فرق ہے معنی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود امام بخاری کی امانت تھی کہ انھوں نے اپنے شیوخ کے اختلافِ لفظ کو بیان کر دیا'' **و قال احمد بن یونس و موسی عن ابراهیم ''ان تذر ورثتک''**

(۸) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ایک باب قائم کرتے ہیں: ''باب المندیل بعد الوضوء'' اس باب میں ایک حدیث ذکر کرتے ہیں اور سند یوں بیان کرتے ہیں:

''**قال حد ثنا جریر قال حد ثنیه علی بن مجاهد عنی**'' یعنی آگے جو حدیث آرہی ہے اس کو پہلے جریر نے علی بن مجاہد سے بیان کیا تھا لیکن بعد میں جریر وہ حدیث بھول گئے تو علی بن مجاہد نے وہ حدیث ان کو سنائی۔ گویا پہلے مرحلے میں جریر استاد اور

علی شاگرد تھے لیکن بھول جانے کے بعد دوسرے مرحلے میں علی استاد اور جریر ان کے شاگرد ہو گئے۔ غور کیجئے اللہ کے رسول کی حدیث راویان حدیث کتنی ایمانداری سے بیان کرتے ہیں اپنی ہی بیان کی ہوئی حدیث اگر بھول گئے اور شاگرد نے بعد میں وہ حدیث اپنے استاد کو سنائی اور یاد دلائی تو بیان کرتے وقت استاد نے اس حدیث میں اپنے شاگرد کو استاد تسلیم کرلیا۔ اور اس میں اپنی کوئی کسر شان نہیں سمجھی۔

(۹) ''کتاب الصلح'' میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاد مسدد بن مسرہد سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں۔ اخیر میں کہتے ہیں: ''قَالَ اَبُو عَبدِاللّٰہ هٰذا مَما انتَخَبْتُ مِن مُسددٍ قَبْلَ أنْ يَجْلِسَ وَ يُحَدِّثَ'' مسدد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شیوخ میں سے ہیں۔ لیکن یہ حدیث امام بخاری نے ان سے اس وقت حاصل کی تھی جب وہ مسند درس پر باقاعدہ بیٹھے نہیں تھے۔ اگر امام بخاری اس کی وضاحت نہیں کرتے تب بھی حدیث کی صحت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ مسدد تو ان کے استاد تھے ہی۔ لیکن یہ بتا دینا کہ یہ حدیث مسند درس سنبھالنے سے پہلے کی ہے ان کی کمال امانت کی دلیل ہے۔

(۱۰) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الوصایا'' میں ایک حدیث نقل کی ہے یہ حدیث امام بخاری کو چار شیوخ سے پہنچتی ہے اور یہ چاروں شیوخ امام مالک کے شاگرد ہیں۔

امام بخاری کے ایک استاد عبداللہ بن مسلمہ جب یہ حدیث بیان کرتے تو لفظ شک کے ساتھ بیان کرتے ہیں: ذلک مال رابح أو رایح'' اور باقی شیوخ بغیر شک کے یوں بیان کرتے ہیں ''ذلک مال رایح'' یاء کے ساتھ دیکھئے تین استاد بغیر شک کے بیان کرتے ہیں صرف ایک استاد شک کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ لیکن

امانت اور سچائی کا تقاضا تھا کہ جس استاد نے جس لفظ کے ساتھ بیان کیا ہے اسکو اسی طرح بیان کیا جائے۔ اگر چہ یہ شک باقی تین شیوخ کے بیان سے دور ہو جاتا ہے۔

(۱۱) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ "باب الوضوء من القیئ والرعاف" میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ اس حدیث میں امام ترمذی کے دو استاد ہیں (۱) ابوعبیدہ بن ابی السفر (۲) اسحاق بن منصور۔ اور یہ دونوں شاگرد ہیں عبدالصمد بن عبدالوارث کے۔ لیکن ابوعبیدہ اپنے استاد سے روایت کرتے ہیں تو "حدثنا" کا لفظ استعمال کرتے ہیں یعنی لفظ تحدیث کی صراحت کرتے ہیں اور اسحاق جب اپنے استاد عبدالصمد سے روایت کرتے ہیں تو "اخبرنا" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ "حدثنا" کہیں یا "اخبرنا" کہیں۔ حدیث کے مفہوم یا صحت وضعف میں کوئی فرق نہیں پڑتا یہ محدثین کرام کے اصطلاحی کلمات ہیں۔ کوئی ان میں فرق مانتا ہے اور کوئی نہیں مانتا۔ لیکن امام ترمذی کی امانت کا تقاضا تھا کہ جس استاد نے تحدیث کی صراحت کی اس کو اور جس نے اخبار کی صراحت کی اسکو الگ الگ بیان کر دیں۔

یہ ہے راویان حدیث کی امانت، دیانت، ورع، صدق مقال اور کمال احتیاط کی چند مثالیں۔ جو اپنے شیوخ سے سنے ہوئے الفاظ میں بھی کسی طرح کا تغیر گوارہ نہیں کرتے۔ بھلا حدیث رسول میں ان سے کذب کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جس شیخ سے جو لفظ سنا وہی دہرا دیا اس کا معنی واضح ہو یا نہ ہو۔ جس نے "ببلائہا" کہا اسکو بھی بتایا اور جس نے "ببلا لھا" کہا اسکو بھی بتایا۔ جس نے "حدثنا" کہا اس سے "حدثنا" نقل کیا اور جس نے "اخبرنا" کہا اس سے "اخبرنا" نقل کیا۔ جس نے بغیر "طہور" کہا اسکو بھی بتایا۔ اور جس نے "الا بطہور" کہا اس کو بھی بتایا۔

یہ چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں اس طرح کی مثالوں سے

حدیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ ان مثالوں سے آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ محدثین کرام نے سند اور متن حدیث کی ادائیگی میں جس کمال احتیاط اور صدق و امانت سے کام لیا ہے اس کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی، اپنے اساتذہ اور شیوخ سے جو سنا وہی بیان کیا، صحیح ہے یا غلط، ناقص ہے یا تمام، واضح ہے یا غیر واضح، شک ہے یا یقین اس سے بحث نہیں جو سنا اس کو بیان کر دیا، حدثنا اور حدثنی، اخبرنا اور اخبرنی، انبانا اور اَنبأنی کا فرق بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا، اگر مجلس درس میں سنا تو حدثنا اور اگر بر سبیل تذکرہ سنا تو ''قال لنا'' کے الفاظ استعمال کریں گے۔ اگر کسی وجہ سے درسگاہ میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس شیخ سے حدیث لینے کا شوق تھا تو پردے کے پیچھے سے یا چوکھٹ پر بیٹھ کر سنا اور تحدیث کے وقت یوں کہا!"قراءۃ علیہ وأنا أسمع" غور فرمایئے! محدثین کرام حدیث بیان کرتے وقت کس حزم و احتیاط کا لحاظ کرتے ہیں آپ دنیا کی پوری تاریخ کھنگال ڈالئے تورع کی یہ مثال کہیں نہیں ملے گی۔ اس صدق مثال کے بعد اگر کوئی ہٹ دھرم، مغرب زدہ یہ کہتا ہے کہ راویان حدیث جھوٹے تھے تو ہم اس سے یہی کہیں گے کہ محدثین کرام جیسا کوئی علمی کارنامہ تم نے یا تمہارے باپ، دادا نے کیا ہے تو سامنے لاؤ۔ ورنہ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ:

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِن يَقُولُونَ إِلَّا كَذِباً﴾

(سورہ کہف/٥)

☆☆☆

آسان نکاح

نکات!

(۱) شادی قرآن کی تعلیم پر۔

(۲) شادی قبول اسلام پر۔

(۳) شادی صرف آزادی پر۔

(۴) دعوت ولیمہ۔

(۵) فیصلہ آپ کے اوپر۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿وَأَنكِحُوا الْأَيَامَى مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (النور:۳۲)

ترجمہ! اے مومنو! تم میں جو غیر شادی شدہ ہیں ان کی اور تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں جو نیک ہیں ان کی شادی کردو، اگر وہ فقیر ہونگے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کرسکتا ہے، اللہ بڑی وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔

آیت کریمہ میں شادی اور نکاح کی ترغیب دی جارہی ہے، اولیاء کو حکم ہے کہ ان کے ماتحت اور زیر کفالت لوگ اگر شادی کے لائق ہو گئے ہیں اور شادی نہیں ہوئی ہے تو ان کی شادی کردیں اور اس ترغیب کو اس حد تک مؤکد کیا گیا کہ غربت اور فقروفاقہ شادی کے لئے مانع نہیں ہے، آدمی اپنی غربت کی وجہ سے سوچ سکتا ہے کہ میں خود اپنا پیٹ نہیں پال سکتا تو بیوی، بچوں کا خرچ کہاں سے لاؤں گا؟ اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو دور فرمادیا کہ روزی کی کشادگی اور تنگی میرے اختیار میں ہے اس کا تعلق کسی

انسان سے نہیں ہے، اس لئے بہت ممکن ہے کہ شادی کے بعد اللہ تعالیٰ تمہاری روزی میں کشادگی پیدا کردے، اس لئے غربت کو شادی کے لئے مانع نہ بناؤ۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ شادی کے بعد کشادگی آہی جائے بہت سارے فقراء کو دیکھا جاتا ہے کہ شادی کے بعد ان کا فقر نہیں دور ہوا۔ اس لئے مفسرین اس کے وقوع کو اللہ کی مشیت کے ساتھ مقید مانتے ہیں۔

شادی کی ترغیب اور نکاح کا حکم قرآن پاک کی دوسری آیات میں بھی دیا گیا ہے، احادیث رسول میں مزید وضاحت کے ساتھ شادی کی ترغیب دی گئی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری کتاب النکاح میں سب سے پہلا باب جو قائم کیا ہے وہ "الترغيب في النكاح" یعنی نکاح کی رغبت دلانے کا باب۔ اور باب کے اثبات میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان پیش کیا ہے:

"فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي"

یعنی نکاح میری سنت ہے اس لئے اگر کوئی میری سنت سے اعراض اور انکار کرے گا تو وہ میری جماعت سے باہر ہے۔ گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث پیش کر کے صرف نکاح کی ترغیب ہی پر نہیں اکتفاء کرنا چاہتے بلکہ یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ اس سنت سے اعراض سخت وعید کا باعث ہے ایسا آدمی سنت نبی سے یا یوں کہئے اسلام سے باہر سمجھا جائے گا۔

نکاح کے حکم اور ترغیب میں آزاد، غلام، مرد اور عورت سب شامل ہیں، اللہ کا یہ پاکیزہ نظام ہے اس سے نسل انسانی بڑھتی اور پھیلتی ہے، لہذا جو کوئی اللہ کے اس نظام کے خلاف کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو وہ اللہ کا نافرمان اور باغی تصور کیا جائے گا۔

نکاح کے ضمن میں بہت سارے مسائل سامنے آتے ہیں، طلاق، خلع،

لعان، سکنی، مہر، عدت، رضاعت اور کفاءت وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو توجہ طلب ہیں، لیکن آج ہم صرف نکاح کے تعلق سے کچھ باتیں آپ کے گوش گذار کرنا چاہیں گے، اور صرف چند حدیثیں پیش کر کے یہ فیصلہ آپ کے اوپر چھوڑ دیں گے کہ نبی ﷺ نے جو بوجھ ہماری گردن سے اتار کر نکاح کو آسان کیا تھا اس کو ہم نے کس طرح مہنگا اور مشکل بنا کر اپنے کندھے پر لا دلیا ہے۔ اور اس بوجھ سے آج پورا معاشرہ کراہ رہا ہے۔

شادی قرآن کی تعلیم پر:

صحیح بخاری کتاب النکاح کی حدیث ہے اللہ کے نبی ﷺ کے مشہور صحابی حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں اور حدیث الواھبہ کے نام سے یہ حدیث مشہور ہے۔

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ اپنی مجلس میں تشریف فرما تھے اتنے میں ایک عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے کہا! "یا رسول اللہ جِئتُ أھبُ لَکَ نَفسی" اے اللہ کے رسول میں اس لئے آئی ہوں کہ اپنا نفس آپ کے حوالہ کر دوں۔ (یہ مسئلہ کہ آپ کے علاوہ کوئی عورت اپنا نفس کسی کے حوالے کر سکتی ہے یا نہیں ابھی صاف کر دیا جائے پہلے حدیث سنیں) نبی ﷺ نے اس کی پیش کش سنی اور نظر اٹھا کر اس کو نیچے سے اوپر تک دیکھا پھر اپنا سر نیچے کر لیا۔ اس عورت نے جب دیکھا کہ آپ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر رہے ہیں تو بیٹھ گئی۔ اس مجلس میں اور لوگ بھی تھے ان میں سے ایک صحابی اٹھے اور انہوں نے کہا! اللہ کے رسول آپ کو ضرورت نہیں ہے تو مجھ سے شادی کر دیجئے:

آپ نے اس سے پوچھا تمہارے پاس مہر دینے کے لئے کچھ ہے؟ اس نے کہا! اللہ کے رسول! اللہ کی قسم کچھ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا! گھر جا کر دیکھو کچھ ملتا

ہے یا نہیں؟ وہ گھر گیا اور واپس آ کر بتایا اللہ کی قسم کچھ نہیں ملا: رسول اللہ ﷺ نے اس سے کہا! پھر جاؤ، لوہے کی ایک انگوٹھی ہی ملے تو اسی کو لے کر آؤ۔ وہ آدمی پھر گیا اور واپس آ کر کہا! اللہ کی قسم اللہ کے رسول لوہے کی انگوٹھی بھی نہیں ہے۔ ہاں میری یہ لنگی ہے۔ آدھی اس کو دیدوں گا۔ آپ نے فرمایا! پھاڑ کے کیا کرو گے (کسی کے کام نہیں آئے گی) اور پوری اگر تم استعمال کرو گے تو اس کو نہیں ملے گی وہ استعمال کرے گی تو تم کو نہیں ملے گی۔ یہ سن کر وہ آدمی بیٹھ گیا، جب دیر ہوگئی تو اٹھ کر جانے لگا۔ نبی ﷺ نے جاتے ہوئے دیکھا تو اس کو بلوایا۔ آپ نے اس سے کہا! یہ بتاؤ قرآن تمہیں یاد ہے؟ اس نے کہا! ہاں! فلاں فلاں سورہ یاد ہے گنا دیا۔ آپ نے پوچھا یہ بتاؤ زبانی یاد ہے۔ اس نے کہا! ہاں آپ نے فرمایا! جاؤ میں نے اس عورت کو تمہارے نکاح میں دیا اس کو قرآن یاد کرا دینا (یہی مہر ہوگا)۔ (صحیح بخاری، نکاح، باب تزویج المعسر)

ابھی آپ نے سنا کہ ایک عورت نے اپنا نفس نبی ﷺ کو ہبہ کرنیکی پیش کش کی تھی۔ یہ سن کر آپ کو شبہ ہوسکتا ہے کہ اس طرح ہبہ کرنا اگر نبی کریم ﷺ کیلئے جائز ہوسکتا ہے تو ہمارے لئے بھی جائز ہوگا۔

میرے بھائیو! ایسا نہیں ہے۔ اللہ کی جانب سے آپ کے لئے یہ خصوصی اجازت تھی۔ آیت کریمہ سنیں، اللہ جل شانہ فرماتے ہیں۔

﴿وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الاحزاب:۵۰)

ترجمہ! اور وہ باایمان عورت جو اپنا نفس نبی ﷺ کو ھبہ کردے (تو نبی ﷺ کے لئے حلال ہے) یہ اس صورت میں ہے جبکہ خود نبی ﷺ بھی اس سے نکاح کرنا چاہیں اور یہ خاص طور سے آپ کے لئے جائز ہے نہ کہ اور دوسرے مومنین کے لئے۔

قرآن مجید کی مذکورہ آیت کریمہ سن کر آپ کا شبہ دور ہوگیا ہوگا۔ ھبہ کا مسئلہ

نبی ﷺ کے ساتھ خاص تھا۔

یہ حدیث سن کر کسی کے دل میں یہ وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ عورت نہایت حیادار ہوتی ہے وہ کبھی ایسی بات کھل کر کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ اس عورت نے کیسے نبی ﷺ سے سب کے بیچ میں ایسی پیش کش کر دی۔

میرے بھائیو! آپ کا یہ وہم بجا ہے اطمینان کے لئے میں صحیح بخاری ہی کی ایک اور حدیث سنا دیتا ہوں ان شاء اللہ آپ کا یہ وہم دور ہو جائے گا۔

ثابت بنانی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضرت انس رضی اللہ کے پاس تھے اور ان کے پاس ہی ان کی بیٹی اُمینہ بھی تھیں۔ حضرت انس نے واھبہ کا قصہ بیان کیا۔ واقعہ سن کر ان کی بیٹی نے کہا، ''مَا اقَلَّ حَيَائَها'' بڑی بے شرم عورت تھی۔ حضرت انس نے کہا! ''هِيَ خَيْرٌ مِنْكِ'' وہ تم سے بہت اچھی تھی۔ تمہیں پتہ نہیں اس نے کس کو پسند کیا تھا؟ نبی ﷺ کو پسند کیا تھا اور اپنے نفس کو ان کے حوالے کرنا چاہا تھا۔ (صحیح بخاری، نکاح، باب عرض المرأۃ نفسها علی الرجل الصالح/ ۵۱۲۰)

صحابہ کرام کے بیچ اس عورت کا پیش کش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو نبی کریم ﷺ سے بے پناہ عقیدت تھی اور اسی عقیدت نے پیشی پر مجبور کیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ آپ سے جتنی زیادہ عقیدت اور محبت ہوگی اتنا ہی زیادہ اس کا ایمان پختہ ہوگا اور اس کے لئے خیر ہوگا۔ امید ہے کہ آپ کا وہم دور ہو گیا ہوگا۔ یہاں معاملہ حیا اور عدم حیا کا نہیں ہے، معاملہ آپ سے عقیدت اور محبت کا ہے۔ اسی لئے یہ مسئلہ آپ کے ساتھ خاص ہے، ہمارا موضوع تھا آسان نکاح۔ حدیث سے آپ کو علم ہو گیا ہوگا کہ اسلام کے نظام میں نکاح اتنا آسان ہے کہ اگر مہر کے لئے لوہے کی معمولی سی انگوٹھی بھی ہے تو اس پر نکاح کر دیا جائے گا اگر وہ بھی نہیں ہے تو صرف قرآن کی تعلیم پر نکاح پڑھایا جا سکتا ہے اور شادی کی جا سکتی ہے۔

اس حدیث سے علما نے بہت سارے مسائل کا استنباط کیا ہے۔دو چار آپ بھی سن لیں۔

(۱) مہر کے لئے مال کا ہونا ضروری نہیں، ہر وہ حلال چیز مہر مقرر کی جا سکتی ہے جس سے عورت دنیا یا آخرت کا کوئی فائدہ حاصل کر سکے۔

(۲) خود عورت کسی نیک آدمی سے شادی کا پیغام دے سکتی ہے۔

(۳) شادی سے پہلے عورت کو دیکھا جا سکتا ہے۔

(۴) غربت شادی کے لئے مانع نہیں ہے۔

(۵) شوہر یا بیوی کے انتخاب میں صالحیت اور دینداری معیار ہے۔

نکاح قبول اسلام پر:

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ام سلیمؓ (میری ماں) پہلے اسلام لا چکی تھیں اور ابوطلحہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔انہوں نے ام سلیمؓ کو شادی کا پیغام دیا تو ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا ابوطلحہ تم جیسے آدمی کا پیغام ٹھکرایا نہیں جا سکتا لیکن تم کافر ہو اور میں مومنہ ہوں۔کفر کی حالت میں تم سے شادی کرنا میرے لئے حلال نہیں ہے تم اسلام قبول کرلو تو شادی کرلوں گی اور تمہارا اسلام لانا ہی میرا مہر ہوگا اس کے علاوہ اور کوئی میرا مطالبہ نہیں ہوگا۔چنانچہ وہ مسلمان ہو گئے اور ان کا اسلام لانا ہی مہر ٹھہرا۔ (سنن نسائی، نکاح، التزویج علی الاسلام)

ام سلیم مدینہ کی معزز خاتون تھیں نبی کریم ﷺ جب کبھی ان کے دروازے سے گذرتے تو ام سلیم سے بغیر ملے نہیں جاتے رشتے میں آپ کی خالہ ہوتی تھیں اور آپ کو بیحد مانتی تھیں، نہایت ہشیار، چالاک اور منتظم کار تھیں، دینی مسئلے مسائل بڑے شوق اور بڑی بے باکی سے پوچھا کرتی تھیں، اپنی ہوشیاری، دینداری اور حسن انتظام

کی وجہ سے مدینہ کی نامی گرامی عورتوں میں تھیں اگر وہ چاہتیں تو اونچے سے اونچا مہر پا سکتی تھیں۔ادھر ابوطلحہ بھی مدینہ کے بہادر اور بہترین تیراندازوں میں سے تھے۔ جنگ احد میں تیر چلاتے چلاتے تین کمانیں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی تھیں، نبی ﷺ کے آگے کھڑے ہو کر آپ کے لئے ڈھال بنے ہوئے تھے جب نبی کریم ﷺ اُچک کر دشمنوں کی طرف دیکھتے تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کہتے! اللہ کے رسول نہ دیکھئے، " نحری دون نحرک " میرا سینہ آپ کے آگے ہے اگر دشمنوں کا تیر آئیگا تو میرے سینے پر لگے گا۔ آپ اُچک کر تاکیں گے تو آپ کو لگ جائے گا۔ سبحان اللہ کیا فداکاری تھی۔

خود ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ایک حدیث میں بیان کرتے ہیں کہ مدینہ میں کھجور کا باغ سب سے زیادہ میرے پاس تھا۔ معلوم ہوا مالدار آدمی تھے۔ اگر ام سلیم کثیر مہر کا مطالبہ کرتیں تو وہ ادا کر سکتے تھے، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اسلام قبول کرنا ہی کافی تھا کیوں؟ اس لئے کہ اسلام سادگی اور آسانی کو پسند کرتا ہے۔

شادی صرف آزادی پر:

ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا خیبر کے سردار حُیی بن اخطب کی بیٹی تھیں جب خیبر فتح ہوا تو قیدیوں کے ساتھ یہ بھی قید ہو کر مسلمانو کے قبضہ میں آئیں، ابھی نئی نئی شادی ہوئی تھی نہایت حسین و جمیل تھیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا! اللہ کے رسول مجھے قیدیوں میں سے ایک لونڈی دیدیجئے۔ آپ نے فرمایا! جاؤ، ایک لونڈی لے لو، انہوں نے چھانٹ کر صفیہ بنت حُیی کو لے لیا۔ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا اللہ کے رسول (ﷺ) صفیہ بنت حُیی جو بنی قریظہ اور نضیر دونوں قبیلوں کی شہزادی ہیں انہیں دحیہ کو دیدیا ہے وہ تو

آپ کے لئے مناسب ہیں (عزت، مصلحت کا یہی تقاضہ ہے) آپ نے فوراً حکم دیا دحیہ کو بلاؤ وہ صفیہ رضی اللہ عنہا کو لیکر آئے۔ آپ نے جب صفیہ کو دیکھا تو فرمایا! صفیہ کو چھوڑ کر کسی اور کو لے لو اس کے بعد جب مدینہ کے لئے روانگی ہوئی تو آپ نے صفیہ کو آزاد کر دیا اور ان سے شادی کر لی۔

ثابت بنانی کہتے ہیں میں نے حضرت انسؓ سے پوچھا! ان کا مہر کیا مقرر کیا؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا! آزاد کرنا۔ اس کے بعد ان سے شادی کر لی۔ راستے میں ام سلیم نے صفیہ کی رخصتی کا انتظام کیا اور رات میں آپ کے پاس پہنچا دیا۔ صبح ہوئی تو آپ نے چمڑے کا دستر خوان بچھا دیا اور اعلان کر دیا کہ جس کے پاس کھانے کی جو چیز ہو لیکر آئے۔ اب کوئی پنیر لیکر آ رہا ہے کوئی کھجور لا رہا ہے، کوئی گھی لا رہا ہے لوگوں نے سب کو مل کر مالیدہ تیار کر دیا۔ (آپ نے لوگوں سے کہا کھاؤ) یہی رسول اللہ ﷺ کی شادی کا ولیمہ تھا۔

یہ روایت صحیح بخاری میں متعدد سندوں سے مذکور ہے لیکن ہم نے "سنن نسائی۔ نکاح۔ البناء فی السفر" سے لیا ہے۔

آپ نے سنا کہ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنھا قید ہو کر آئیں تھیں، لونڈی تھیں، نبی کریم ﷺ نے ان کے مقام و مرتبہ اور عزت و وجاہت کی رعایت کرتے ہوئے ان کو آزاد کر دیا اور اپنی ازواج مطہرات میں شامل کر لیا لیکن مہر میں نہ کوئی مال ہے نہ کوئی سامان ہے؟ آزاد کرنا ہی ان کا مہر ہے، اسی طرح اس شادی میں آپ کا ولیمہ کیا تھا؟ آپ نے سنا کہ ایک دستر خوان بچھا دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا جس کے پاس کھانے کا جو سامان ہے لیکر آئے، سننا تھا کہ فوراً جس کے پاس جو موجود تھا لا کر دستر خوان پر ڈال دیا۔ سب کو ملا دیا گیا اور حکم ہوا کھاؤ۔ کتنا آسان اور کتنا سستا ہے ولیمہ؟ مہر اور ولیمہ دونوں کی مثال اس حدیث میں موجود ہے اب آپ اپنے سماج

اور معاشرے میں رائج دعوت طعام یا دعوت ولیمہ پر نظر کریں اسی طرح مہر کی مقدار کا موازنہ کریں اور خود فیصلہ کریں کہ شادی بیاہ میں ہمارا معاشرہ کتنی مشقتیں اٹھاتا ہے اور کتنے تکلفات کرتا ہے۔اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ کیا ہے؟اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

دعوت ولیمہ:

شادی کے موقع پر ایک اہم کام دعوت ولیمہ کا ہوتا ہے اس مسئلہ میں ہم آپ کو دو حدیثیں سنانا چاہیں گے۔

ایک حدیث صحیح بخاری کتاب التفسیر کی ہے اور راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ام المؤمنین حضرت زینبؓ سے شادی کے موقع پر جیسا شاندار ولیمہ کیا تھا ویسا کسی اور بیوی کی شادی پر نہیں کیا تھا۔آپ نے حضرت زینب کی شادی میں گوشت اور روٹی کا ولیمہ کیا تھا اور سب کو پیٹ بھر کھلایا تھا۔ کھانے والوں کی جماعت بندی کر دی گئی تھی۔جب ایک گروپ کھا کر نکل جاتا تو دوسرے لوگ اندر آتے اس طرح باری باری لوگوں کو کھلایا گیا۔حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دعوت دینے کی ذمہ داری نبی ﷺ نے میرے اوپر ڈالی تھی۔ چنانچہ جتنے لوگ مل سکے سب کو میں نے بلا لیا۔ جب ملنے والے بند ہو گئے تو آ کر میں نے رسول اللہ ﷺ کو بتلا دیا کہ اب کوئی نہیں مل رہا ہے۔

(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورہ الاحزاب)

جتنی ہم نے آپ کو سنائی ہے حدیث اس سے زیادہ لمبی ہے ہم نے صرف وہ حصہ سنایا ہے جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بیان سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی

کے موقع پر تمام ازواج مطہرات کے ولیمہ سے بڑا ولیمہ کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ گنجائش اور ضرورت کے حساب سے ولیمہ کی دعوت چھوٹی اور بڑی بھی کی جا سکتی ہے۔

اب ایک اور حدیث سماعت فرمائیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ آئے تو کچھ دنوں کے بعد شادی کی اس شادی کا واقعہ خادم رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن بن عوف کے کپڑوں پر خوشبو کی زردی لگی ہوئی ہے۔ آپ دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ تو عورتوں کی خوشبو کا رنگ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عبدالرحمٰن نے شادی کی ہے۔ آپ نے پوچھا عبدالرحمٰن یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا! اللہ کے رسول ایک عورت سے شادی کر لی ہے اس کا نشان ہے۔ آپ نے پوچھا مہر میں کیا دیا؟ کہا کہ کھجور کی گٹھلی کے برابر سونا۔ (یعنی تین یا پانچ درہم) آپ نے شادی کی مبارکباد دی اور فرمایا۔ ''بارک اللہ لک'' پھر آپ نے فرمایا! ایک بکری ہی کا سہی ولیمہ ضرور کرو''۔ (صحیح بخاری: ۵۱۵۵)

یہ حدیث اور اس سے پہلے حضرت زینب سے شادی کی حدیث دونوں کے راوی خادم رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں اور دونوں ہی حدیثوں میں ایک بکری کا ذکر ہے۔ حضرت زینب کی حدیث میں ''أَوْلَمَ بشاة'' کا لفظ ہے صیغہ ماضی کے ساتھ اور عبدالرحمٰن بن عوف کی حدیث میں ''أَوْ لِم ولو بشاة'' کا لفظ ہے صیغہ امر کے ساتھ۔

ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی میں آپ نے ایک بکری کا ولیمہ کیا تھا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی صراحت کے مطابق یہ ولیمہ آپ کی تمام ازواج مطہرات کے ولیمہ سے بڑا تھا ''مَا أَوْلَمَ النبیُّ ﷺ عَلَی شَيْءٍ مِن نِسَائه مَا أَوْلَمَ عَلَی زَینبَ، أَوْلَمَ بشاةٍ'' (صحیح بخاری/ ۵۱۶۸)

حضرت زینب کی شادی پر آپ نے جیسا ولیمہ کیا تھا ویسا کسی اور بیوی کی شادی پر نہیں کیا تھا۔ ایک بکری کا ولیمہ کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ اس وقت کے لحاظ سے ایک بکری کا ولیمہ بڑا ولیمہ ہوتا تھا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ سے آپ نے فرمایا! "أَوْلِمْ ولو بشاة" ولیمہ کرو اگر چہ ایک ہی بکری کا سہی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مالدار آدمی تھے۔ اگر ان کی مالداری پر نظر کی جائے تو ایک بکری کا ولیمہ کثیر نہیں قلیل ہو گا۔ لیکن اگر دوسری روایات کو سامنے رکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ شادی ہجرت کر کے مدینہ آنے کے فوراً بعد ہوئی تھی اور اس وقت عبدالرحمٰن بن عوف خالی ہاتھ تھے۔ اسی لئے شاید اس شادی میں نہ کوئی ولیمہ کیا اور نہ رسول اللہ ﷺ کو شادی کی کوئی خبر دی، حالانکہ عبدالرحمٰن بن عوف رسول اللہ ﷺ کے قریبی صحابی تھے اور آپ کے رشتہ دار (ساڑھو) بھی تھے، اس لئے حضرت عبدالرحمٰن کی شادی کے پس منظر کو دیکھا جائے اور پھر حضرت زینب ام المومنین رضی اللہ عنہا کے ولیمہ میں حضرت انس کے بیان کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دونوں حدیث میں کثرت کا بیان ہے نہ کہ قلت کا۔ رہا ولیمہ میں قلت و کثرت کا مسئلہ تو اس کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ آدمی کی وسعت اور گنجائش پر ہے۔ البتہ اسراف سے بچنا چاہئے۔

فیصلہ آپ کے اوپر:

متعدد احادیث آپ کو سنائی گئی ہیں۔ ایک سے آپ نے جانا کہ قرآن پاک کی سورتیں یاد کرا دینے پر شادی کر دی گئی، دوسری سے آپ نے جانا کہ اسلام قبول کرنے پر شادی ہوگئی، تیسری سے آپ نے جانا کہ آزادی پر شادی ہوگئی، عبدالرحمٰن بن عوف نے تین درہم مہر پر شادی کر لی۔

ولیمہ کے بارے میں آپ نے سنا واهبہ والی حدیث میں ولیمہ کا ذکر ہی نہیں ہے۔ ام سلیم کی حدیث میں بھی ولیمہ کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت صفیہؓ کی شادی

میں دستر خوان پر صحابہ کرام نے جو ڈال دیا وہی ولیمہ ہو گیا، عبدالرحمٰن بن عوف نے بغیر ولیمہ کے شادی کر لی، بعد میں آپ ﷺ نے ولیمہ کا حکم دیا ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی میں بڑا ولیمہ ہوا تھا جس کی مقدار صرف ایک بکری تھی۔ اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ رشتۂ نکاح کو نبی ﷺ نے کتنا آسان اور سادہ بنایا تھا اور ہم نے اپنے رسم و رواج کی بندش اور بے جا تکلفات سے نکاح اور ولیمہ کو کتنا مشکل بنا دیا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے ہماری گردن سے جو بوجھ اتارا تھا وہی بوجھ ہم نے اپنی گردن میں ڈال لیا۔ بعض روایتیں ایسی ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سب سے برکت والا نکاح وہ ہے جو خرچ کے لحاظ سے آسان ہو۔ لیکن یہ روایتیں سنداً ضعیف ہیں اس لئے ہم سورہ اعراف کی ایک آیت پر اپنی بات ختم کرتے ہیں، اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے۔

﴿الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهُ مَكْتُوْباً عِنْدَهُمْ فِيْ التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِيْلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الاعراف:۱۵۷)

ترجمہ! جو لوگ ایسے رسول، نبی امی کی اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع فرماتے ہیں، اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو اتارتے ہیں۔

نبی ﷺ نے ہماری گردن سے جو بوجھ اتارا تھا ہم نے اپنی کج فہمی اور بداعمالی سے وہی بوجھ اپنی گردن پر لاد لیا۔ اللہ ہمیں کتاب وسنت کا پابند بنائے، اسراف وتبذیر سے بچائے اور معاشرے کی اصلاح فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

اولاد کی تربیت

نکات:

(۱) اولاد سب سے بہترین کمائی ہے۔

(۲) گھریلو ماحول۔

(۳) ایام حمل اور تربیت۔

(۴) ناموں کا اثر۔

(۵) استقلال۔

(۶) غلطیوں پر تنبیہ۔

(۷) تشجیع۔

(۸) مسجد کی تربیت۔

(۹) مدرسہ اور اسکول کی تربیت۔

اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿یَا بُنَیَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ، وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (لقمان:۱۷،۱۸)

اے میرے بیٹے تم نماز قائم کرو، بھلائی کا حکم دو، برے کاموں سے منع کرو اور جو مصیبت تم پر آئے اس پر صبر کرو، بے شک یہ سب پختہ کاموں میں سے ہیں۔ اور لوگوں کے سامنے اپنا منہ گھما کر نہ رکھو اور زمین پر اترا کر نہ چلو، اللہ تعالیٰ کسی تکبر

کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِن مَولُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الفِطرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَو يُمَجِّسَانِهِ كَمَا تُنتَجُ البهيمةُ بَهِيمَةً جَمعَاءَ هَل تُحِسُّونَ فِيهَا مِن جَدعَاءَ (صحیح بخاری ۴۷۷۵)

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، بعد میں اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں جیسے جانور کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو صحیح الاعضاء ہوتا ہے، اس میں تم کو کوئی ناک کٹا یا کان کٹا نہیں ملے گا۔ (بعد میں لوگ اس کی ناک یا کان کاٹ دیتے ہیں)

خطبہ مسنونہ کے بعد آپ کو سورہ لقمان کی دو آیتیں اور ایک نبی کریم ﷺ کی حدیث سنائی گئی ہے۔ آیت کریمہ اور حدیث نبوی دونوں میں اولاد کی تربیت کا پہلو سامنے آتا ہے۔ آیت کریمہ میں لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو عمل صالح اور اخلاق حسنہ کی تعلیم دے رہے ہیں۔ حدیث کے اندر فرمایا گیا کہ والدین کی غلط تربیت بچے کو دین فطرت سے ہٹا کر کافر، مشرک، یہودی اور نصرانی بنا دیتی ہے۔ اتنی ہی باتوں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بچے کے بننے اور بگڑنے میں والدین کا سب سے بڑا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ بتانے سے پہلے کہ بچوں کی تربیت میں کن پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے ہم یہ بتانا مناسب سمجھتے ہیں کہ شریعت میں والدین کے لئے بچوں کی کیا حیثیت ہے۔
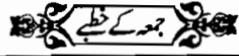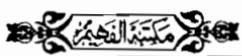
اولاد سب سے بہتر کمائی ہے

ایک حدیث سماعت فرمائیں:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ إِنَّ أَطْيَبَ مَا أَكَلْتُم مِن كَسْبِكُم وَإِنَّ أَوْلَادَكُمْ مِنْ كَسْبِكُم (جامع ترمذی/احکام/۱۳۶۹)

تمہاری سب سے پاکیزہ خوراک تمہاری اپنی کمائی ہے اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے (لہٰذا اولاد کا مال تم کھا سکتے ہو)

مسند احمد کی روایت میں الفاظ اس طرح ہیں:

عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّه قَالَ: وَلَدُ الرَّجُلِ مِنْ كَسْبِهِ مِنْ أَطْيَبِ كَسْبِهِ فَكُلُوا مِن أَمْوَالِهِم هَنِيئاً (مسند احمد/۱۳۶۹)

آدمی کی اولاد اس کی بہترین کمائی ہے لہٰذا خوشی سے ان کے مال میں سے کھا سکتے ہو۔

باپ اپنے بیٹے کا مال کھا سکتا ہے یا نہیں؟ اور کھا سکتا ہے تو کن حالات میں کھا سکتا ہے؟ یہ الگ موضوع ہے ہم اس بحث میں نہیں جاتے۔ ہم آپ کو جو سمجھانا چاہتے ہیں اسے دھیان سے سنیں۔ ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے اولاد کو آدمی کی بہترین کمائی قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارا سماج اور ہمارا معاشرہ اولاد کو اپنی کمائی نہیں سمجھتا ہم اپنی تجارت، کاروبار، دکانداری، کارخانہ، فیکٹری اور مصنوعات کو اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کو اپنی کمائی سمجھتے ہیں۔ ہمیشہ ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمارا مال خراب نہ ہو، ہماری فیکٹری فیل نہ ہو، ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہمارا تیار کردہ مال امتیازی شان کا مالک ہو، گراہک دیکھتے ہی ہمارا مال

اٹھالے وغیرہ وغیرہ

لیکن ہم اپنی اولاد کے لئے یہ امتیاز نہیں سوچتے کہ ہمارا بچہ گاؤں اور محلّہ میں سارے بچوں سے نیک اور سچا ہو، نمازی اور بااخلاق ہو، رفتار گفتار اور اخلاق و عادات میں امتیازی شان کا مالک ہو، کتنے والدین تو ایسے ملیں جو یہ خواہش رکھتے ہیں کہ میرا بیٹا مار، جھگڑے میں سارے بچوں سے آگے رہے۔ کچھ والدین ایسے ضرور ملیں گے جو اپنی بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے فکرمند ہوتے ہیں، ان میں بھی اکثر اسکول اور کالج کی تعلیم کی حد تک فکرمند ہوتے ہیں، نماز اور اخلاق کی فکر نفی کے درجے میں ہوتی ہے، یہ کوتاہی کہئے یا بھول، شاید ہم سے اس لئے ہو رہی ہے کہ ہم اپنی اولاد کو بہترین کمائی اور اطیب الکسب نہیں سمجھتے، اگر سمجھتے تو اپنی اولاد کو سنوارنے پر اپنے کارخانہ اور فیکٹری سے زیادہ توجہ دیتے۔

حدیث کی روشنی میں اتنا سمجھ لینے کے بعد آسانی سے یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ ہماری اولاد ہماری ساری تجارت اور کاروبار سے زیادہ توجہ کی مستحق ہے۔ اس لئے ہم جتنی اپنی تجارت اور آمدنی بڑھانے کی فکر کرتے ہیں اس سے زیادہ اپنی اولاد کی نیکی اور صالحیت کی فکر کرنی چاہئے۔ اب آیئے ہم آپ کو بچوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق کچھ بنیادی باتیں بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔

گھریلو ماحول

بچے کو سب سے پہلے جو چیز متاثر کرتی ہے وہ گھریلو ماحول ہے۔ بچے جیسا اپنے گھر میں اچھا یا برا دیکھتے ہیں ویسا ہی سیکھتے ہیں۔ والدین اور اہل خانہ کی ہر نقل وحرکت غیر محسوس طریقے سے بچے کے ذہن میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جن گھرانوں

میں اتحاد و اتفاق اور اطاعت و فرمانبرداری کا ماحول ہوتا ہے ان گھرانوں کے بچے بھی عموماً صلح پسند اور اطاعت گزار ہوتے ہیں اور جن گھرانوں میں اختلاف اور عصیان و نافرمانی کا ماحول رہتا ہے ان کے بچے بھی عموماً اسی مزاج کے ہوتے ہیں۔ ولی کے گھر میں شیطان اور شیطان کے گھر میں ولی کی مثال شاذ و نادر پائی جاتی ہے۔

کوئی باپ یہ نہیں پسند کرتا کہ میری اولاد نافرمان اور نا کارہ ہو، سب یہی پسند کرتے ہیں کہ میں اچھا نہ سہی کم از کم میری اولاد تو اطاعت گزار اور فرمانبردار ہو۔ اس لئے لازم ہے کہ والدین پہلے اپنی صالحیت کا ثبوت دیں۔ والدین کی نیکی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی اولاد کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ "وكان ابوهما صالحا"

صالح اولاد کی طلب کے لئے جو دعاء ہمیں قرآن کریم میں سکھائی گئی ہے اس پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نیک اولاد کے لئے پہلے خود نیک بننا ہوگا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَاماً﴾ (الفرقان:۷۴)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

دیکھئے اللہ کے نیک بندے دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہماری بیوی اور بچوں کو اطاعت گزار اور فرمانبردار بنا کہ ان سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور ہمیں ان متقیوں کا پیشوا اور امام بنا کہ خیر کے امور میں وہ ہماری اقتداء کریں۔ ظاہر ہے نیک اولاد کا پیشوا ہونے کے لئے خود نیک ہونا لازم ہے۔

ایام حمل اور تربیت

بظاہر ہم یہی جانتے ہیں کہ تربیت کا مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب بچہ کچھ بڑا ہو جائے بولنے اور سمجھنے کے لائق ہو جائے اس کے پہلے تربیت کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے اس لئے کہ بچہ رنگ روپ، شکل وصورت اور ذہن وفکر میں اپنے والدین کا عکس ہوتا ہے اور ظاہر ہے یہ تمام مرحلہ پیدائش سے پہلے حالت حمل کا ہے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ نطفہ کے ٹپکانے اور حمل کی تکمیل میں والدین کی جو فکر اور جو ذہن ہوگا وہ بلاشبہ بچے میں منتقل ہوگا۔ اس لئے بچے کی پاکیزہ فکر کے لئے والدین کو پاکیزہ فکر ہونا لازم ہے۔

نکاح ایک مقدس رشتہ ہے، ہر نکاح سے نسل انسانی میں ایک خاندان کا اضافہ ہوتا ہے۔ وجود میں آنے والا خاندان کیسا ہو؟ اس کی تمام تر ذمہ داری زوجین کی فکر اور حسن عمل پر موقوف ہے۔ اگر نکاح کو صرف لطف ولذت اور تسکین نفس کا ذریعہ سمجھ لیا گیا تو یہ انجام سے بے خبری کی دلیل ہوگی۔

ناموں کا اثر

پیدائش کے بعد بچے کا نام رکھنے کا ایک مرحلہ آتا ہے۔ عام طور سے لوگوں کا ایک مزاج بن گیا ہے کہ میرے بچے یا بچی کا ایسا نیا نام ہو جو محلے، پڑوس میں نہ پایا جاتا ہو۔ اس انفرادیت کے زعم میں ایسا ایسا اوٹ پٹانگ نام رکھ دیا جاتا ہے جو مہمل، بے معنی اور لغو ہوتا ہے جیسے من تشاء، لزاما، ھُنج، لیل النہار، سوراخ علی وغیرہ۔ کچھ لوگ ایسا نام بھی رکھ دیتے ہیں جن سے شرک کی بو آتی ہے۔ جیسے نبی بخش، پیر بخش، عبدالنبی، غلام حسین وغیرہ۔ کچھ لوگ دنوں کا اعتبار کرتے ہیں جس دن پیدا ہوئے وہی نام رکھ

دیا جیسے، عیدو، بقریدو، جمن، جمعراتی، بدھو وغیرہ کچھ لوگ ایسا نام رکھ دیتے ہیں جس سے اللہ کی برابری اور مساوات لازم آتی ہے مثلاً شاہ جہاں، شاہ نواز، عالم گیر، جہانگیر، شاہ عالم وغیرہ۔

شخصیت سازی میں ناموں کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے مہمل اور لغو نام نہیں رکھنا چاہئے، ایسا نام بھی نہیں رکھنا چاہئے جس سے اللہ کی برابری اور مساوات لازم آئے یا جو عقیدہ توحید کے خلاف ہو۔ نام کو صرف تعارف اور شناخت کا ذریعہ نہ سمجھیں، ناموں کا آدمی کے اخلاق و عادات پر اثر ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ جب کوئی غلط نام سنتے تھے تو اس کو بدل کر اچھا نام رکھ دیتے تھے۔

حضرت سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ میرے والد نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ میرے والد نے کہا ''حزن'' (سخت) نبی کریم ﷺ نے میرے والد سے کہا کہ تمہارا نام ''سہل'' (نرم) رہے گا۔ میرے والد نے کہا کہ میرے باپ نے میرا جو نام رکھ دیا ہے اس کو میں نہیں بدلنا چاہتا (صحیح بخاری: ۶۱۹۰)

''حزن'' عربی لفظ ہے اس کا معنی قساوت اور سختی کے ہوتا ہے۔ سعید بن مسیب کہتے ہیں میرے والد کے نام کا اثر (قساوت اور سخت دلی) ہمارے خاندان میں اب تک باقی ہے۔ (فما زالت الحزونة بعد)

صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح کے لئے مکہ سے متعدد سفراء آئے اور گئے لیکن معاملہ طے نہیں ہو پا رہا تھا۔ اخیر میں سہیل بن عمرو مکہ والوں کی طرف سے آیا۔ نبی ﷺ نے سہیل کو دیکھتے ہی فرمادیا ''قد سهل لكم من امركم'' یعنی اب تمہارا معاملہ آسان ہو گیا۔ اور واقعی معاملہ آسان ہو گیا۔ چار شرطیں طے ہو گئیں اور صلح

ہوگئی۔ یہ نیک شگون آپ نے سہیل کے نام سے لیا تھا۔ دونوں واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اچھے یا برے نام سے آدمی کی شخصیت پر اثر پڑتا ہے۔

اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''سب سے بہتر نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہے'' اور آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ انبیاء کرام کے ناموں پر نام رکھو اس لئے اپنے بچوں کا نام رکھنے میں آپ کے فرمان کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ بچے کا اچھا نام رکھنا تربیت کا پہلا زینہ ہے۔

استقلال

انسانی طبقات میں بچوں کا طبقہ سب سے کمزور مانا جاتا ہے اسی لئے دنیا کے تمام انسانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ بچے سب کے بچے ہیں۔ بچہ تو کسی ایک کا ہے لیکن شفقت، محبت اور پیار کے اعتبار سے سب کے لئے قابل رحم ہے۔ رحمت عالم، نبی اکرم ﷺ نے بچوں پر شفقت و رحمت کی بے حد تاکید فرمائی ہے۔ ایک مرتبہ اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ حضرت حسنؓ کو بوسہ دے رہے ہیں تو کہا میرے دس لڑکے ہیں، میں نے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ لَایَرحَمْ لَایُرحَم'' یعنی جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔ بچے جب چھوٹے ہوتے ہیں تو کھانا، پینا، پیشاب، پائخانہ، دیکھ ریکھ یہ سارا کام ماں اور باپ ادا کرتے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہی بچہ جب ہشیار ہو جاتا ہے اور ماں اسے کچھ کھلاتی پلاتی ہے تو بچہ بار بار اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور جھپٹ کر خود اپنے ہاتھ سے کھانے کی کوشش کرتا ہے، حالانکہ ابھی وہ خود سے کھانے کے لائق نہیں ہے، یہ بار بار جھپٹنا اس کے فطری استقلال اور حریت کی طرف اشارہ ہے جو اللہ نے ہر انسان

کے دل میں ودیعت کر رکھا ہے، حریت، استقلال اور آزادی انسان کا فطری حق ہے اسے دبانا اور کچلنا نہیں چاہئے والدین جب اس کا مشاہدہ کرلیں تو بچوں کو مارنے، ڈانٹنے اور جھڑکنے سے پرہیز کرنا چاہئے بلکہ ان کی تشجیع ہونی چاہئے اور ان کی تربیت کا انداز بدل دینا چاہئے۔ کھیل کود ہو یا کھانا پینا اب آہستہ آہستہ بچے سے کرانا چاہئے تاکہ بچے کے اندر خود اعتمادی اور استقلال پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر استقلال کی صلاحیت رکھی ہے، والدین کو چاہئے کہ بچپن ہی سے اس صلاحیت کو ابھارنے کی کوشش کریں۔ یہ خود اعتمادی اور استقلال مستقبل میں اہم امور کی انجام دہی میں مدد اور معاون ثابت ہوگا۔

غلطیوں پر تنبیہ

بچے بہرحال بچے ہیں گھر کے اندر جو ماحول ہے ضروری نہیں ہے کہ باہر بھی وہی ماحول ہو بچوں کا زیادہ وقت گھر کے باہر گزرتا ہے، باہر مختلف ماحول اور مختلف مزاج کے بچوں سے اس کا سابقہ پڑتا ہے والدین نے گھر میں جو سکھایا اور بتایا ہے باہر آنے کے بعد بچہ اسے بھول جاتا ہے اور بچوں میں گھل مل کر مختلف عادتیں سیکھ لیتا ہے۔ چونکہ اسے ابھی خیر و شر کی تمیز نہیں ہے اس لئے بری عادت بھی سیکھ سکتا ہے۔ اس لئے بچہ اگر کوئی غلط کام کرے، گالی گلوچ کرے، مار پیٹ کرے، کسی کا مذاق اڑائے، اپنا یا کسی پڑوسی کا نقصان کرے تو والدین کی ذمہ داری ہے کہ فوراً بچے کو خوبصورتی سے تنبیہ کریں۔ بعض بچے ضدی ہوتے ہیں ایسی صورت میں سختی بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اگر والدین نے بچوں کی غلطیوں پر اہمال سے کام لیا تو آئندہ بچوں کی عادت بگڑ جائے گی اور کنٹرول سے باہر ہو جائے گا۔

ایک مرتبہ حضرت حسنؓ نے صدقہ کی ایک کھجور منہ میں ڈال لی نبی کریم ﷺ نے ان کے منہ میں انگلی ڈال کر کھجور نکال لی۔ اور آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ صدقہ ہمارے لئے حلال نہیں ہے، حضرت حسن بچے تھے صدقہ کی ایک کھجور کا مسئلہ تھا کوئی بہت بڑی غلطی نہیں کی تھی لیکن ان کے ساتھ یہ بے مروتی روا رکھی گئی کہ منھ کا نوالہ چھین لیا گیا۔ ایسا اگر نہیں کیا جاتا تو بچے سے حلال اور حرام کی تمیز اٹھ جاتی اور آئندہ چل کر اس سے بڑی غلطی ہو سکتی تھی اس لئے فوراً سختی سے تنبیہ کی گئی۔

تشجیع

بچوں کا حوصلہ بڑھانا ان کی قوت ارادی کو مضبوط کرنا تربیت کا خاص عنصر ہے، بچے ہر وقت کچھ نہ کچھ بناتے بگاڑتے رہتے ہیں، جب تک جگتے رہیں گے سکون سے نہیں بیٹھ سکتے، سال دو سال کے بچے نفع ونقصان نہیں جان پاتے اس لئے کبھی کبھی بلکہ اکثر ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس سے نقصان ہوتا ہے ایسے وقت میں والدین کو غصہ آتا ہے ان کو ڈانٹتے ہیں زیادہ نقصان ہوجانے پر مارتے بھی ہیں بات بات پر بچوں کو جھڑکنا، ان کی تحقیر کرنا، مارنا اور پیٹنا ان کی نشو ونما کو متاثر کرتا ہے، اس سے ان کا حوصلہ پست ہوجاتا ہے، ان کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچتی ہے، واقعی اگر بچہ نقصان پہنچاتا ہے، توڑ پھوڑ کرتا ہے تو والدہ کو اور گھر کی عورتوں کو یہ اہتمام کرنا چاہئے کہ ایسی چیزیں بچوں کی دسترس سے دور رکھیں، بچے نہ پائیں گے نہ نقصان پہنچائیں گے، اگر خدانخواستہ نقصان کردیں تو انھیں پیار اور محبت سے سمجھائیں، ایک بار میں نہ سمجھے تو بار بار سمجھائیں اور خود اس بات کا اہتمام کریں کہ سامان گھروں میں منتشر نہ رہے، بچوں کی پہنچ سے دور رہے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جو بچے زیادہ شرارت کرتے ہیں وہی بچے

بڑے ہونے پر زیادہ ہوشیار اور پھرتیلے ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر شرارت کریں تو محبت سے منع کیا جائے اور اچھا کریں تو شاباشی دی جائے اور ان کا حوصلہ بڑھایا جائے۔ مثلاً بچے ماں کو نماز میں رکوع، سجدہ کرتے دیکھتے ہیں تو اس کی نقل اتارتے ہیں، اذان سنتے ہیں تو کان میں انگلی ڈال کر جو زبان پر آ سکتا ہے وہ بولتے ہیں، گویا اذان دیتے ہیں۔ گرمی کے ایام میں مائیں پنکھا جھلتی ہیں تو بچے چھین کر خود پنکھا جھلنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ اور اس طرح کی دسیوں حرکتیں بچوں کی ہر گھر میں دیکھی جا سکتی ہیں ایسے موقع پر ماں کو دادی کو، بڑی بہنوں کو بچے کی تشجیع کرنی چاہیے تا کہ بچے میں حوصلہ مندی اور خود اعتمادی پیدا ہو۔

ام خالد رضی اللہ عنہا حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں اپنے والد کے ہمراہ غزوۂ خیبر کے بعد مدینہ واپس آئیں ابھی چھوٹی تھیں، نبی ﷺ کے پاس کچھ کپڑے آئے ہوئے تھے آپ نے ان کپڑوں کو صحابہ میں تقسیم کر دیا ایک چھوٹی سی خوبصورت دھاری دار قمیص بچ رہی تھی آپ نے فرمایا ام خالد کو بلاؤ یہ قمیص ان کو دی جائے گی ان کے والد گود میں لے کر آئے، نبی کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ان کو قمیص پہنائی اور دعا دی، شاباشی دیتے ہوئے آپ نے فرمایا: ”يا أم خالد هذا سنا و يا أم خالد هذا سنا“ اے ام خالد بہت خوب بہت اچھی۔

سنا آپ نے نبی کریم ﷺ اپنے دست مبارک سے ان کو قمیص پہناتے ہیں، دعائیں دیتے ہیں، ہری، پیلی خوبصورت دھاریوں کو دکھا دکھا کر شاباشی دے رہے۔ ابھی بچی تھیں کھیلتے کھیلتے آپ کی پشت مبارک کی طرف چلی گئیں اور آپ کی مہر نبوت پکڑ کر کھیلنے لگیں، ام خالد کے والد ان کو منع کر رہے ہیں، ڈانٹ رہے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کی بچوں سے شفقت دیکھئے، آپ ان کے والد کو ڈانٹنے سے منع فرما رہے

ہیں، فرماتے ہیں "دعھا" چھوڑو کھیلنے دو۔

ام قیس بنت محصن اپنے چھوٹے بچے کو جو ابھی کھانا نہیں کھاتا تھا لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں، آپ نے بچے کو اپنی گود میں بیٹھالیا اور بچے نے آپ کے اوپر پیشاب کر دیا۔ آپ نے پانی مانگا اور اس پر چھڑک دیا دھلا نہیں۔ (صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب بول الصبیان)

کتنے ایسے لوگ ہیں جو اپنے بچے کو گود نہیں لیتے کہ پیشاب کر دے گا اور یہاں نبی کریم ﷺ کو بچوں سے اتنی محبت ہے کہ دوسرے کے بچے کو اپنی گود میں بیٹھائے ہوئے ہیں، بچے نے پیشاب کر دیا لیکن آپ کو کچھ برا نہیں لگا۔

آج بچے شرارت کرتے ہیں، نقصان کرتے ہیں، گندگی پھیلاتے ہیں تو ہمیں برا لگتا ہے ان کو جھڑکتے ہیں، مارتے ہیں اور تحقیر کرتے ہیں لیکن یہی ہمارے بچے مستقبل کے معمار ہیں، اس لئے ان کی تشجیع کرنی چاہئے ان کی غلطیوں کو نظر انداز کرنا چاہئے۔ ایک مرتبہ عید کا موقع تھا خوشی میں دو بچیاں گیت گا رہی تھیں، نبی ﷺ وہاں موجود تھے آپ نے منع نہیں کیا اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے، انھوں نے گاتے ہوئے سنا تو ڈانٹا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ متوجہ ہوئے اور فرمایا: ابوبکر چھوڑو، گانے دو، ہر قوم کے لوگ عید کی خوشی مناتے ہیں یہ ہماری عید ہے۔ (صحیح بخاری/عیدین)

ان حدیثوں کو سنا کر ہم آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بچوں کی حوصلہ شکنی نہیں کرنی چاہئے۔ غلطی بھی کریں تو اغماض اور چشم پوشی اختیار کیجئے، اصلاح کرنی ہو تو محبت اور پیار سے۔ نبی کریم ﷺ بچوں کے ساتھ نہایت لطف و محبت سے پیش آتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دس سال میں نے نبی کریم ﷺ کی

خدمت کی لیکن اگر میں نے کوئی کام نہیں کیا تو آپ نے کبھی نہیں پوچھا کہ کیوں نہیں کیا اور اگر کوئی کام کر دیا تو ایک بار بھی آپ نے یہ نہیں کہا کہ کیوں کیا۔ اس لئے بچوں سے بار بار باز پرس نہیں کرنی چاہئے۔ عفو و درگذر سے کام لینا چاہئے۔

مسجد کی تربیت

ابھی آپ کو بتایا گیا کہ بچے ماں، باپ اور گھر کے دیگر افراد کو جو کرتے دیکھتے ہیں وہی وہ بھی کرتے ہیں اور اس کی نقل اتارتے ہیں، ماں کو نماز پڑھتے، رکوع اور سجدہ کرتے دیکھتے ہیں تو بچے بھی رکوع اور سجدہ کی کوشش کرتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کا حکم دو، دس سال کے ہو جائیں اور نہ پڑھیں تو مار کر پڑھاؤ، بچہ ابھی مکلّف نہیں ہے۔ اس پر نماز فرض نہیں ہے لیکن نماز کی یہ تاکید اس لئے کی جارہی ہے کہ بچے کے دل میں نماز کی اہمیت بیٹھ جائے اور نماز کا عادی ہو جائے، ہر نماز کے لئے اذان ہوتی ہے اور الحمدللہ عموماً اذان لاؤڈ اسپیکر سے ہوتی ہے، ہر گھر میں اذان کی آواز پہنچتی ہے۔ حدیث میں تاکیدی حکم ہے کہ اذان کا جواب دیا جائے۔ اذان کی آواز سن کر ماں اور گھر کے دیگر افراد اگر چپ ہو جائیں اور اذان کا جواب دیں بچے شور شار کر رہے ہوں تو انہیں یہ کہہ کر چپ کرائیں کہ اذان ہو رہی ہے شور نہ کرو، ساتھ ہی انھیں اذان کا جواب دینا سکھائیں تو نماز کے لئے تربیت کا یہ پہلا زینہ ہوگا، آہستہ آہستہ بچے کو اذان اور نماز سے دلچسپی ہو جائے گی، کچھ دنوں میں بچہ والد کے ساتھ مسجد جانے کی خواہش کرے گا۔ نہیں لے جائیں گے تو ضد کرے گا۔ مسجد میں جانے کے بعد بچے باتیں کرتے ہیں، شور کرتے ہیں، ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ

جاتے رہتے ہیں، اس لئے مسجد میں جانے کے بعد ان کی نگرانی تو کرنی ہی ہے، گھر سے نکلنے کے وقت انہیں سمجھا دیا جائے کہ دیکھو مسجد میں بات نہیں کی جاتی شور نہیں کیا جاتا اٹھ بیٹھ اور بھاگ دوڑ نہیں کی جاتی ایسا کرنے پر گناہ ملے گا، اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا۔ بار بار اس طرح کہنے اور سمجھانے سے بچے سمجھ جاتے ہیں، بچہ اگر گندہ کپڑا پہنے ہو تو فوراً اس کا کپڑا بدلوا دیں اس سے صفائی ستھرائی، مسجد اور نماز کی اہمیت کا بچے کو احساس ہوگا۔ مسجد میں آنے کے بعد اگر گنجائش ہو تو صف کے کنارے کسی طرف بچے کو اپنے پاس بیٹھائیں اس کا خیال رہے کہ چند بچے ایک جگہ نہ بیٹھیں ورنہ شور کریں گے۔ اگر جمعہ کا دن ہے تو خود نہانے، دھونے اور گھر کی بھی صفائی، ستھرائی کا اہتمام کریں اور بچے کو بھی نہلا، دھلا کر، صاف کپڑے پہنا کر، تیل یا خوشبو لگا کر مسجد میں لائیں تا کہ بچے کے ذہن میں جمعہ کی اہمیت جا گزیں ہو جائے۔

بچوں کی صف پیچھے ہوتی ہے اس لئے صف بندی اور جماعت کے وقت سب بچے اکٹھا ہو جاتے ہیں اور شور ہنگامہ شروع کرتے ہیں نماز کے دوران بھی مار پیٹ اور شور ہنگامہ کرتے ہیں جس سے پچھلی صف کے مصلیوں کو خلجان ہوتا اور خشوع وخضوع میں خلل پڑتا ہے۔ جمعہ کے دن بچے اور زیادہ ہو جاتے ہیں اس لئے جمعہ کی نماز میں اور زیادہ شور کرتے ہیں۔ بچوں کو مسجد میں آنے سے منع نہیں کرنا ہے بلکہ لانا چاہئے، لیکن مسجد کے کسی ذمہ دار کو یا والد یا پچھلی صف کے مصلیوں کو نماز شروع ہونے سے پہلے بچوں کو خاموش رہنے اور سکون سے نماز پڑھنے کی تاکید کر دینی چاہئے اور خطبۂ جمعہ میں خطیب بھی بچوں کو نماز اور مسجد کے آداب بتائے، مجھے اس کا تجربہ ہے کہ سمجھانے کے بعد بچے مان جاتے ہیں کچھ دن گزرنے کے بعد پھر شور کرنے لگتے ہیں اس لئے اس کا اعادہ ہوتے رہنا چاہئے۔

اس کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بچے کو اگر کسی نے ڈانٹ دیا یا سختی سے منع کر دیا تو بچے کے والد کو برا لگ جاتا ہے اور لڑائی کی نوبت آ جاتی ہے۔ میرے بھائیو! بچے سب کی امانت ہیں اگر کسی نے آپ کے بچے کو ڈانٹ دیا اور آپ نے سوال جواب شروع کر دیا تو اس سے بچے کو شرارت کرنے اور بدتمیزی کرنے کی شہ ملے گی اور بچے کے دل سے بڑوں کا ادب، نماز اور مسجد کا ادب نکل جائے گا، اس لئے کسی کی تنبیہ پر ناراض نہیں ہونا چاہئے بلکہ خوش ہونا چاہئے کہ اس نے آپ کی ذمہ داری ادا کی ہے، نماز اور مسجد کا ادب اپنے بچے کو آپ کو سکھانا چاہئے، آپ نے نہیں سکھایا تو آپ کے بھائی اور آپ کے پڑوسی نے سکھایا۔ اس نے آپ کی مدد کی ہے اور آپ نے اس کو دشمنی پر محمول کر لیا اگر خدانخواستہ اس نے بے جا تنبیہ کی ہے تب بھی اغماض اور چشم پوشی سے کام لیجئے اور بچے کو اچھی تعلیم دیجئے۔

مدرسہ اور اسکول کی تربیت

مدرسہ اور اسکول بچے کی سب سے بڑی تربیت گاہ ہے اس کی کئی وجہیں ہیں۔

(۱) بچہ اپنے استاد اور معلم کا باپ سے زیادہ احترام کرتا ہے اور اس کا حکم مانتا ہے۔ باپ کے حکم میں بچہ آنا کانی اور ٹال مٹول کر سکتا ہے لیکن استاذ کے حکم میں ٹال مٹول نہیں کر سکتا۔ بیٹا اپنے باپ کی جتنی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا ہے اس سے زیادہ شاگرد اپنے استاذ کی اطاعت کرتا ہے۔ اس لئے مدرسہ کے مدرسین کی اخلاقی تربیت جتنی موثر اور زود اثر ہو سکتی ہے اتنی باپ کی نہیں ہو سکتی ہے۔

(۲) پڑھنے لکھنے یا کام کاج کا جو سب سے قیمتی وقت ہوتا ہے وہ بچہ مدرسہ میں گزارتا ہے تقریباً چھ گھنٹے لگاتار بچہ اپنا اصل وقت مدرسہ کی درسگاہ اور چہار دیواری

کے اندر گزارتا ہے اور اس پورے وقت میں اس کی ہر نقل وحرکت کسی نہ کسی استاذ کی نگاہ میں ہوتی ہے اس لئے بچہ اولاً کوئی نازیبا حرکت کرے گا ہی نہیں اور اگر کرے گا تو استاذ کی تنبیہ اور سرزنش کا مستحق ہوگا۔ اور ہر دن بچے کو اس طرز عمل سے گزرنا ہے، ہر کامیابی کی ضمانت مداومت اور عمل پیہم ہے، مدرسہ اور اسکول میں بھی تربیت کا یہ عمل دوام کے ساتھ دہرایا جاتا ہے۔ اس سے بہتر تربیت کی جگہ نہیں پائی جاسکتی۔

(۳) تعلیم برائے تربیت ہے نہ کہ تعلیم برائے تعلیم۔ اس لئے کسی بھی مکتب فکر کا ادارہ اور اسکول ہو اس میں ایسا نصاب تعلیم رکھا جاتا ہے جس میں اخلاقیات کی تعلیم غالب ہو، اب اساتذہ اور معلمین کی ذمہ داری ہے کہ یہ مضمون اپنا فرض منصبی جان کر پڑھائیں اور بچوں کو اخلاق کا پیکر بنائیں یا اپنی ڈیوٹی سمجھ کر وقت گزاری کریں۔

(۴) مساوات کا درس! مدرسہ میں پہنچنے کے بعد سارے دنیاوی امتیازات ختم ہوجاتے ہیں وہاں نہ کوئی امیر نہ کوئی غریب، نہ کوئی گورا اور نہ کوئی کالا۔ سب ایک یونیفارم میں ملبوس، کلاس ایک، نصاب ایک، کتاب ایک، وقت ایک گھنٹی ایک، سارے امتیازات اور تشخصات جو معاشرے میں پائے جاتے ہیں اسکول میں پہنچنے کے بعد مٹ جاتے ہیں سب کو ایک پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ ہاں اسکول اور مدارس میں تفوق اور برتری کا اگر کوئی معیار ہے تو علم اور اخلاق ہے، بچہ اگر ذہین اور چالاک ہے، محنتی اور با اخلاق ہے تو اساتذہ اور انتظامیہ کی نگاہ میں ایسا بچہ مقرب اور معزز ہوتا ہے اسکول میں پہنچنے کے بعد جب علم اور اخلاق کی بنیاد پر بچے کی عزت افزائی ہوتی ہے تو بچے کے دل میں علمی اور اخلاقی برتری میں اضافہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جب کہ سماج اور معاشرے میں اس کو یہ موقع میسر نہیں آتا۔

(۵) روحانی فیض! کہا جاتا ہے کہ استاذ باپ ہوتا ہے۔ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے،

اس کے خلاف بعض اساتذہ خائن اور ڈاکو بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایسا کم سنا جاتا ہے۔ عموماً استاد باپ کا ہی کردار ادا کرتا ہے۔ باپ اپنے بچے کی جسمانی اور دنیاوی ضرورت پوری کرتا ہے اور استاد اس کی روحانی اور اخروی زندگی سنوارتا ہے۔ بچے سے استاد کا وہی رشتہ قائم ہوتا ہے جو اس کے اپنے باپ سے۔ جس طرح باپ اور بیٹے کا نسبی رشتہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ چاہے باپ بیٹے میں دوستی ہو یا دشمنی ہر حال میں باپ رہے گا اور بیٹا، بیٹا رہے گا یہ رشتہ نہ چھینا جا سکتا ہے، نہ توڑا جا سکتا ہے۔ اسی طرح استاذ اور شاگرد کا رشتہ ہے، استاد اور شاگرد میں دوستی ہو یا دشمنی ہر حال میں استاد استاد رہے گا اور شاگرد، شاگرد رہے گا۔ کسی حال میں یہ رشتہ توڑا نہیں جا سکتا۔ جسمانی ساخت قد و قامت اور رنگ و روپ بچہ اپنے والدین سے کسب کرتا ہے لیکن روحانی فیض غیر محسوس طریقے پر بچہ اپنے استاد سے کسب کرتا ہے دوران تعلیم بچے کے ذہن وفکر پر استاد کے اخلاق و کردار کا ذہنی رویہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس میں کسی پیر اور فقیر کا عمل دخل نہیں ہوتا یہ صرف اللہ کا ایک اصول ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جس کو نہیں چاہتا نہیں دیتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے بچہ باپ کی جسمانی ساخت اور رنگ و روپ صرف اللہ کے فیض سے پاتا ہے اور جب اللہ نہیں چاہتا تو نہیں پاتا۔

اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اساتذہ کی تقرری میں صلاحیت سے زیادہ صالحیت پر نظر رکھی جائے تاکہ استاد کی جانب سے جو ذہنی رویہ شاگرد کی طرف منتقل ہونے والا ہے اُس میں خیر ہو شر نہ ہو۔

اللہ سے دعاء ہے کہ وہ ہمارا اور ہمارے بچوں کا مستقبل روشن کرے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کا صحیح شعور ہمیں عطا کرے۔ والحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم

☆☆☆

نقوشِ تربیت

نکات!

(۱) بچوں سے محبت۔

(۲) صفائی اور ستھرائی

(۳) تعلیم وتربیت

بچوں سے محبت:

اللہ کے رسول ﷺ ساری دنیا کیلئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ (انبیاء:۱۰۷)

اور ہم نے آپ کو تمام جہاں والوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

آپ کی رحمت وشفقت اللہ کی ہر مخلوق کیلئے عام تھی۔ اس میں انسان اور غیر انسان یا مرد وعورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی، لیکن معاشرے میں رحمت وشفقت کا سب سے زیادہ محتاج اور مستحق بچوں کا طبقہ ہوتا ہے اس لئے ہمارے نبی اکرم ﷺ بچوں سے خاص طور سے محبت کرتے تھے۔ انھیں اپنی گود میں بٹھاتے تھے، بوس وکنار کرتے تھے، چھیڑتے اور چڑھاتے تھے، ہنساتے اور کھلاتے تھے۔

حضرت ام خالد رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب ہم لوگ حبشہ کی ہجرت سے مدینہ واپس آئے تو میں ابھی چھوٹی تھی، میرے والد مجھ کو اپنے ساتھ لیکر رسول اللہ ﷺ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک عمدہ کپڑا پہنایا اور خوب تعریف کی۔ آپ نے فرمایا ''سناہ سناہ'' بہت خوب بہت خوب۔

ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول ﷺ حضرت علیؓ کے مکان پر تشریف لے گئے اور جاتے ہی آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا! وہ بچہ کہاں ہے؟ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں بچے کے آنے میں دیر ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بچے کو نہلا دھلا کر کپڑا بدل رہی ہیں اسی لئے دیر ہو رہی ہے۔ خیر کچھ دیر بعد حضرت حسنؓ دوڑتے کودتے آئے تو فوراً آپ نے انھیں گلے لگایا، چوما چاٹا اور ہنسایا بلایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ ام محصن بنت قیس اپنے ایک چھوٹے دودھ پیتے بچے کو لیکر آئیں رسول اللہ ﷺ نے بچے کو اپنی گود میں بٹھا لیا، بچے بچے ہوتے ہیں انھیں کیا پتہ۔ بچے نے آپ کے اوپر پیشاب کر دیا چونکہ بچہ ابھی چھوٹا تھا کھانا نہیں کھاتا تھا اس لئے آپ نے پاکی کیلئے پانی کا چھینٹا مارنے پر اکتفاء کیا۔

حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں وہ کُلّی مجھے یاد ہے جو نبی کریم ﷺ نے میرے منھ پر کی تھی۔ آپ نے ڈول سے پانی لیا اور پینے کے بعد منھ کے بچے پانی سے میرے منھ پر کلی کر دی۔

اقرع بن حابس کہتے ہیں ایک مرتبہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ کسی بچے کو گود میں کھلا رہے تھے میں نے دیکھ کر کہا میرے دس بچے ہیں میں نے ابھی تک کسی کو بوسہ نہیں دیا۔ نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا! جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

صفائی اور ستھرائی:

پانچ حدیثیں آپ کو سنائی گئی ہیں، صحیح بخاری کی ان روایتوں سے جہاں یہ

معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بچوں سے بیحد محبت کرتے تھے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کو صاف ستھرا، اچھی وضع قطع اور عمدہ لباس میں ملبوس ہونا بھی آپ پسند فرمایا کرتے تھے، حضرت ام خالد کو آپ نے اچھا لباس پہنا کر تعریف کی اور دعائیں دیں، حضرت فاطمہؓ نے اپنے بیٹے کو سنوار کر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ بچوں کو گندی حالت میں دیکھنا پسند نہیں فرماتے تھے اور ایسا آپ کیوں پسند کریں گے جبکہ آپ کی لائی ہوئی شریعت میں طہارت کو نصف ایمان کہا گیا ہے۔

اس لئے لازم ہے کہ بچپن ہی سے بچوں کو صفائی، ستھرائی اور نظافت کی تاکید کی جائے، بچپن میں جس چیز کی عادت ڈال دی جاتی ہے بڑے ہونے کے بعد بچوں کیلئے وہ فطرت ثانیہ بن جاتی ہے، اگر والدین نے خصوصاً ماں نے اس پر توجہ کی اور بچے کو پاک صاف رکھا اور صفائی کی تاکید کرتی رہی تو بلاشبہ بڑے ہونے کے بعد بچہ نفاست پسند ہوگا اور اگر بچپن ہی میں ماں نے لاپرواہی کی، اس کی نظافت کا خیال نہیں رکھا تو بڑے ہونے کے بعد بھی صفائی پر گندگی کو ترجیح دے گا۔ خود بچے کی نفاست ماں کی نفاست پر موقوف ہے۔ اگر ماں نفاست پسند ہے، خود صاف ستھری رہتی ہے، اپنا مکان، اپنا کپڑا، اپنا کمرہ، اپنا بستر، اپنا برتن صاف ستھرا رکھتی ہے تو بلاشبہ اس کا بچہ بھی صاف ستھرا، اور نفاست پسند ہوگا، اور اگر اسکی ماں خود گندی رہتی ہو، مکان، کمرہ، کپڑا، اور برتن گندہ رکھتی ہو تو کبھی اپنے بچے کو نظافت کی تربیت نہیں دے سکتی۔

اسلام میں نظافت اور طہارت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، طہارت کو نصف ایمان کا درجہ دیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ طہارت میں جتنی کمی ہوگی اسی مناسبت سے ایمان میں کمی ہوگی۔ قرآن پاک میں حکم ہے ''وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ'' اپنے کپڑوں کو

پاک رکھو دوسری جگہ ارشاد ہے، "إِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِين" یعنی اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور خوب پاک رہنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

مدینہ میں تین میل کے فاصلہ پر ایک بستی ہے جس کو قباء کہا جاتا ہے رسول ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو پہلے اسی آبادی میں آپ نے چودہ روز قیام فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس بستی والوں کی پاکیزگی اور طہارت کی تعریف بیان فرمائی ہے، ارشاد ہے "فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ" (التوبۃ: ۹/۱۰۸) قباء میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو خوب صفائی کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی خوب صفائی رکھنے والوں کو پسند کرتا ہے، جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو رسول ﷺ نے قباء کے لوگوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں تم لوگوں کی تعریف کی ہے، بتاؤ تم لوگ کون سا عمل کرتے ہو جو اللہ کو اتنا پسند ہے؟ ان لوگوں نے کہا! ہم لوگ جب استنجاء کرتے ہیں تو ڈھیلا اور پانی دونوں استعمال کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ صفائی ستھرائی اور طہارت و پاکیزگی میں مبالغہ اللہ کو نہایت پسند ہے، یہی وجہ ہے کہ نماز جو سب سے افضل عمل ہے اس کے ادائیگی کی صحت کیلئے جسم، کپڑا اور جگہ کا پاک ہونا شرط ہے، جمعہ کے روز طہارت کا اہتمام اور بڑھ جاتا ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کے دن خاص طور سے غسل کرنے کا حکم دیا ہے، اسی طرح حیض ونفاس اور جنابت کے بعد غسل کو واجب قرار دیا گیا ہے، ان تمام احکامات پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ صفائی اور ستھرائی کی اسلام نے نہایت سخت تاکید فرمائی ہے۔

یہ تو ان حالات کا ذکر تھا جن میں خاص طور سے پاکیزگی کا حکم دیا گیا ہے ان

کے علاوہ عام حالات میں ہم کو تعلیم دی گئی ہے کہ ہم اپنے لباس وضع قطع کو درست رکھیں تا کہ اقوام عالم کے بیچ ہم اپنی تہذیب وثقافت اور اپنی شخصیت کے اعتبار سے ممتاز رہیں، رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ''تل'' سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح تل پورے جسم میں ممتاز اور نمایاں ہوتا ہے اور حسن کو دوبالا کرتا ہے اسی طرح مسلمان دنیا کی قوموں کے بیچ اپنی وضع قطع اور رفتار وگفتار کے اعتبار سے الگ نشان رکھتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مسلمان اپنے وجود سے محفل کو رونق اور وقار عطا کرتا ہے اور مختلف رنگ ونسل کے درمیان مسلمان بغیر کسی تعارف کے متعارف ہوتا ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا حال ہماری تعلیم کے برعکس ہے، مسلم محلوں اور گلیوں کی پہچان گندگیوں کا انبار اور ڈھیر ہے۔ ایسی جگہوں سے ہر گذرنے والا ناک بند کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور یہ گندگیاں کہیں باہر سے نہیں آتیں یہ محلوں میں بسنے والوں کی کرم فرمائی ہوتی ہے کہ اپنے گھر کی گندگی کسی پڑوسی کے دروازے پر ڈال دیتے ہیں اور اس ایذا رسانی کی ذمہ دار عموماً عورتیں ہوتی ہیں اپنے گھروں کی صفائی کر کے کچرہ خود کسی پڑوسی کے دروازے پر ڈال دیتی ہیں یا کسی بچے سے ڈلوا دیتی ہیں۔ اس حرکت عمل سے محلے میں گندگی تو ہوتی ہی ہے ساتھ میں پڑوسیوں کے حق میں زیادتی بھی ہوجاتی ہے۔ کتنے گھروں میں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچا ہوا کھانا، سالن اور دال دروازے پر عورتیں ڈال دیتی ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کی انتہائی درجہ ناقدری ہے، کھانا اللہ کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے اور ہماری پوری محنت اور کمائی کا حاصل ہے، اس کی بے حرمتی کرنا اخلاقاً شرعاً اور عرفاً ہر اعتبار سے جرم ہے، اللہ کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کی جائیگی تو اللہ تعالیٰ اپنی نعمت چھین لے گا اور اس گھر سے اپنی برکت اٹھا لے گا۔ اس لئے بچا ہوا کھانا بے حرمتی کے ساتھ کبھی

دروازوں پر یا نالیوں میں نہیں پھینکنا چاہئے، بالفرض اگر کھانا بچ گیا ہے اور خراب ہو گیا ہے کھانے کے لائق نہیں رہ گیا ہے تو ایسی صورت میں دیکھنا چاہئے محلے، پڑوس میں جانور پلے ہوتے ہیں ان کو دیدیا جائے یا پھر ایسی جگہ ڈالنا چاہئے جہاں گندگی نہ ہو اور اللہ کی نعمت کی بے حرمتی نہ ہو۔

بہت سارے گھروں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ کئی کئی روز جھاڑو نہیں لگایا جاتا اور یہ بھی مشاہدے ہی کی بات ہے کہ عورتیں پورے مکان کا جھاڑو لگا کر کسی کونے میں جمع کر کے چھوڑ دیں گی، فوراً اٹھا کر نہیں پھینکتیں، تعجب ہوتا ہے کہ پورے مکان میں جھاڑو لگاتا تھا تو تھکان نہیں آئی، اور اٹھا کر پھینکنے میں تھکان آنے لگی؟ ظاہر ہے اس کا تعلق تھکان سے نہیں سستی اور لاپرواہی سے ہے۔

بچوں کو دیکھئے تو گندے کپڑوں میں لت پت ہیں ناک سے ریٹ اور آنکھ سے کیچڑ بہہ رہا ہے، بعض بچے تربیت نہ ہونے کی وجہ سے کھڑے کھڑے پیشاب اور پاخانہ کر دیں گے، جس کی وجہ سے پورے گھر میں گندگی پھیل جاتی ہے، ایک گھر میں مختلف مزاج کے لوگ ہوتے ہیں کسی کو گندگی برداشت ہوتی ہے کسی کو برداشت نہیں ہوتی ہے جس کی وجہ سے گھر میں اختلاف اور جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اور یہ ساری باتیں ماں کی سستی، لاپرواہی اور اس کے پھوہڑ پن کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اگر ماں نفاست پسند ہے بچے کی، مکان کی، دروازے کی برتنوں کی لباس اور بستر کی صفائی اور ستھرائی کا اہتمام کرتی ہے، مکان صاف ستھرا، لباس اور بستر چکنا، برتن منظّم اور قرینے سے لگے ہوئے نظر آتے ہیں تو غیر محسوس طریقے سے اس کا اثر بچوں کی تربیت پر پڑتا ہے۔ بڑے ہونے کے بعد بچے نفاست پسند اور صحت مند ہوں گے، اس لئے ماں پر واجب ہے کہ خود نفاست پسند ہوتا کہ اس کی گود میں، پلنے والے

بچے بھی نفاست پسند اور صحت مند ہوں۔

تعلیم اور تربیت:

عصر حاضر میں اگر اقوام عالم کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان دنیا کی ساری قوموں میں پچھڑے ہوئے ہیں، جو قومیں تعلیم وتعلم اور تعمیر وترقی میں مسلمانوں کی دست نگر تھیں وہ آج برق رفتاری سے آگے جا رہی ہیں، اگر اس کے اسباب وعلل پر غور کیا جائے تو جہاں بہت سارے اسباب نظر آئیں گے وہیں ایک بہت بڑا سبب افراد کی عدم تیاری اور صلاحیتوں کا ضیاع نظر آئے گا، افراد کی تیاری اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اول دن سے بچوں کی ذہنی نشو ونما اور تعلیمی رجحان کا جائزہ لیا جائے۔ بچے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں اس لئے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کی قدردانی اور ضیاع سے حفاظت بہت ضروری ہے۔اس کی ذمہ داری سب سے پہلے والدین کے اوپر آتی ہے، پچاس فیصد والدین تو ایسے ملیں گے جو علمی ذوق ہی نہیں رکھتے وہ اپنے بچوں کے علمی رجحان کا پتہ کیسے چلائیں گے، لیکن ایک موٹی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیئے۔ بچہ جو زبان ماں کی گود سے سنتا آیا ہے اسی زبان میں سمجھنا اور سمجھانا آسان ہے، اپنے مافی الضمیر اور احساس وخیالات کو مادری زبان میں جتنی خوبی کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے۔اس لئے بچوں کی تعلیم کیلئے ایسے مدارس اور اسکول کا انتخاب کرنا چاہیئے جہاں بچے کی ابتدائی تعلیم کا ذریعہ مادری زبان ہو۔ اور ساتھ ہی اس بات کا بھی خاص خیال رکھا جائے کہ بچہ جس تہذیب وثقافت سے آشنا ہے اسی تہذیب وثقافت کا حامل ادارہ بھی ہو، ورنہ تہذیب کا تصادم تعلیمی خلجان

اور ذہنی انتشار کا سبب بن جائے گا۔

ہم اپنے معاشرے میں مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کچھ متجددین بعض عصری اداروں کے ٹیپ ٹاپ اور چمک دمک کو دیکھ کر بے تحاشہ اپنے بچوں کو وہاں داخل کر رہے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں زبان اور تہذیب دونوں کا تصادم ہوتا ہے اور بچے کی دینی شناخت کمزور ہو جاتی ہے۔

انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کو ناجائز نہیں کہا جا رہا ہے. بتایا یہ جا رہا ہے کہ ابتداء ہی سے انگلش میڈیم اسکولوں میں داخل کرنے سے بچے کی مادری زبان انگلش نہیں ہو جائیگی، بچے نے رحم مادر سے جو زبان سیکھی ہے، مادری زبان وہی رہے گی، اگر مادری زبان میں بچے کو تعلیم نہیں دلائی جائیگی تو تعلیم، تعلیم نہیں، ایک بوجھ بن جائے گی۔

تعلیم وتربیت کے تعلق سے ایک نہایت ضروری چیز ہے بچے کی نگرانی، بچہ اسکول گیا یا کہیں اور؟ بچہ کیا پڑھ رہا ہے؟ کس کلاس میں پڑھ رہا ہے؟ ہوم ورک کرتا ہے یا نہیں؟ کلاس میں اس کی تعلیمی پوزیشن کیا ہے؟ کلاس میں اس کی حاضری ایسی تو نہیں کہ جسم حاضر اور دماغ کہیں اور چر رہا ہے؟ اس کے ساتھی اور دوست کون ہیں؟ تفریح کے وقتوں میں وہ کہاں جاتا ہے؟ یقیناً ان میں بعض باتیں استاد اور کلاس سے متعلق ہیں، والدین سے نہیں لیکن اگر والدین کو فکر ہوگی اور اپنے بچے کو تعلیم یافتہ اور مہذب انسان بنانے کی دھن ہوگی تو وہ اپنی ذمہ داریوں سے اوپر اٹھ کر کام کریں گے اور ہر مشکل کا حل پالیں گے۔

اسی ضمن میں ایک پہلو یہ بھی قابل ذکر ہے کہ والدین اپنے گھر میں دینی اور علمی ماحول پیدا کریں، بچے اپنے گھر میں جو دیکھتے ہیں وہی کرتے ہیں، اگر والدین

تُو تُو، مَیں مَیں کریں گے تو بچے بھی لڑنا جھگڑنا سیکھیں گے، اگر والدین ٹی وی، موبائیل اور فلمی گانوں میں اپنا وقت برباد کریں گے تو یہ ناممکن ہے کہ بچے سائنس اور ریاضی کے سوالات حل کریں، اگر گھر میں تلاوت کا، نماز کا، دعاؤں کا، ماحول ہوگا تو بچے بھی والدین کی دیکھا دیکھی نماز پڑھیں گے اور تلاوت کریں گے، اسی طرح علمی ماحول دیکھ کر علم کا شوق پیدا کریں گے، یہ طریقۂ عمل کچھ دنوں بعد والدین کو علمی نگرانی سے بے نیاز کر دے گا۔

☆☆☆

عورت شریعت کی نگاہ میں

نکات!

(۱) عورت کتاب وسنت میں۔

(۲) خیر کی وصیت۔

(۳) طلاق۔

(۴) خلع۔

(۵) نفقہ اور سکنیٰ۔

(۶) ساس اور بہو۔

(۷) جہیز۔

عورت کتاب وسنت میں:

آسمان وزمین کی یہ خوشنما اور لامحدود کائنات جو ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، رب کائنات نے اسے زوجیت کے نظام پر پیدا کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (۵۱/۴۹)

ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے تا کہ تم نصیحت حاصل کرسکو۔

نظام زوجیت اس بات کیلئے نصیحت ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز اپنا جوڑ رکھتی ہے تو دنیا کی زندگی کا بھی کوئی جوڑ ہوگا اور وہ جوڑ آخرت کی زندگی ہے گویا کائنات کا نظامِ زوجیت وقوعِ قیامت کی دلیل ہے۔

کائنات کی کوئی بھی مخلوق انسان اور حیوان ہوں یا آسمان وزمین اور رات و دن ہر ایک کے اندر اللہ تعالیٰ نے ازدواجی نظام قائم کر رکھا ہے۔ لیکن ساری مخلوقات کے بیچ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس روئے زمین پر توالد وتکاثر اور تسابق وتنافس کی ہنگامہ خیزیاں انسان ہی کے دم سے قائم ہیں۔ اس لئے خالق کائنات نے انسان کی عظمت وشرافت اور اس کی حفاظت کیلئے انبیاء ورسل کے ذریعہ اسے ایک مکمل نظام حیات عطا فرمایا۔ جس میں نظامِ زوجیت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

مناسب ہوگا کہ پہلے اس پہلو پر غور کر لیا جائے کہ کتاب وسنت میں عورت کی کیا حیثیت متعین کی گئی ہے۔ تاکہ اس کے حقوق کی وضاحت میں آسانی ہو۔

سورہ نساء آیت نمبر ۳۴ میں مردوں کو عورتوں کا ذمہ دار اور حاکم قرار دیا گیا ہے۔ سورہ اعراف آیت نمبر ۱۸۹ میں عورتوں کو مردوں کا سکون قرار دیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۲۳ میں عورتوں کو مردوں کی کھیتی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ احادیث رسول میں عورتوں کو ''ربة البيت، راعية البيت، خير الكنز، خير المتاع، ناقصات العقل، اور پسلی کی ٹیڑھی ہڈی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مذکورہ قرآنی آیات اور احادیث رسول سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) عورت اسلام کی نگاہ میں نہایت قیمتی شی ہے۔ لہٰذا جس طرح ہر قیمتی چیز کو چھپا کر رکھا جاتا ہے اور اسکی حفاظت کی جاتی ہے اسی طرح عورت کی بھی حفاظت کی جائیگی اور یہ ذمہ داری مرد کے اوپر ہے۔

(۲) عورت مردوں کی کھیتی ہونیکی وجہ سے نفقہ سکنی اور جملہ ضروریات زندگی میں مردوں کی محتاج ہے اور مرد اس کا ذمہ دار ہے۔

(۳) یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ساری خوبیوں کے باوجود عورت میں کچھ

فطری کمزوریاں ہیں جنھیں نظرانداز کرنا ضروری ہے۔اس لئے اسلام نے مرد کو پہلے ہی بتا دیا ہے کہ دیکھو جس سے تم میثاق غلیظ باندھنے جارہے ہو اس کی فطرت ٹیڑھی ہے۔تم زندگی بھر اس کے ساتھ احسان کرو اگر ایک دن بھی اس نے کوئی کمی محسوس کی تو فوراً کہے گی "ما رأیت منك خیراً قط" میں نے تو تم سے آج تک کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں، یہ عورت کی فطرت ہے کہ ذرا سی بات پر زندگی بھر کے احسان پر پانی پھیر دے گی۔

سورہ یوسف کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عورت تمہارے ساتھ حیلہ جوئی اور فریب بھی کرسکتی ہے اور ایسا الجھا ئیگی کہ تمہاری آئی عقل غائب ہو جا ئیگی۔عزیز مصر کی بیوی جب دعوت معصیت میں کامیاب نہیں ہوئی تو اپنا الزام یوسف علیہ السلام کے سر تھوپ دیا اور ایک نا کردہ گناہ کے الزام میں انھیں حوالۂ زنداں کردیا گیا۔

سورۂ تحریم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ افشاء راز بھی عورتوں کی فطری کمزوریوں میں داخل ہے۔شہد یا ماریہ قبطیہ کے واقعۂ تحریم میں آپ نے حضرت حفصہ کو تاکید کردی تھی، کہ دیکھو یہ راز ہے کسی کو بتانا مت۔لیکن حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ کو بتا دیا اور راز فاش ہوگیا۔آسمان سے بصورت وحی سرزنش نازل ہوئی لیکن آپ نے چشم پوشی اور اعراض سے کام لیتے ہوئے بعض کو ظاہر کیا اور بعض سے اعراض کیا۔کیوں؟ اس لئے کہ آپ کو معلوم تھا کہ عورتوں کی فطری کمزوریوں میں افشاء راز بھی ہے، البتہ مرد کی عظمتِ نفس کا تقاضا ہے کہ وہ خوردہ گیری سے پرہیز کرے۔قرآن پاک میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔"فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ " (٣/٦٦) معلوم ہوا کہ عورتوں کی ہر غلطی پر مواخذہ کرنا مرد کی شان اور عظمت کے خلاف ہے۔

خیر کی وصیت:

کتاب وسنت میں عورتوں کی ان کمزوریوں کی طرف اشارہ کرنا اس بات کی تعلیم دینا ہے کہ ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے یہ یقین کر لینا چاہئے کہ عورتوں کی کمزوریوں سے تمہیں بار بار سابقہ پیش آئیگا۔ اس کے باوجود تمہیں عفو ودر گذر سے کام لیتے ہوئے حسن سلوک اور حسن معاشرت سے پیش آنا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا:

أَلْمَرْأَةُ كَالضِلَعِ إِنْ أَقَمْتَهَا كَسَرْتَهَا وَإِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا إِسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَفِيهَا عِوَجٌ.

یعنی عورت کی مثال پسلی کی ٹیڑھی ہڈی کی طرح ہے اگر تم اسے سیدھی کرنا چاہو تو ٹوٹ جائیگی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو کجی ہوتے ہوئے ہی اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ گویا سیدھی کرنے کے چکر میں مت پڑو۔ آپ نے اپنی حیات مبارکہ کی آخری وصیتوں میں فرمایا تھا۔ "إِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيراً" عورتوں کے حق میں خیر کی میری وصیت قبول کرلو۔

کیسی رحیمانہ اور شفیقانہ تعلیم ہے۔ عورت کی کج فہمی بلاشبہ مسلم ہے، لیکن اس سے بڑھ کر وہ انتفاع اور سکون قلب کا سامان ہے۔ لہٰذا اپنی نگاہ اس سے انتفاع پر رکھو نہ کہ اسکی کج فہمی پر۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَن تَكْرَهُوا شَيْئاً وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْراً كَثِيراً﴾ (النساء:١٩)

یعنی عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت سے پیش آؤ گو تم ان کی کسی عادت کو

معیوب جانو اس لئے کہ ایسا بہت ممکن ہے تم کوئی چیز بری جانو لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی میں خیر کثیر کا سامان رکھا ہو۔

دنیا میں انسان کے تعلقات مختلف نوعیّتوں کے ہیں لیکن زوجین کے درمیان جو تعلق ہے وہ نہایت گہرا اور جذباتی قسم کا ہے۔ اس لئے شریعت بیضاء نے مساوات کی بنیاد پر دونوں کے حقوق اور دائرہ کار کو واضح طور سے تقسیم کر دیا ہے۔ مرد کو بیرون خانہ محنت، مشقت، بھاگ دوڑ اور نان نفقہ کا مکلف کیا گیا اس لئے کہ اس کے ساتھ حیض ونفاس یا ولادت ورضاعت کا جھمیلا نہیں تھا نیز مرد عورت کے مقابل زیادہ قوی اور طاقتور ہے اس لئے اس کی فطرت کا تقاضا تھا کہ اس کو مشکل امور کا مکلف کیا جائے۔ اور عورت مرد کے مقابل کمزور ہے، اس کے ساتھ حجاب، حیض ونفاس اور ولادت ورضاعت کے مسائل ہیں اور یہ ایسے امور ہیں جو اخفاء کے متقاضی ہیں اس لئے عورت کی فطرت کا تقاضا تھا کہ وہ پردے کے ساتھ اندرونِ خانہ رہ کر گھریلو انتظامات، بچوں کی تربیت، مال کی حفاظت، مہمانوں کی ضیافت اور آرام وآسائش کا سامان فراہم کرے، دونوں کی جسمانی ساخت کے مطابق یہ تقسیم کار دراصل فطری مساوات ہے اور اس کے خلاف ہر تقسیم ظلم ہے۔

امام بخاریؒ نے زوجین کے حقوق اور ذمہ داریوں کے تعلق سے چند ابواب قائم کئے ہیں اور استدلال میں مناسب حدیثیں پیش کی ہیں۔ حدیثوں کا ذکر طول کا باعث ہوگا۔ اس لئے کچھ ابواب کا مفہوم سماعت فرمائیں۔

(۱) مرد پر بیوی کا خرچ دینا واجب ہے۔

(۲) شوہر موجود نہ ہو تب بھی عورتوں اور بچوں کا خرچ دینا واجب ہے۔

(۳) جب شوہر پورا خرچ نہ دے تو عورت کو یہ حق ہے کہ دستور کے مطابق شوہر

کے مال سے اتنا لے سکتی ہے جو اس کو اور اس کے بچوں کو کافی ہو۔

(۴) عورت کو دستور کے مطابق کپڑا اور لباس دینا شوہر پر واجب ہے۔

(۵) آدمی اگر تنگ دست ہو تب بھی وہ اپنی بیوی کا خرچ دے گا۔

مذکورہ مسائل صحیح احادیث اور قرآن کریم کی آیات سے ثابت ہیں اس لئے علماء اسلام کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ عورت کے اوپر کسی قسم کے خرچ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ تو وہ ابواب تھے جن میں مرد کی ذمہ داریوں کو بتایا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کلی طور پر آزاد ہے۔ اندرون خانہ رہ کر عورت کی ذمہ داریاں کیا ہیں ان کو بھی امام بخاریؒ نے واضح کیا ہے سماعت فرمائیں۔

(۱) عورت اپنے شوہر کے گھر میں کام کاج کرے گی۔

(۲) عورت اپنے شوہر کے مال کی حفاظت کرے گی اور اس مال کی بھی حفاظت کرے گی جو شوہر نے اس کو خرچ کے لئے دیا ہے۔

(۳) عورت اولاد کی تربیت اور پرورش میں اپنے شوہر کی مدد کرے گی۔

شرعی نقطۂ نگاہ سے عورت کی حیثیت متعین ہو جانے کے بعد آیئے دیکھا جائے کہ عورت جب بحیثیت بیوی ہو تو ہماری شریعت نے اسے کیا مقام دیا ہے۔

شادی کے اہم مقاصد میں ہے جائز طریقہ سے افزائش نسل، تسکین قلب، تہذیب و ثقافت کا فروغ، ایک مقدس اور پاکیزہ خاندان کا معاشرہ میں اضافہ اور اللہ کی نعمتوں کے حصول میں ایک دوسرے کا جائز تعاون۔ یہ مقاصد اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب رشتۂ ازدواج کو دوام اور ثبات حاصل ہو جس کو قرآن حکیم نے میثاق غلیظ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی لئے نبی رحمت ﷺ نے رشتۂ نکاح کے مسائل اور زوجین کے درمیان پیش آنے والے نشیب و فراز کو تفصیل سے واضح کر دیا ہے اور ہر ممکن

طریقہ سے گھیرابندی کردی ہے کہ رسّی ٹوٹنے نہ پائے۔

لیکن اس کے باوجود اگر مزاج اور طبیعتوں کے اختلاف کیوجہ سے نباہ کی صورت ممکن نہ ہو تو کسی کی زندگی خراب بھی نہیں کی جائیگی۔اس بندھن کو کھولنے کیلئے مرد کو طلاق اور عورت کو خلع کی اجازت دی گئی ہے اور دونوں کا طریقہ واضح کردیا گیا ہے۔

طلاق:

طلاق مرد کا تنہا حق ہے لیکن مرد اپنے اس حق کو استعمال کرنے میں آزاد نہیں ہے۔طلاق کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایسا طہر جس میں جماع نہ کی گئی ہو صرف ایک طلاق دی جائے اور پھر اس کے بعد عورت کو عدت گذارنے کیلئے اپنے گھر میں رکھا جائے۔اس کا نان نفقہ برداشت کیا جائے۔ یہاں تک کہ تین حیض کی مدت پوری ہوجائے اور عورت ایک طلاق رجعی کے ذریعہ نکاح سے باہر ہوجائے۔ یہ پابندیاں اس لئے عائد کی گئیں کہ شوہر کو زیادہ سے زیادہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کا موقع ملے۔اور عدت کے اندر رجوع کرسکے بالفرض اگر عدت کے اندر رجوع نہیں کرسکا لیکن عدت گذرنے کے بعد ہوش آگیا تو عقد جدید کے ذریعہ اپنا گھر بسا سکے اور تحلیل شرعی کی ضرورت نہ پیش آئے، یہ طلاق کا شرعی طریقہ ہے۔لیکن ہمارا معاشرہ طلاق کے بارے میں کیا کرتا ہے؟ اسے سنئے! ۹۵ فیصد ہمارا معاشرہ اس شرعی طریقہ کو جانتا ہی نہیں اور بعض جاننے والے بھی اس طریقہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہ عام وباء ہے کہ طلاق دیتے وقت ہم حیض اور طہر اسی طرح جماع اور عدم جماع کا کوئی لحاظ نہیں کرتے، کتنی طلاق دی جائے؟ یہ بھی ہم نہیں جانتے، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ایک

ساتھ تین طلاق دینی ضروری ہے۔ ورنہ طلاق ہی نہیں پڑے گی۔ یہ اس لئے کہا جارہا ہے کہ جب بھی طلاق کا کوئی واقعہ سننے میں آتا ہے تو یہ کہ ایک سانس میں تین، اور بدقسمتی سے ایک طبقہ کے نزدیک تین غیر شرعی طلاق شریعت کا مقام حاصل کرلیتی ہے اور واقع ہوجاتی ہے، اس غیر شرعی طریقہ کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔

خلع:

خلع عورت کا تنہا حق ہے۔ اگر عورت سچائی کے ساتھ یہ یقین کرتی ہے کہ شرعی طریقہ پر شوہر کے ساتھ میری زندگی کا نباہ نہیں ہوسکتا، تو وہ اپنے شوہر سے جدائی کا مطالبہ کرسکتی ہے، اگر شوہر طلاق پر راضی نہ ہو تو عورت اپنی جدائی کا مالی فدیہ ادا کرے گی اور جدائی حاصل کرلے گی۔ یہ فدیہ کتنا ہوگا؟ بعض علماء نے اس کو مہر کی مقدار سے محدود کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ ظلم سے احتراز کرتے ہوئے عرف کے مطابق جس پر تراضی ہوجائے عورت اس کو ادا کرے گی اور جدائی حاصل کرلے گی، خلع کا یہ شرعی طریقہ ہے۔

لیکن ہمارا معاشرہ اس مسئلہ میں بھی افراط اور تفریط کا شکار ہے، عورت کی طرف سے یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ وہ بلا عذر شرعی محض نفس کی پیروی میں جدائی پر تلی ہوتی ہے جبکہ شوہر دین اور اخلاق ہر اعتبار سے فٹ اور مناسب ہے۔ ایسی ہی عورتوں کو اللہ کے رسول ﷺ نے ''منافقات'' سے تعبیر کیا ہے۔

شوہر کو خلع کا کوئی اختیار نہیں ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں بکثرت ایسی مثالیں ملیں گی کہ مرد نے عورت کا یہ حق چھین لیا ہے۔ اور ایسا ماحول پیدا کردیا ہے کہ گویا وہ خود خلع کا مالک ہے۔ مثلاً عورت دین، دنیا اور اخلاق ہر اعتبار سے مناسب

ہے، ہر دکھ سکھ برداشت کر کے عورت اپنے بچوں میں رہنا چاہتی ہے، لیکن ظالم اور کام چور شوہر اسکو رکھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے اطاعت وفرمانبرداری کے باوجود مسکین عورت کو غلط اتہامات سے متہم کرتا ہے، تنگ اور پریشان کرتا ہے، جلی کٹی سناتا ہے، گھر سے نکالتا اور بھگاتا ہے، دوا، علاج اور لباس وطعام میں تنگی کرتا ہے کہ عورت بھاگنے پر مجبور ہو جائے، اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے جہیز میں دیا ہوا سامان لوم، گاڑی، اور کچھ مزید مہرا میں مل جائیگا۔ ایسے لالچی اور حریص شوہر کا آپ پتہ کریں تو عام اور خاص سب میں مل جائیں گے۔ یہ معاشرے کی بدترین خرابیاں ہیں ان کو دور کر کے شریعت کے اصولوں کے نفاذ کی ضرورت ہے۔

نفقہ اور سکنی:

بتایا جا چکا ہے کہ نفقہ اور سکنی کی پوری ذمہ داری مرد کے اوپر ہے اور شئون المنازل کی ذمہ داری عورت کے اوپر ہے۔

لیکن معاشرے میں آزادی نسواں کے تصور اور پیسوں کی لالچ نے عورتوں کو اندرون خانہ سے بیرون خانہ اور پردہ سے بے پردہ کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں عورت اپنے اصل اور فطری مقام سے دور ہوتی چلی گئی۔ ایسا اگر کسی غیر مسلم معاشرے میں ہو تو کچھ زیادہ افسوس کی بات نہیں۔ لیکن جب خلاف شرع ایسا کوئی کام مسلم معاشرے میں ہوتا ہے تو افسوس ہوتا ہے۔ جہاں علم ہے، دین کا غلبہ ہے، آزادی نسواں کا کوئی تصور نہیں، مردوں کے لئے کمانے اور کھلانے کے جائز امکانات ہیں لیکن اس کے باوجود بعض مسلم معاشروں میں مرد بازاروں میں، ہوٹلوں میں اور سڑکوں پر بیٹھے سیاسی تبصرے کرتے ہیں، بے سود باتوں میں اپنا قیمتی وقت اور

صلاحیت برباد کرتے ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ پان، بیڑی، سگریٹ، چائے، بھانجی، فلم بینی اور کبوتر بازی میں پیسے ضائع کرتے ہیں، اور گھر میں عورتیں بال بچوں کی نگرانی، کھانے پکانے اور امور خانہ داری کی ادائیگی کے ساتھ کمائی بھی کرتی ہیں۔ عورت کمائے اور مرد کھائے کا مزاج اور ماحول بدلنے کی ضرورت ہے۔

ساس اور بہو:

اسلام کی پاکیزہ تعلیمات میں حقوق انسانی کا احترام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان مسلم ہو یا غیر مسلم، اپنا ہو یا بیگانہ ہر ایک کی جان، مال اور عزت و آبرو اسلام کی نگاہ میں محترم ہے، اور یہ احترام اس وقت اور زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے جب دینی بھائی ہو، اپنا پڑوسی یا رشتہ دار ہو ایسی صورت میں عام حقوق انسانی کے ساتھ پڑوسی کے حقوق، رشتوں ناتوں کے ساتھ صلہ رحمی اور اخوت کے حقوق مزید مستحکم ہو جاتے ہیں۔ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر آپ ساس اور بہو کے تعلقات پر غور کریں تو حد درجہ مایوسی ہوگی۔ یہ کوئی قاعدہ کلیہ تو نہیں لیکن عام تاثر یہ ہے کہ سوتیلی ماں جس طرح اپنے سوتیلے بیٹے اور بیٹیوں کو نہیں برداشت کر سکتی اسی طرح ساس بہو کو برداشت نہیں کر پاتی۔ الا ماشاءاللہ

جب عورت شادی کے بعد نئے گھر میں قدم رکھتی ہے تو اس کے شوہر کے ساتھ ساتھ شوہر کے والدین، اس کے بھائی بہن اور دوسرے اعزہ و اقارب سے سابقہ پیش آتا ہے۔

ایسے وقت میں نو بیاہتا کا فرض ہے کہ اب وہ اس نئے گھر کو اپنا گھر جانے اور شوہر کے والدین اور بھائی بہنوں کو اپنے والدین اور بھائی بہن کا بدل جانے اور

اپنے حسن کردار سے ہر ایک کا دل جیتنے کی کوشش کرے۔

دوسری جانب شوہر کے والدین اور بھائی، بہن کا فرض بنتا ہے کہ محبت اور شفقت سے، نرم مزاجی اور شیریں کلامی سے، عفوو درگذر سے، اغماض اور چشم پوشی سے اس نووارد دلہن کا استقبال کریں اور اپنے ماحول میں ضم کریں۔ انسانیت کا اور اسلامی تعلیمات کا یہی تقاضا ہے۔

اب آیئے دیکھا جائے کہ ہمارا معاشرہ کیا نمونہ پیش کرتا ہے؟ شادی کے بعد عورت جب اپنی سسرال میں رہنے لگتی ہے۔ تو ابتداءً اسکی اصطلاح میں ماں، باپ، اور بھائی بہن سے مراد اس کے اپنے حقیقی والدین اور بھائی بہن ہوتے ہیں اور گھر سے مراد اس کا اپنا میکہ ہوتا ہے اور جب شوہر کے والدین اور بھائی بہن مراد لینا ہوتو اس کے ساتھ لفظ ''آپ'' کا اضافہ کرے گی اور یہ اصطلاح اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اس کی جوانی ڈھل نہیں جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز تخاطب غیریت کا پتہ دیتا ہے۔

ایک عام مشاہدہ یہ بھی ہے کی عموماً سسرال میں کام دھندے کی زیادتی کی شکایت رہتی ہے اور خدمات کی انجام دہی میں تقدیم وتاخیر بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اسی عورت کو جب میکہ جانا ہوتو ہر کام میں تیزی آجائیگی ہاتھ پاؤں کی رفتار بڑھ جائیگی، جو کام دو گھنٹہ میں ہونا ہے وہ ایک گھنٹہ میں ہو جائیگا۔ یہ تو بہو کا حال ہے، ساس اور نند کے طرز عمل پر نظر کی جائیگی تو صورت حال اس سے بھی نا گفتہ بہ نظر آئیگی اپنی بیٹیاں تو گھر چھوڑ کر ایک دن دوسرا گھر سنبھال لیں گی اور مستقبل میں گھر بسانے کی ساری ذمہ داری آنے والی بہو پر ہوگی اس لئے ہونا تو یہ چاہیئے کہ ساس کا برتاؤ بہو کے حق میں بیٹی سے بڑھ کر مشفقانہ ہو۔ لیکن کم ہی ایسی ساس ہوں گی جو بہو کو بیٹی کا درجہ دیتی

ہوں گی۔ بیٹی سے بڑھ کر جاننا تو دور کی بات ہے۔ قسم قسم کی خوردہ گیری، بات بات پر جھڑکنا، ہر کام میں بلا وجہ نقص نکالنا، ناکردہ گناہ کو گناہ بنا کر پیش کرنا بہوؤں کے حق میں ساس کا عام وطیرہ ہے۔ اور بہو کے مقابل بیٹی کی غلطیوں کو خوبی بنا کر پیش کرنا، بے جا حمایت کرنا ساس کے معاشرے میں عام چلن ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متحدہ عائلہ بہت جلد منتشر ہو جاتا ہے اور اتحاد کی صورت میں جو برکت ہوتی ہے وہ اٹھ جاتی ہے۔ بیٹا بیوی کی محبت میں ماں باپ کا نافرمان ہو جاتا ہے اور بھائی بہن کا دشمن ہو جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ غلطیاں یکطرفہ ہوتی ہیں، امکان دونوں طرف سے ہے کسی طرف سے کم اور کسی طرف سے زیادہ، اسی لئے مشہور ہے ساس بہو کا جھگڑا۔ اس فساد کا سبب اسلام کی عائلی زندگی سے عدم واقفیت ہے۔ اس لئے ہر گھر میں اسلام کی تربیتی فکر کو عام کرنیکی ضرورت ہے۔

جہیز:

جہیز ہندوستانی معاشرے میں ایک بہت بڑی مصیبت اور لعنت ہے اور یہ مصیبت ہندو دھرم کے مذہبی نقص کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس دھرم میں باپ کے مال اور جائداد میں بیٹی کا مذہباً کوئی حق نہیں ہے اس لئے اس مذہبی حق تلفی کی تلافی جہیز لے کر اور دے کر کی جاتی ہے۔ جبکہ مذہب اسلام میں مردوں کی طرح عورتوں کو باپ، شوہر، بیٹا، بیٹی کے مال میں باقاعدہ حق دار قرار دیا گیا ہے۔ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اکثر مسلم معاشرے میں عورت کا شرعی حق دینے سے اعراض کیا جاتا ہے اور اگر کسی لڑکی نے باپ کی جائداد میں اپنا حصہ بٹوا لیا تو بھائیوں اور چچاؤں کی نگاہ میں وہ معتوب ہو جائے گی، ایسے متعدد واقعات ملیں گے کہ اس لڑکی کا میکہ ہمیشہ

کے لئے چھوٹ گیا۔ واجب حق دینے میں یہ اعراض اور جہیز جس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں ہے اس کے جال میں مسلم معاشرہ ایسا پھنس گیا ہے کہ امیر غریب سب تڑپ رہے ہیں۔

جہیز کی گراں باری نے کتنے والدین اور کنبوں کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا، کتنوں کو مقروض اور بے گھر کیا، کتنی لڑکیاں فرار ہوگئیں کتنی فروخت ہوگئیں، کتنوں نے پھانسی کا پھندا چوما، شب زفاف کے انتظار میں کتنوں کی جوانی ڈھل گئی اور کتنی بستر مرگ پر کروٹ بدل رہی ہیں؟ جتنا کچھ کہا جارہا ہے اس سے کہیں زیادہ تجربہ اور مشاہدہ کیا جارہا ہے۔ اس مصیبت میں گرفتار مسلم معاشرہ الامان والحفیظ کی دہائی دے رہا ہے، حکومت گلا پھاڑ پھاڑ کر جہیز کی خطرناکی کا اعلان کررہی ہے، لالچی شوہروں کو جیلوں میں بند کیا جارہا ہے، سزائیں دی جارہی ہیں لیکن ہم ہیں کہ سب کچھ جانتے ہوئے تدارک کی کسی صورت پر آمادہ نہیں ہیں۔

تفصیل کی گنجائش نہیں لیکن اتنا بتادینا بے محل نہیں ہوگا کہ اسلام نے آسان اور کم خرچ میں شادی کا حکم دیا ہے خصوصاً عورتوں اور ان کے والدین کو کسی قسم کی زیرباری سے آزاد رکھا ہے۔ کیا اسلامی تعلیمات کے اس پس منظر میں جہیز جیسی جان لیوا زیرباری کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ چند حدیثیں سماعت فرمائیں اور خود فیصلہ کریں۔

(۱) رسول ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے ان کی شادی کے بعد پوچھا ”کَم سُقتَ إِلَیهَا“ تم نے اپنی بیوی کو کیا دیا؟ آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ تم کو بیوی نے جہیز میں کیا دیا؟ اور ہمارا معاشرہ یہ ہے کہ بارات واپس آنے کے بعد ہر مرد عورت کی زبان پر ہوگا کیا ملا؟ اندازہ کیجئے شریعت اور معاشرے کے تضاد کا؟

(۲) ایک انصاری نے رسول ﷺ سے کہا میری شادی کرادیجئے! آپ نے کہا

کیا دو گے؟ اس نے کہا میرے پاس کچھ نہیں ہے آپ نے کہا! لو ہے کہ ایک انگوٹھی ہی تلاش کر کے لے آؤ۔ اس نے کہا یہ بھی نہیں ہے آپ نے قرآن پاک کی کچھ سورتیں یاد کرانے کے عوض شادی کرا دی۔

دیکھا آپ نے کتنی آسان ہے اسلام کی شادی؟ اور دیکھا آپ نے کہ رسول ﷺ نے عورت سے نہیں پوچھا کہ تم کیا دو گی؟ اس لئے کہ مہر یا ہدیہ اور تحفہ دینا مرد کا کام ہے نہ کہ عورت کا۔

(۳) حضرت ام سلیمؓ کی شادی حضرت ابوطلحہ سے صرف قبول اسلام کی شرط پر ہوئی تھی۔ اور یہ مطالبہ بھی ام سلیم کی طرف سے تھا، اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی مطالبہ ہو سکتا ہے تو وہ عورت کی طرف سے نہ کہ مرد کی طرف سے۔

(۴) امیمہ جو آپ کے عقد میں آ چکی تھی اس کو جب آپ نے رخصت کرنا چاہا تو آپ نے حضرت ابواسیدؓ سے فرمایا "اُكْسُهَا رَازِقِيَّيْنِ وَأَلْحِقْهَا بِأَهْلِهَا" یعنی آپ نے ابواسیدؓ سے کہا اس کو دو رازقی کپڑے دے دو اور اس کے گھر پہنچا دو۔ حدیث سے جب مطلقہ کو کچھ دینا ثابت ہو رہا ہے تو منکوحہ سے لینا کیسے ثابت ہو جائے گا؟

جہیز کے مجوزین حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی سے استدلال کرتے ہیں اس لئے کہ رسول ﷺ نے ان کو شادی میں تین سامان دیا تھا اور حدیث میں "جہیز" کا لفظ آ گیا ہے لہٰذا جہیز کا ثبوت ہو گیا۔ لیکن یہ استدلال کئی وجہوں سے باطل ہے۔

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کی کفالت میں تھے۔ شادی کے بعد ان کا گھر آپ نہیں بسائیں گے تو کون بسائے گا؟ اس لئے آپ نے اثاث البیت کے طور پر

تین سامان دیا تھا۔ یہ توجیہ اس صورت میں ہے جب سامان آپ کا مانا جائے۔ ورنہ

(۲) آپ نے حضرت علی کی حطمیہ درع فروخت کر کے یہ سامان خریدا تھا۔ لہٰذا جس کا پیسہ اس کا سامان، نہ آپ کا پیسہ تھا نہ آپ کا سامان۔

(۳) حضرت فاطمہؓ کے علاوہ آپ کی تین بیٹیاں اور تھیں۔ بتایا جائے کہ آپ نے ان کو جہیز میں کیا دیا تھا؟ آپ ایسی ناانصافی تو نہیں کر سکتے کہ ایک بیٹی کو جہیز دیں اور تین کو نہ دیں۔

(۴) اگر ''جہیز'' کا لفظ دیکھ کر مروجہ جہیز پر استدلال کرنا جائز مان لیا جائے تو لازم آئے گا مطلقہ کو رخصت کرتے وقت شوہر اپنی مطلقہ کو جہیز دے کر رخصت کرے اس لئے کہ صحیح بخاری کی جس روایت میں امیمہ کے طلاق کا ذکر ہے اس میں ''فَأَمَرَ أَبَا أُسَيدٍ أَنْ يُجَهِّزَهَا'' کا لفظ آیا ہے۔

مذکورہ بحث سے ثابت ہوا کہ مروجہ جہیز کا کتاب وسنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے اور جہیز کے نام پر ہمارے معاشرے میں جو مول تول کیا جا رہا ہے وہ سراسر ناجائز اور روحِ شریعت کے منافی ہے، عورتوں کے ساتھ کھلا ظلم اور ان کی شادی میں مانع ہے۔ اور یہ ظلم اسی وقت رک سکتا ہے جب سماج کا ہر فرد امیر، غریب، عام خاص، اور عالم جاہل سب کمر کس کر اس ظلم کے روکنے پر آمادہ ہو جائیں۔ واللہ ولی التوفیق

☆☆☆

طلبہ سے خطاب

نکات:

(۱) علم کی فضیلت۔

(۲) رشتۂ شاگردی۔

(۳) مرضی کے خلاف اطاعت۔

(۴) استاد کی شفقت۔

(۵) مشورے پر اصرار نہیں۔

علم کی فضیلت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلاَئِکَةِ إِنِّیْ جَاعِلٌ فِیْ الأَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِیْهَا مَن یُفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ قَالَ إِنِّیْ أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ﴾ (۲/ ۳۰)

ترجمہ: اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں تو ان لوگوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا جو وہاں فساد مچائیں گے اور خونریزی کریں گے، جبکہ ہم تیری تسبیح، تحمید اور تقدیس کیلئے کافی ہیں۔ اللہ تعالی نے فرمایا: میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

دوسری جگہ فرمایا: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اقْرَأْ وَرَبُّکَ الْأَکْرَمُ، الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ

يَعْلَمْ ﴾ (سورہ علق:۱۔۵)

ترجمہ: پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا تو پڑھتا رہ تیرا رب بڑے کرم والا ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ جس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

تیسری جگہ فرمایا: "فاعلم أنه لا الٰه إلا الله"

ترجمہ: تم جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

تین آیتیں علم کی فضیلت کے تعلق سے آپ کو سنائی گئی ہیں پہلی آیت کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسان کی تخلیق مربوط ہے علم سے اور علم وہ چیز ہے جو سب کو جھکا کر رکھتی ہے۔

دوسری آیت پر غور کریں تو معلوم ہوگا اسلام کی ابتداء "اقرأ" یعنی حصول علم سے ہے۔

تیسری آیت پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ وہی علم، علم ہے جس پر توحید کا پہرہ ہو۔

نبی کریم ﷺ کی حدیث "مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللهُ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَصَابَ اَرْضاً. الحديث" پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلام سراپا علم ہے۔

توحید کو اصل علم قرار دینا اس لئے ہے کہ اگر علم سے توحید کا پہرہ ہٹا دیا جائے تو اس علم سے جو چیز وجود میں آئیگی وہ سراپا فساد ہوگی۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ علم میں دنیا بے حد ترقی کر چکی ہے لیکن یہ علم ایسا ہے جس پر توحید اور آخرت کا پہرہ نہیں ہے اس لئے عصر حاضر کے علم کا منتہاء مقصود یہ ہے کہ کیسے کسی کو مٹایا جائے۔ ہر ترقی یافتہ ملک ہتھیار کی دوڑ میں دوسرے پر سبقت لیجانا چاہتا ہے، سائنسی علوم کا آخری نتیجہ

تسلط، تغلب، تفوق اور تعلّی ہے، شور ہے دہشت گردی کا، لیکن دہشت کا شور بہانہ ہے کسی پر تسلط کا اور کسی کو مٹانے کا۔

آیئے اب ہم علم کی فضیلت میں کچھ مزید آیتیں اور حدیثیں سناتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ (مجادلہ/۱۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کے درجات کو بلند کرتا ہے جو مومن ہیں اور جو صاحب علم ہیں۔

سورہ زمر میں ارشاد ہے: ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (زمر/۹)

ترجمہ: آپ پوچھئے کہ کیا وہ لوگ جو علم والے ہیں اور وہ لوگ جو علم والے نہیں ہیں دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔

ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (فاطر:۲۸)

ترجمہ: بیشک اللہ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

علم کی فضیلت پر قرآن پاک کی چند آیتیں آپ کو سنائی گئی ہیں۔ آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جس چیز کی تعریف پر قرآن پاک ناطق ہو جسکی خوبی پر اللہ کی گواہی موجود ہو وہ بلاشبہ چیز دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر ہوگی، دنیا کی تاریخ میں اب تک کسی نے علم نافع کی مذمت نہیں کی ہے، علم ایک ایسی دولت ہے جو سفر اور حضر ہر حال میں آپ کے ساتھ ہے، اسے کوئی چھین نہیں سکتا، اسکی چوری نہیں کی جاسکتی، علم خرچ کرنے سے گھٹتا نہیں، آپ اسے جتنا زیادہ خرچ کریں گے اتنا ہی اس میں اضافہ ہو گا، نبی کریم ﷺ نے بھی علم کی تعریف فرمائی ہے، چند حدیثوں کا مفہوم سماعت

فرمائیں۔

ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے کسی معمولی آدمی پر۔ (جامع ترمذی، العلم/۲۸۲۵)

مزید آپ نے فرمایا کہ:

جو لوگوں کو خیر (دین) کی تعلیم دیتے ہیں ان پر اللہ، اس کے فرشتے، آسمان و زمین کے سارے لوگ، یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنی بلوں میں اور مچھلیاں (پانی میں) خیر کی دعائیں کرتی ہیں۔ (جامع ترمذی، العلم/۲۸۲۵)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں وہ درہم اور دینار کی وراثت نہیں چھوڑ کر جاتے علم کی وراثت چھوڑتے ہیں لہٰذا جس نے علم حاصل کرلیا اس نے پورا حصہ پالیا۔ (جامع ترمذی العلم/۲۸۲۲)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، مگر تین چیزیں ایسی ہیں جو مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں۔

(۱) صدقہ جاریہ (۲) علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں

(۳) نیک اولاد جو والدین کے لئے دعاء کرتی رہے۔ (جامع ترمذی، احکام/۱۳۹۰)

معلوم ہوا کہ علم ایسی لازوال نعمت ہے کہ اگر مرنے والے نے کوئی علمی سلسلہ چھوڑا ہے، دینی ادارے کی شکل میں، دینی کتابوں کی شکل میں، طلبہ وطالبات کی شکل میں تو جب تک اس کا یہ علمی سلسلہ باقی رہے گا اس کا ثواب ملتا رہے گا۔

قرآن وحدیث کے اندر علم کے بیان کردہ فضائل کے پیش نظر صحابۂ کرام،

خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم ہمیشہ علم اور صاحب علم کی سرپرستی فرمایا کرتے تھے، ان کی عزت اور تکریم کرتے تھے، چھوٹا اور کمسن ہوتے ہوئے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں صاحب علم بڑا ہوتا تھا اور اسے اپنی مجلسوں میں اپنے قریب بٹھایا کرتے تھے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس وہ صحابی ہیں جن کے علمی شوق کو دیکھ کر اللہ کے نبی ﷺ نے ان کے حق میں دعا فرمائی تھی "اللھم فقھہ فی الدین"

اے اللہ انھیں دین کی سمجھ عطا فرما۔ اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمالی اور عبداللہ بن عباس کو اللہ نے علم دین کا وافر حصہ عطا فرمایا آپ کو حبر الامۃ اور رئیس المفسرین کے القاب سے ملقب کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انھیں اپنی مجلسوں میں اپنے پاس بٹھایا کرتے تھے۔ عمر کم تھی اس لئے بعض صحابہ نے حضرت عمرؓ سے اعتراض کیا اور کہا: اس بچے کی عمر کے تو ہمارے بچے ہیں آپ ہم بڑوں کی مجلس میں اس بچے کو کیوں بٹھاتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا آپ لوگ جانتے ہیں میں کیوں بیٹھاتا ہوں؟ ویسے کسی دن واضح کردوں گا۔ ایک دن مناسب موقع آ گیا۔ حضرت عمر نے حاضرین صحابہ کرام سے پوچھا، بتاؤ: "اذا جاء نصر اللہ والفتح" اس سورہ کا کیا مطلب ہے؟ لوگوں نے ادھر ادھر کا مطلب بتایا۔ اخیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا۔ انھوں نے کہا: اس سورہ میں اللہ تعالی نے آپ کو آپ کی موت کی خبر دی ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا: "ما اعلم منھا الا ما تعلم" اس سورہ کا جو مطلب تم جانتے ہو وہی میں بھی جانتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر علم ہے تو آدمی کم عمر ہوتے ہوئے بھی بڑا ہے۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں علم کے حصول کی اہمیت اور فضیلت سنائی

جا چکی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث ہی کی روشنی میں معلم اور متعلم کے آداب، شفقت ومحبت اور اطاعت وفرمانبرداری کا کچھ نمونہ بھی آپ کے سامنے رکھ دیا جائے تاکہ دوران تعلیم پیش آنے والے نشیب وفراز سے گذرنے میں آسانی ہو۔

لیجئے درسگاہ نبوت کے ایک مشہور طالب علم کا واقعہ ہم آپ کو سناتے ہیں۔

آپ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا نام سنا ہوگا۔ان کا کام صرف اتنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لگے رہتے تھے آپ جو فرماتے اسے یاد کرلیتے۔اس کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہیں تھا۔نہ بیوی بچے تھے نہ کوئی تجارت اور کاروبار تھا۔کھانے کا وقت ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے یا کسی اور صحابی نے کھلا دیا تو کھالیا کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی نے دھیان نہیں دیا اور بھوک سے بیقرار ہو گئے اسی طرح کا اپنا ایک واقعہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں بھوک سے نڈھال ہو چکا تھا۔میری آواز نہیں نکل رہی تھی،شرم وحیا مانع تھی اس لئے سیدھے کسی سے کھانا مانگ بھی نہیں سکتا تھا۔بھوک کے اظہار کے لئے میں نے ایک صورتَ یہ نکالی کہ راستے پر بیٹھ گیا۔حضرت عمرؓ کا گذر ہوا۔ان سے میں نے ایک آیت کا مطلب پوچھا۔انھوں نے بتایا اور گذر گئے۔آیت کا مطلب تو میں جانتا ہی تھا پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میری آواز سن کر میری بھوک کا اندازہ کرلیں اور کھانے کا انتظام کردیں لیکن مقصد نہیں سمجھ سکے مطلب بتا کر چلے گئے۔اتنے میں رسول اللہ ﷺ کا گذر ہوا دیکھتے ہی آپ سمجھ گئے اور فرمایا: ابوہریرہ آؤ۔میں آپ کے ساتھ ہولیا۔آپ گھر گئے، پتہ کیا تو معلوم ہوا ایک پیالہ دودھ کہیں سے ہدیہ میں آیا ہے۔آپ نے فرمایا: ابوہریرہ جاؤ جتنے اصحاب صفہ (طلبہ) ہیں سب کو بلا کر لے آؤ۔ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اصحاب صفہ بھی میری ہی طرح بے سہارا ہوا کرتے تھے،آپ کا یہ حکم سن کر میری تو جان سوکھ گئی کہ اصحاب صفہ کے بیچ اتنا

سا دودھ کیا ہوگا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ دودھ صرف مجھے دیا جاتا میں پی کر اپنی بھوک مٹاتا اور جان بچاتا۔ لیکن اللہ کے رسول ﷺ کا حکم تھا، خیر میں گیا اور سب کو بلا کر لایا، جب سب لوگ آ گئے تو حکم ہوا سب کو پلاؤ، یہ مرحلہ میرے لئے اور کٹھن گذرا لیکن کروں کیا۔

”ولم يكن من طاعة الله و طاعة رسوله ﷺ بد“

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ حکم کے مطابق باری باری سب کو پلانے لگا۔ اس دوران میرے دل میں خیال گذرتا میری باری آتے آتے پتہ نہیں مجھے ملے گا یا نہیں؟ خیر سب نے پی لیا اور اب نبی ﷺ کی باری تھی۔ میں نے پیالہ آپ کے دست مبارک میں رکھ دیا۔ آپ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا ”بَقِيتُ أنا و أنتَ“ صرف میں اور تم باقی رہ گئے۔، میں نے کہا: صحیح فرما رہے ہیں اے اللہ کے رسول! آپ نے کہا ”اُقْعُدْ وَ اشْرَبْ“ بیٹھ جاؤ اور اب تم پیو، میں بیٹھ گیا اور پیا۔ آپ نے فرمایا: ”اشرب“ میں نے پھر پیا۔ آپ مسلسل کہتے رہے اور پیو۔ اخیر میں میں نے کہا: ”لَا وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالحَق مَا أجِدُ لَه مَسْلَكاً“ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے اب گنجائش نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے دو۔ میں نے پیالہ آپ کو دے دیا آپ نے اللہ کی تعریف کی اور بسم اللہ کر کے کل دودھ پی گئے۔

(صحیح بخاری/رقاق/٦٤٥٢)

یہ حدیث جو آپ کو سنائی گئی ہے اس میں استاد اور اس کے شاگردوں کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ استاد تھے اور صحابہ آپ کے شاگرد تھے۔ درسگاہ نبوت کے معلم اور متعلمین نے اطاعت شعاری کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے وہ دنیا

کی آنکھ نے نہ دیکھا ہے اور نہ دیکھ پائے گی۔

لیکن میرے عزیز بچو! اسی درسگاہ کا ہر عمل، ہر واقعہ، ہر حکم اور ہر قول و فعل ہم مسلمانوں کے لئے اسوہ اور نمونہ ہے ہمیں کہیں اور تاکنے جھانکنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہم کو اس کی ضرورت ہے، آیئے اس حدیث کی روشنی میں چند باتیں ہم آپ کو سمجھانا چاہیں گے۔

رشتۂ شاگردی:

استاد اور شاگرد کے درمیان ایک روحانی رشتہ ہوتا ہے اور یہ رشتۂ طہارت، پاکیزگی، اخلاص، اخوت اور اخلاق کریمانہ کی زمین پر استوار ہوتا ہے۔ فرماں برداری اور اطاعت شعاری کا جو نمونہ استاد اور شاگرد میں پایا جاتا ہے وہ شاید باپ اور بیٹے میں بھی نہیں پایا جاتا۔

استاد اور شاگرد کا رشتہ نسبی رشتوں کی طرح اتنا مضبوط اور قوی ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی مرحلہ میں یہ رشتہ منقطع نہیں ہوسکتا۔ استاد اور شاگرد کے درمیان ذاتی اختلاف تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے لیکن اگر ہو بھی جائے تو استادی اور شاگردی کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوسکتا۔ استاد، استاد رہے گا اور شاگرد شاگرد رہے گا۔ جیسے باپ باپ رہے گا اور بیٹا بیٹا رہے گا باپ اپنے باپ ہونیکا اور بیٹا اپنے بیٹا ہونیکا انکار نہیں کرسکتا، اسی طرح استاد اپنے استاد ہونے کا اور شاگرد اپنے شاگرد ہونے کا انکار نہیں کرسکتا۔ دونوں میں دوستی ہو یا دشمنی، یہ روحانی رشتہ ہمیشہ باقی رہے گا۔

مرضی کے خلاف اطاعت:

ابھی آپ نے سنا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سخت بھوک لگی تھی

آیت کا مطلب جانتے ہوئے صرف اس لئے پوچھ رہے تھے کہ میری خفیف آواز سن کر لوگ سمجھ جائیں اور مجھے کھانا کھلا کر آسودہ کر دیں۔ اسی بھوک کو مٹانے کیلئے رسول اللہ ﷺ بلا کر انھیں گھر لائے اور جب دودھ کا پیالہ سامنے آیا تو آپ نے فوراً انھیں نہیں پلایا بلکہ حکم دیا جاؤ اصحاب صفہ کو بلا کر لاؤ۔ ظاہر ہے یہ حکم حضرت ابو ہریرہ کی مرضی کے خلاف تھا، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''فَسَاءَ نِي ذَلِكَ فَقُلْتُ: وَمَا هَذا اللَّبَنُ فِي أهلِ الصُّفة؟ كُنتُ أحقَّ أنْ أصِيبَ مِنْ هَذا اللَّبنِ شَربةً أتقوّى بِهَا'' یہ سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا اور دل ہی دل میں میں نے کہا: اتنا دودھ اہل صفہ کے بیچ کس کام آئیگا؟ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ میں اچھی طرح یہ دودھ پی لیتا اور مجھے کچھ قوت حاصل ہو جاتی۔

معلوم یہ ہوا کہ اصحاب صفہ کا بلانا اور باری باری ان کو دودھ پلانا یہ پورا واقعہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرضی کے خلاف تھا، مگر اس کے باوجود حضرت ابو ہریرہ اطاعت وفرمانبرداری کا ثبوت دے رہے ہیں مجال نہیں کہ حکم عدولی اور سرتابی کریں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اللہ کے رسول ﷺ جو ان کے معلم اور استاد ہیں ان کا حکم ہے۔

میرے عزیز بچو! جامعہ اثریہ دارالحدیث ہو یا کوئی اور دینی اقامتی ادارہ ہو ہر جگہ طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کی ایک جماعت ہوتی ہے، اداروں میں الگ الگ مسائل ہوتے ہیں، تعلیم کے، نظام کے، نصاب کے، طعام کے، امتحان کے تعطیل کے اور ان کے علاوہ بہت سارے مسائل ہوتے ہیں، جہاں افراد ہوں گے وہاں مسائل کا ہونا ضروری ہے، اساتذہ کرام اور انتظامیہ کی جانب سے مسائل حل کئے جائیں گے، احکامات نافذ کئے جائیں گے، سارے احکامات اور قوانین آپ کے فائدے کو مدنظر رکھ کر ہی نافذ کئے جائیں گے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ آپ کی مرضی اور خواہش کے

مطابق ہوں، بہت ممکن ہے اساتذہ اور انتظامیہ کا فیصلہ آپ کی مرضی کے خلاف ہو ایسی صورت میں آپ کو کیا کرنا ہے۔ حدیث پر غور کریں آپ کو اس کا حل مل جائیگا۔ حضرت ابوہریرہ بھوک سے بیتاب ہیں لیکن پہلے اصحاب صفہ کو دودھ پلانے کا حکم دیا جارہا ہے اور حکم بھی ابوہریرہ ہی کو دیا جارہا ہے۔ اندازہ کیجئے ابوہریرہ پر کتنا شاق گذرا ہوگا۔ ہم اور آپ جیسے لوگ ہوتے تو جھٹک کر پیالہ پھینک دیتے اور کہتے بھوک مجھے لگی ہے، اسی لئے مجھے بلایا گیا ہے اور پلانے کا حکم کسی اور کو دیا جارہا ہے اور جو خود صاحب معاملہ ہے اسے نظر انداز کیا جارہا ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سر تسلیم خم ہے کہا جارہا ہے۔ ''لم یکن من طاعة اللہ ورسولہ بد'' اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

حدیث مذکور سے ہمیں سبق مل رہا ہے کہ اساتذہ کرام، پرنسپل، شیخ الجامعہ ناظم اعلیٰ اور انتظامیہ کی جانب سے اگر کوئی حکم نافذ کیا جائے اور وہ حکم آپ طلبۂ کرام کے مزاج، مرضی اور خواہش کے خلاف ہو پھر بھی آپ کو ہدایت ہے کہ اسے شرح صدر سے قبول کریں۔ اطاعت اسی کا نام ہے۔ اسی میں آپ کے لئے خیر ہے اسی میں آپ کے لئے بھلائی ہے اور اسی میں آپ کا مستقبل ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے دل میں جو خدشات پیدا ہوئے تھے کہ اتنا دودھ سب کو کیسے کافی ہوگا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ختم ہو جائے اور میں ہی نہ پی سکوں۔ یہ خدشات آپ کی برکت کے ظہور سے پہلے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ بہر حال انسان تھے بھوک کی شدت ان کے دل میں ایسے خدشات پیدا کر سکتی تھی۔ لیکن ہر حال میں تعمیل حکم کیلئے سر تسلیم خم ہے۔

استاد کی شفقت:

ابھی آپ کو بتایا گیا کہ جس طرح باپ بیٹے کا نسبی رشتہ مظبوط ہوتا ہے باپ بیٹے میں چاہے جتنی دشمنی ہو جائے رشتہ نہیں ختم ہوسکتا اسی طرح استاد و شاگرد میں شفقت ومحبت کا ماحول رہے نہ رہے استاد اور شاگرد کا رشتہ نہیں ختم ہوسکتا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ باپ جسم کی پرورش کرتا ہے اور استاد اسکی روح کی پرورش کرتا ہے، باپ صرف انسان بناتا ہے استاد اس کو انسانیت عطا کرتا ہے۔ اسی روحانی تربیت کا اثر ہوتا ہے کہ لڑکا والدین کے حکم میں ٹال مٹول کرسکتا ہے لیکن کیا مجال ہے کہ استاد کے حکم پر ٹال مٹول کرے۔ استاد اگر صالح، نیک، دیندار، اور ایمان دار ہوتا ہے تو اسکی صالحیت اور نیکی اس کے شاگرد میں غیر محسوس طریقے سے منتقل ہو جاتی ہے، اسی طرح استاد اگر ذی علم اور باصلاحیت ہوتا ہے تو اس کے شاگرد بھی باصلاحیت پیدا ہوتے ہیں، اس پس منظر میں جہاں طلبہ پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کی اطاعت وفرمانبرداری کریں وہیں اساتذۂ کرام کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے خیر خواہ اور بہی خواہ ہوں، ان پر شفقت اور محبت سے پیش آئیں، ان کے حق میں دین اور دنیا دونوں اعتبار سے مخلص ہوں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اپنے اوپر اپنے عزیز شاگردوں کو ترجیح دیں تو زیادہ مناسب بات ہوگی۔ آپ نے حدیث میں سنا کہ پیالے کا دودھ رسول اللہ ﷺ نے پہلے اپنے شاگردوں کو پلایا سب کو پلانے اور آسودہ کرنے کے بعد سب شاگردوں کا جھوٹا آپ نے پیا۔ حالانکہ اگر آپ پہلے پی کر اپنا جھوٹا شاگردوں کو پلاتے تو یہ ان کے لئے زیادہ خوشی کی بات ہوتی، اس لئے کہ صحابہ کرام آپ کا جھوٹا پینا، کھانا زیادہ پسند کرتے تھے اسکی

صراحت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں موجود ہے۔اس کا ذکر حدیث میں یوں آیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے دودھ پیا آپ کے بعد داہنی طرف والے کا حق تھا لیکن داہنی طرف عبداللہ بن عباس تھے جو ابھی بچے تھے اور بائیں طرف حضرت ابوبکرؓ تھے اس لئے حضرت عمر نے چاہا کہ پیالہ ابوبکر کو ملے، مگر حق دائیں جانب کا تھا اس لئے رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن عباس سے بائیں جانب موجود حضرت ابوبکر کو دینے کی اجازت چاہی تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اجازت نہیں دی اور کہا "لَا أُوثِرُ اَحَداً بِنَصِيبِي هَذا" میں اپنے اس حصے پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔معلوم ہوا کہ آپ کا جھوٹا پینا صحابہ کرام اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ اس لئے اگر اس مجلس میں بھی پہلے آپ پی کر صحابہ کرام کو پلاتے تو ان کیلئے زیادہ خوشی کی بات ہوتی۔لیکن ایسا نہ کر کے آپ نے اسکے برعکس کیا یعنی سب کو پلا کر آخیر میں آپ نے پیا۔یہ طلبہ پر آپ کی کمال شفقت ومحبت کا اظہار تھا اور ان کو اپنی ذات پر ترجیح دینا تھا۔

مشورے پر اصرار نہیں:

میرے عزیز بچو! حدیث کی روشنی میں آپ کو سمجھایا جا رہا ہے کہ ایک طرف سے شفقت ومحبت کا برتاؤ ہے اور دوسری طرف سے اطاعت وفرمانبرداری کا بازو جھکائے رکھنا ہے۔لیکن اس حیات مستعار میں کبھی کبھی آزمائشی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے اور ضروری نہیں کہ ان مراحل کا تعلق زمانۂ طالبعلمی ہی سے ہو، ایسا مرحلہ دوران تعلیم اور دوران تدریس کبھی بھی آسکتا ہے۔ایسے وقت میں آپ کو کیا کرنا ہے اسے ہم ایک مثال سے سمجھانا چاہیں گے امید ہے کہ غور سے سننے کی کوشش کریں گے۔آپ

کے سامنے کوئی مسئلہ آیا۔ اس میں آپ کی ایک رائے ہے اور آپ ہی کی رائے صحیح ہے، دوسری جانب سے یعنی ذمہ داران اور اساتذہ کرام کی جانب سے ایک رائے آئی جو آپ کے خلاف ہے اور غلط بھی ہے۔ ایسے وقت میں آپ سخت پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ اطاعت کریں یا بغاوت؟ اگر اطاعت کرتے ہیں تو نقصان اٹھاتے ہیں نافرمانی کرتے ہیں تو فائدے میں رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں شریعت آپ کو حکم دیتی ہے کہ آپ اپنی رائے دے کر خاموش ہو جائیے اور فیصلہ ذمہ داران اور اولی الامر کے اوپر چھوڑ دیں اگر وہ آپ کی رائے پسند کرتے ہیں اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں تو بہت بہتر اور اگر آپ کی رائے کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں تو آپ ان کا فیصلہ قبول کیجئے، اپنی رائے بھول جائیے اور مخالف رائے کو اپنی رائے سمجھ کر تسلیم کر لیجئے۔ دلیل سنئے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾

اے نبی! آپ معاملات میں لوگوں سے مشورہ کرلیا کریں اور جب ارادہ پختہ ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کریں (اور اقدام کریں)۔

غزوہ احد کا موقع ہے۔ غزوۂ بدر کا انتقام لینے کے لئے دشمن زبردست تیاری کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے والا ہے۔ آیت کریمہ پر عمل کرتے ہوئے آپ نے صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ صحابۂ کرام میں اختلاف رائے واقع ہوگیا۔ اہل الرای، تجربہ کار اور بزرگوں کی رائے تھی مدینہ کے اندر رہ کر ان کا مقابلہ کیا جائے اس لئے کہ مدینہ کی جغرافیائی حیثیت اور محل وقوع کا یہی تقاضا تھا بعد میں جنگ کی ہزیمت نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ رائے صحیح تھی۔ لیکن نوجوانوں کی رائے تھی کی اندر رہ کر مقابلہ کرنا ہماری بزدلی کا ثبوت ہوگا ہم بہادر ہیں

باہر جا کر میدان میں مقابلہ کریں گے۔ جنگی مصالح کے پیش نظر یہ رائے غلط تھی لیکن اکثریت کی رائے یہی تھی اس لئے آپ نے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور باہر جا کر لڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شکست اٹھانی پڑی اور جانی مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین ایک چالاک، تجربہ کار اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ باہر نکل کر لڑنے میں جو خطرات اور نقصانات تھے اس سے وہ واقف تھا اس لئے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ موت کے منہ میں جانے سے بہتر یہ ہے کہ اپنے آدمیوں کو لے کر اس جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی جائے چنانچہ وہ اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔

اگر جنگ کے مآل پر نظر کی جائے تو عبداللہ بن ابی کا فیصلہ صحیح تھا اور صحابۂ کرام کا فیصلہ غلط تھا۔ اسی تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غزوہ خندق کے موقع پر مدینہ کے کھلے راستے کو خندق کھود کر بند کر دیا گیا اور اندر رہ کر مقابلہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کافروں کا دس ہزار کا لشکر ایک مہینے تک اپنا سر ٹکرا کر راتوں رات بھاگ کھڑا ہوا۔

دیکھئے عبداللہ بن ابی کے یہاں اصابت رائے ہے لیکن اطاعت نہیں ہے۔ اس لئے وہ منافق قرار پایا اور اس کے بارے میں یہ وعید سنائی گئی۔

﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾

صحابۂ کرام کی رائے غلط تھی لیکن اطاعت اور فرمانبرداری پائی جا رہی تھی ان کے بارے میں عفو درگذر کی خوشخبری سنائی گئی "ولقد عفا عنهم" ہم آپ کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں اگر آپ کو اختلاف رائے سے سابقہ پڑے تو ایسی صورت میں آپ اپنی رائے دے کر خاموش ہو جائیں اپنی رائے پر کبھی اصرار نہ کیجئے اگرچہ صحیح ہو۔ اور ذمہ داران کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دیجئے اختلاف نہ کیجئے اگرچہ ان کا فیصلہ غلط ہو۔ ہاں یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں "لاطاعة فی معصية

الخالق "اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو اس میں کسی کی اطاعت نہیں کی جائیگی۔

اب اخیر میں میں ان طلبۂ کرام سے مخاطب ہوں جو اپنا ایک تعلیمی مرحلہ پورا کر چکے ہیں اور یہاں سے سند فراغت لیکر اپنے وطن کو واپس ہو رہے ہیں۔ آج ادارے کی جانب سے انھیں سند فراغت عطا کی جارہی ہے۔ سند فراغت کو صرف ایک ہلکا سا کاغذ کا ٹکڑا نہ سمجھیں، یہ سند، یہ شہادت، دین اور دنیا دونوں اعتبار سے آپ کا مقام متعین کرتی ہے۔ یہ کاغذ، ادارہ، اس کے منتظمین، شیخ الجامعہ اور اساتذہ کرام کی جانب سے اس بات کی گواہی ہے کہ اب آپ کل والے طالب علم نہیں ہیں، اب آپ قرآن وحدیث کے مستند عالم ہیں، آپ اس کے اہل ہیں کہ مسند درس پر بیٹھ سکتے ہیں، قرآن وحدیث کا درس دے سکتے ہیں۔ ادارے نے آپ پر اعتماد کیا ہے اور اسی اعتماد پر دستار فضیلت اور سند شہادت عطا کی گئی ہے، اب آپ کو خود فیصلہ کرنا ہے کہ آپ معاشرے میں کیسے رہیں، نماز پڑھیں یا فلم دیکھیں؟ تلاوت کریں یا فلمی گانے گائیں؟ اللہ کے ذکر اور دعا سے آپ کی زبان تر رہے یا فواحش اور گالیوں کے انگار اگلتے رہیں، فساد مٹائیں یا فساد مچائیں؟ اعزہ، اقرباء، محلّہ اور پڑوس کی دعائیں لیں یا بداعمالیوں سے ان کا سرنیچا کریں اور بددعائیں لیں۔ یہ فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں ہم صرف اتنا کہہ کر رخصت ہونا چاہتے ہیں کہ اپنے علم اور سند کی لاج رکھیں، والدین اور اساتذہ کرام کے لئے صدقہ جاریہ بنیں، علم کو زندگی کا نور کہا گیا ہے دعا ہے کہ آپ کے علم کی روشنی سے تاریکیاں دور ہوں، اللہ آپکا حامی و ناصر ہو، دنیا اور آخرت کی بھلائیاں نصیب فرمائے اور آپ کا مستقبل روشن کرے۔ آمین

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

پندرہویں شعبان

نکات:

(۱) ماہ شعبان کی فضیلت۔

(۲) بدعت کیا ہے۔

(۳) شب براءت ہے کون سی رات؟

(۴) حلوہ خوری۔

(۵) روحوں کی آمد۔

(۶) قبروں کی زیارت۔

ماہ شعبان کی فضیلت

آج ہم صحیح بخاری کی حدیث سے اپنا خطبہ شروع کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے:

عَـنْ عائِشَةَ رَضِیَ اللّٰه عنها قَالتْ: كَانَ رَسول اللّٰه ﷺ يَصُومُ حَتى نَقُولَ لَايُـفْـطِر، وَ يُفْطِرُ حتّٰى نَقُولَ لَايَصُومُ، وَمَا رَأيتُ رَسولَ اللّٰه ﷺ إستَكْمَلَ صِيامَ شهرٍ إلّا رَمَضَانَ وَمَا رَأيتُهُ أكْثَر صِيَاماً مِنه فِی شَعْبان،،

(صحیح بخاری، الصوم/۱۹۶۹)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نفلی روزہ اتنی کثرت سے رکھتے تھے کہ جب آپ روزہ شروع کرتے تو ہم لوگ کہتے کہ اب آپ افطار نہیں کریں گے (یعنی روزہ نہیں چھوڑیں گے) اور جب آپ روزہ چھوڑتے تو مسلسل

چھوڑتے یہاں تک کہ ہم لوگ کہتے شاید اب آپ روزہ نہیں رکھیں گے۔ اور میں نے آپ کو کسی بھی مہینے کا مکمل روزہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا سوائے رمضان کے، اور میں نے آپ ﷺ کو شعبان سے زیادہ کسی مہینے کا روزہ رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ہم نے آپ کو صحیح بخاری کی ایک حدیث سنائی ہے۔ یہ حدیث ماہ شعبان کے روزے سے متعلق ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آپ کو شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں نفلی روزہ رکھتے نہیں دیکھا۔ آپ شعبان میں کیوں بہت زیادہ نفلی روزہ رکھتے تھے علماء کرام اس کی متعدد وجوہ بیان کرتے ہیں جن میں دو کا ذکر ہم کر رہے ہیں۔

(۱) نبی ﷺ کے موجود ہونے کی وجہ سے ازواج مطہرات رمضان کے فوت شدہ روزوں کی قضاء نہیں کر پاتیں یہاں تک کہ شعبان آجاتا۔ جب شعبان آجاتا تو اب موخر کرنیکی گنجائش نہیں رہ جاتی اس لئے وہ اپنا قضاء کا روزہ رکھتیں ساتھ میں نبی ﷺ بھی نفلی روزے رکھ لیا کرتے اس لئے شعبان کا اکثر حصہ روزے کی حالت میں گذرتا۔

(۲) ''شعبان،، کو شعبان کیوں کہا جاتا ہے اسکی وجہ تسمیہ پر غور کیا جائے تو اس سے بھی شعبان میں کثرت صوم کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں شعبان کی وجہ تسمیہ کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ کہ عرب اپنی عادت کے مطابق سال بھر جدال، قتال اور لوٹ پاٹ میں مشغول رہتے لیکن حرمت کے چار مہینوں کا بہت احترام کرتے ان مہینوں میں لڑائی جھگڑا نہیں کرتے اپنے اپنے گھروں اور قبیلوں میں پڑے رہتے۔ رجب کا مہینہ بھی حرمت والا مہینہ ہے اس لئے اس مہینے کا بھی احترام کرتے اور قتل و غارت گری نہیں کرتے لیکن رجب کا مہینہ گذرنے کے

بعد شعبان کا مہینہ آتے ہی پھر اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑتے اور قتل وغارت گری کیلئے اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جاتے۔ان کے اسی تفرق کیوجہ سے شعبان کوشعبان کہا جاتا ہے،شعبان تشعب سے مشتق ہے جس کا معنی ہوتا ہے متفرق ہونا۔(فتح،ج۴)

نبی کریم ﷺ نے اس برائی کو روکنے کیلئے شعبان کے مہینے میں روزہ رکھنے کی سنت جاری کی،روزہ رکھنے سے صبر وضبط کی عادت پڑتی ہے،حرص ولالچ دور ہوتی ہے۔ظلم وتعدی جیسی قبیح عادت اپنے آپ چھوٹ جاتی ہے۔معلوم ہوا کہ ماہ شعبان میں کثرت صوم کی ایک اہم مصلحت عرب قبائل میں رائج قتل وخونریزی کو ختم کرنا ہے۔

شعبان کے مہینے میں نبی کریم ﷺ کیوں بکثرت روزہ رکھتے تھے یہ جان لینے کے بعد آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ اس مہینہ میں روزہ کیلئے کوئی دن خاص نہیں کرتے تھے اور نہ پندرھویں شعبان کے اہتمام اور استقبال میں رکھتے تھے،لیکن آج پندرھویں شعبان کی مناسبت سے ہمارے معاشرے میں بہت سارے ایسے امور انجام دیئے جاتے ہیں جن کا سنت سے کوئی ثبوت نہیں بلکہ انکا شمار بدعت میں ہوتا ہے،حالانکہ ان افعال میں بعض ایسے افعال بھی ہیں جن کا تعلق نیکی اور بر سے ہے مثلاً قبرستان جانا، روزہ رکھنا،نماز پڑھنا وغیرہ،انھیں کیوں بدعت کہا جاتا ہے،اس کو سمجھنے کے لئے پہلے ایک حدیث سماعت فرمائیں۔

بدعت کیا ہے

تین آدمی دربار رسالت میں آئے اور آپ کی عبادت کے بارے میں سوال کیا اتفاق سے آپ اس وقت موجود نہیں تھے ازواج مطہرات نے ان کو بتایا جب

آپ کی عبادت کا حال سنا تو کہا: آپ کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہیں اس کے باوجود آپ اتنی عبادت کرتے ہیں تو ہم تو بہت کم کرتے ہیں لہذا ایک نے کہا: میں رات بھر نماز پڑھتا رہوں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا کبھی روزہ نہیں چھوڑوں گا، تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے دور رہوں گا کبھی شادی ہی نہیں کروں گا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ آ گئے آپ کو پتہ چلا کہ ان تینوں نے کیا عہد کیا ہے، تو آپ نے فرمایا:

"أَنتُم الذينَ قُلتُم كَذَا وَكَذَا؟ أمَا وَ اللهِ إنّي لَأخشَاكُم لِلّهِ وَأتقَاكُم لَه لٰكِنّي أصُومُ وأُفطِرُ وَ أرقُد وَ أتزَوَّجُ النِساءَ فَمَن رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيسَ مِنّي" (صحیح بخاری)

ترجمہ: کیا تم ہی لوگوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ سنو: اللہ کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ کا خوف اور تقوی رکھتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں روزہ رکھتا ہوں، نہیں بھی رکھتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں عورتوں سے شادیاں بھی کرتا ہوں (یہ میری سنت ہے) اب جو کوئی میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔

آپ نے سنا! تینوں نے جو عہد کیا تھا وہ نیکی ہی کی نیت سے کیا تھا لیکن اس کے باوجود نبی ﷺ نے ان کے عہد کی تردید میں پہلے اپنا طریق عمل اور اپنی سنت بیان فرمائی اور اس کے بعد صاف لفظوں میں بتا دیا کہ میری اس سنت سے جو اعراض کرے گا وہ میرے راستے پر نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر جو عبادت کی جائیگی وہ عنداللہ قبولیت کا درجہ حاصل کر سکتی ہے اور جو عبادت نماز ہو یا روزہ آپ کے اسوہ اور آپ کی سنت کے خلاف ہوگی وہ مردود ہوگی۔

"مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ" (صحیح بخاری، بیوع، باب النجش)
جو شخص کوئی ایسا عمل کرے جو ہمارے حکم کے خلاف ہے تو وہ مردود ہے۔

"مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ" جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی چیز نکالی جو اس دین سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔ وہی عبادت، عبادت ہے جو نبی کریم ﷺ کے حکم کے مطابق ہو اور جو عبادت آپ کے طریقے کے خلاف ہو وہ بدعت ہے اور مردود ہے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہوگی کہ ہر وہ کام جسے نیکی اور ثواب سمجھ کر دین میں داخل کر لیا جائے حالاں کہ دین سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو بدعت کہا جاتا ہے۔ اس لئے کسی کام کو دین اور نیکی سمجھ کر کرنے سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس کا ثبوت نبی ﷺ کی سنت سے ہے یا نہیں؟ یہاں کچھ لوگ اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ تب ہر نئی چیز بدعت ہو جائیگی، ہوائی جہاز کا، ٹرین کا اور بسوں کا سفر، پختہ مکانات، پختہ مساجد اور مدارس، جلسوں اور مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال بھی بدعت ہونا چاہئے۔ میرے بھائیو! نئی ایجادات سے فائدہ اٹھانا بدعت نہیں ہے، ابھی آپ کو بتایا گیا کہ بدعت اسے کہتے ہیں جسکو عبادت جان کر دین میں داخل کیا جائے حالانکہ دین سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اور جن چیزوں کو آپ نے بطور اعتراض پیش کیا ہے اس سے محض انتفاع مقصود ہے نہ کہ ثواب۔

حضرات: یہ باتیں پیش کر کے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پندرھویں شعبان کے تعلق سے ہم نے بہت سی ایسی چیزیں ثواب جان کر ایجاد کر لی ہیں جن کا تعلق نبی کریم ﷺ کی سنت سے نہیں ہے۔

شب براءت ہے کون سی رات؟

یہ بیان کرنے سے پہلے آپ کو ایک اور حدیث سناتے ہیں اس کے بعد آپ کو بتاتے ہیں کہ شب قدر یا شب براءت ہے کہاں اور ہم مناتے کہاں ہیں؟

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو اس وقت آپ سورہ توبہ کی یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے۔

﴿اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّٰهِ﴾

ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور راہبوں کو رب بنالیا۔

اسلام لانے سے پہلے وہ نصرانی تھے انھوں نے آیت کریمہ سن کر آپ سے کہا: یہود ونصاری تو اپنے علماء کی کبھی عبادت نہیں کرتے تھے، پھر یہ کیوں آیت میں کہا جا رہا ہے کہ انھوں نے اپنے علماء کو رب بنالیا؟ نبی کریم ﷺ نے ان کو جواب دیا اور فرمایا: ہاں یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے ان کی عبادت نہیں کی لیکن یہ تو صحیح ہے نا کہ ان کے علماء نے جس کو حلال بتایا اس کو حلال مانا اور جس کو حرام کہہ دیا اس کو انھوں نے بھی حرام سمجھا، انھوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا یہی ان کو رب ماننا اور ان کی عبادت کرنا ہے۔ (جامع ترمذی، ۳۲۹۴)

اس لئے کہ حلت وحرمت کا اختیار صرف اللہ تعالی کو ہے اب اگر کوئی شخص یہی حق کسی عالم اور کسی امام کے اندر تسلیم کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے اپنے عالم کو رب کا درجہ دیدیا ہے۔ اسی کا نام شرک ہے۔ اور آیت کریمہ میں یہی بات کہی گئی ہے۔

اب اس وضاحت کی روشنی میں اگلی باتیں سماعت فرمائیں اور یہ فیصلہ کریں کہ

شعبان کے مہینے میں جو امور نیکی اور دین سمجھ کر ہم انجام دیتے ہیں وہ دین کا حصہ یعنی کتاب وسنت سے ثابت ہیں یا ہمارے نام نہاد علماء نے اپنی پیٹ پوجا کیلئے آپ کو دین کے نام پر بیوقوف بنایا ہے اور آپ کو بدعت میں مبتلا کیا ہے۔ بات ماہ شعبان اور ماہ شعبان میں نصف شعبان کی چل رہی ہے ماہ شعبان کے روزوں کی بات آپ کو بتائی جا چکی ہے اب نصف شعبان یا پندرھویں شعبان یا شب براءت کی بات سماعت فرمائیں۔

پندرھویں شعبان کے تعلق سے بہت سارے امور اور عبادات معاشرے میں رائج ہیں لوگ انھیں عبادت اور ثواب جان کر انجام دیتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک کا بھی ثبوت صحیح حدیث سے نہیں ہے۔ یہانتک کہ پندرھویں شعبان کی رات کو شب براءت یا لیلۃ القدر یا لیلہ مبارکہ کہنا بھی ثبوت کا محتاج ہے اگر آپ تحقیق کریں تو پتہ چلے گا کہ شب براءت یا لیلۃ القدر شعبان میں نہیں رمضان میں ہے۔ دلیل سنیں۔

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىَ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (سورہ بقرہ/۱۸۵)

رمضان کا مہینہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

اس آیت سے یہ معلوم ہو کہ قرآن پاک رمضان کے مہینے میں نازل ہوا۔

اب رمضان کے مہینے میں کس رات میں نازل ہوا؟ اس کے لئے دوسری آیت سماعت فرمائیں:

﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِى لَيْلَةِ الْقَدْرِ، وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ، لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ (القدر/۱۔۳)

بے شک ہم نے قرآن پاک کو لیلۃ القدر میں اتارا ہے۔ اے نبی آپ کو کیا

پتہ کہ لیلۃ القدر کیا ہے۔ لیلۃ القدر ہزار مہینے (کی عبادت) سے بہتر ہے۔

ایک اور آیت سماعت فرمائیں۔

﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ، فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾ (الدخان:۳۔۴)

ترجمہ: یقیناً ہم نے اس قرآن کو بابرکت رات میں اتارا ہے بیشک ہم ڈرانے والے ہیں، اسی رات میں ہر محکم (پختہ) کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

پہلی آیت سے آپ نے جانا کہ قرآن کا نزول رمضان کے مہینے میں ہوا دوسری اور تیسری آیت سے آپ نے جانا کہ عزت والی مبارک رات میں نازل ہوا۔ تینوں آیتوں کو سامنے رکھیں تو خود ہی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مبارک رات رمضان میں ہے۔ آپ اسے شب براءت کہیں یا لیلۃ القدر اور لیلۃ مبارکہ کہیں۔ ہر حال میں وہ رات رمضان میں ہے۔ شعبان میں ہے ہی نہیں اور جب شعبان میں ہے ہی نہیں تو پندرھویں شعبان کی رات کی اہمیت، فضیلت کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے پندرھویں شعبان کو تہوار سمجھنا، حلوہ پکانا، دکانیں بند کرنا، اچھے کھانے پکانا، غرباء فقراء کو دعوتیں کھلانا، روحوں کا آنا، روحوں کا ملانا، گھروں کی لیپائی پتائی، اگربتی سلگانا، قبرستان جانا، شب بیداری، دن کا روزہ، ہزاری نماز، قبروں کی زیارت، پٹاخوں کی دھوم، چراغاں اور آتش بازی، یہ ساری چیزیں بے ثبوت ہیں، ان میں بعض ایسی ہیں جو ہر حال میں حرام اور ناجائز ہیں، بعض ایسی ہیں جو اصلاً جائز ہیں لیکن وصفاً ناجائز اور بدعت ہیں۔ اور کچھ تو ایسی ہیں جو عقلاً اور شرعاً ہر اعتبار سے شرک ہیں۔

پندرھویں شعبان کی رات میں جو اعمال کئے جاتے ہیں ان میں صرف تین کو ہم زیر بحث لیتے ہیں اس لئے کہ وہ ہمارے معاشرے میں عموم بلویٰ کی حیثیت رکھتے ہیں اور

باقی کو چھوڑتے ہیں۔

حلوہ خوری

حلوہ پکانے کی جو دلیل دی جاتی ہے وہ یہ کہ اسی رات کو رسول اللہ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے تھے اس لئے آپ نے حلوہ تناول فرمایا تھا۔ لہٰذا آپ کی اتباع میں ہم بھی حلوہ پکاتے اور کھاتے ہیں۔

حلوہ خوری کے لئے کس طرح عوام کو بے وقوف بنایا گیا ہے؟ سنئے اور تعجب کیجئے۔ آپ کے دندان مبارک غزوہ احد میں شہید ہوئے ہیں، اور سارے علماء اس پر متفق ہیں کہ احد کی جنگ شوال میں ہوئی ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کی دانت شہید ہو رہا ہے شوال میں اور حلوہ کھایا جا رہا ہے پونے دو ماہ پہلے شعبان میں یہ آپ سے محبت ہے یا آپ کے ساتھ مذاق ہے؟ یہ بات اس بنیاد پر عرض کی جا رہی ہے جب یہ مان لیا جائے کہ آپ نے اس موقع سے حلوہ کھایا تھا۔ حالانکہ اس کا اثبات جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

پھر اس پہلو پر غور فرمائیں کہ جس کا دانت ٹوٹا ہوا اور مسوڑھا زخمی ہو اس کو حلوہ نہیں کھلایا جائیگا بالفرض اگر کھلایا بھی جائیگا تو ایسا حلوہ ہوگا جو زبان پر رکھتے ہی نیچے اتر جائے چبانا نہ پڑے۔ لیکن ہمارے احباب ایسا سخت حلوہ تیار کرتے ہیں کہ بے دانت والا کیا کھائیگا؟ دانت والا بھی اگر کھائے تو اس کا دانت ٹوٹ جائے۔ ہتھوڑے سے پھوڑ کر کھانا پڑتا ہے۔ معلوم نہیں محبت اور اطاعت کی یہ کون سی قسم ہے؟

روحوں کی آمد

مسلم معاشرے کے ایک بڑے طبقہ میں ایک غلط اور باطل عقیدہ پھیل گیا

ہے یا پھیلا دیا گیا ہے کہ پندرہویں شعبان کی رات میں مردہ رشتہ داروں کی روحیں آتی ہیں لہذا ان کے استقبال میں گھروں کی صفائی ستھرائی ہوگی، اگربتی سلگائی جائیگی، عمدہ عمدہ کھانے پکائے جائیں گے۔ مردوں کے نام بخشے جائیں گے اور نہ جانے کیا کیا خرافات ہوتی ہے۔ میرے بھائیو: روحوں کی آمد کا عقیدہ بے بنیاد اور باطل ہے اس کا کوئی ثبوت قرآن وحدیث میں نہیں ہے بلکہ اسکی نفی ثابت ہے۔ قیامت کے دن کفار ومشرکین جب اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ دیکھیں گے تو اللہ تعالی سے بطور معذرت کہیں گے۔ ہم سے غلطی ہوئی اے اللہ ہمیں دوبارہ دنیا میں لوٹا دے اب شرک نہیں کریں گے بلکہ نیک عمل کریں گے۔ اللہ تعالی انکار کریگا اور ان کے جواب میں فرمائے گا:

﴿حَتَّى إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ، لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحاً فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ (مومنون:۹۹،۱۰۰)

ترجمہ: یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آجائیگی تو کہنا شروع کردے گا، اے میرے رب مجھے (دنیا میں واپس بھیج دے تاکہ مین وہ نیک عمل کرلوں جو میں چھوڑ کر آیا ہوں (جواب ہوگا) ہرگز نہیں: یہ تو بس (منہ کی) ایک بات ہے جس کو وہ کہہ رہا ہے۔ ان مرنے والوں کے پیچھے ایک آڑ ہے جو دوبارہ زندہ کئے جانے کے دن تک رہے گا۔

دیکھئے اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ لوگ دنیا میں واپس آنیکی اللہ تعالی سے درخواست کریں گے لیکن اللہ تعالی انکار کردے گا کہ اب دنیا میں واپس نہیں جاسکتے۔ قرآن کریم تو دنیا میں آنیکی نفی کرتا ہے اور ہمارے احباب کو پتہ نہیں کیسے

معلوم ہو گیا کہ روحیں اپنے زندوں سے ملاقات کیلئے آتی ہیں اور وہ بھی ہر سال آتی ہیں (استغفر اللہ)

قبروں کی زیارت

قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے، صحیح حدیثوں سے ثابت ہے، زیارت کی دعائیں بھی نبی ﷺ نے بتائی ہیں اور صحیح سندوں سے ثابت ہیں۔ اسکی علت بھی حدیث میں بتا دی گئی ہے، یعنی زیارت قبور سے خود اپنی موت یاد آتی ہے اور جب آدمی یہ یاد کرے گا کہ ایک دن مجھے بھی اسی مرحلے سے گذرنا ہے اور قبر کی تاریکی میں جانا ہے تو بلا شبہ اس پر رقت طاری ہوگی دل نرم ہوگا اور اعمال صالح کی کوشش کرے گا۔ اس لئے احادیث کی روشنی میں قبروں کی زیارت سنت اور باعث اجر وثواب ہے۔

لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے مسنونات اور عبادات پر اپنا سماجی رنگ چڑھا کر اس کو رسم ورواج بنا دیا اور اصلاً جو چیز باعث ثواب تھی اسکو باعث عذاب بنا دیا۔ ہمارے طرز عمل نے اسے سنت کے دائرے سے نکال کر بدعت کے کھاتے میں ڈال دیا۔ سال کے کسی دن اور کسی رات ہمیں قبرستان جانے اور مردوں کے لئے دعا کرنے کی توفیق نہیں ہوتی اگر گئے بھی تو اس وقت جب کسی میت کو دفن کرنا ہوا تب ورنہ عام حالات میں ہمیں توفیق نہیں ہوتی۔ لیکن شعبان کا مہینہ آنے سے پہلے ہی پوچھنا شروع کر دیں گے شب براءت کس دن ہے؟ چودھویں تاریخ کو صبح سے ہی نہانے دھونے اور ماجنے چمکانے کا کام شروع ہو جائیگا کتنے شرابی ہیں جو دانت مانجھ مانجھ کر مسوڑھا پھوڑ ڈالتے ہیں۔ پندرہویں شعبان کی رات بعض شہروں میں فقیروں کا بازار لگتا ہے اور دعوت کا ایک لقمہ کھانے کے لئے باقاعدہ مول تول ہوتا ہے تب

کہیں جا کر فقیر دعوت کا لقمہ اٹھاتا ہے ایک لقمہ کھا کر پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ جاتا ہے دانت کھودتا رہتا ہے اور ڈکار لیتا رہتا ہے۔ پھر دوسرا اور تیسرا اگر ایک آئیگا اور مول تول کر کے اپنے گھر لے جائے گا۔ فقیر ایک لقمہ کھائے گا اور پھر آ کر اپنی جگہ بیٹھ جائیگا۔ یہ حال ہے ہمارے مسلمان بھائیوں کا۔ شرابی، کبابی اور جواری فقیروں کو پیسہ دیکر ایک لقمہ کھانا کھلائیں گے اور اس کے بدلے روحوں کو بخشوائیں گے۔ اللہ بچائے اس گمراہی سے۔

ہم آپ کو یہ بتا رہے تھے کہ سال میں کسی دن ہمیں قبرستان جانیکی توفیق نہیں ہوتی صرف ''شب براءت'' ایک ایسی رات ہے کہ اس رات قبرستان کی صفائی کی جاتی ہے، اس کو اگربتیوں سے معطر کیا جاتا ہے، لائٹ اور قمقموں سے چراغاں کیا جاتا ہے اور مغرب کے بعد ہی سے زرق برق لباس میں ملبوس ہو کر جوق در جوق قبرستان جائیں گے، کتنے ایسے اللہ کے بندے ہیں جو سال بھر ٹوپی نہیں لگائے ہوں گے مگر شب براءت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے ٹوپی ضرور لگائیں گے۔ بعد نماز مغرب غول در غول قبرستان جانیکا زبردست اہتمام کیا جاتا ہے، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اتنا اہتمام کسی فرض نماز کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ایک بار موسم خراب تھا مغرب کے بعد بارش شروع ہوگئی اور ہوا کے ساتھ زبردست بارش ہوئی اور دیر تک ہوتی رہی جو قبرستان کیلئے نکل چکے تھے ان کو تو بھیگنا ہی تھا جو نہیں نکلے تھے وہ بھیگنے سے بچ سکتے تھے لیکن بارش سے خوف کھائیں تو مردوں سے محبت کیسی؟ آندھی ہو یا بارش، شب برات کے دیوانوں کو کون روک سکتا تھا قبرستان سے واپس آنے والے تو بھیگ ہی رہے تھے جانے والے بھی بھیگتے ہوئے جا رہے تھے۔ فرض نماز ہر دن پانچ بار ہے اس لئے اس کا کون اہتمام کرتا ہے اور شب برات سال

مَیں ایک دن ہے اس لئے چھوٹنے نہ پائے۔ کیوں اتنا اہتمام ہے اس کی بنیاد کیا ہے۔اس کو سن لیجئے جامع ترمذی کی ایک ضعیف ترین روایت ہے۔ یہ روایت مَیں سند اور متن کے ساتھ سنا دیتا ہوں اور اس کی سند میں جو ضعف ہے اسکو بھی بتا دیتا ہوں پھر آپ خود فیصلہ کرلیں کہ یہ حدیث قابل حجت ہے یا نہیں؟

حَدَّثَنَا أَحمَدُ بنُ مَنِيعٍ نا يَزِيدُ بنُ هَارُون نا الحَجَّاجُ بنُ أَرْطَاةَ عَن يَحيَى بنِ ابى كَثِيرٍ عَن عُروةَ عَن عَائِشَةَ قَالتُ فَقَدتُ رسولَ اللّٰهِ ﷺ لَيلَةً فَخَرَجتُ فَاذَاهو بِالبَقِيع فَقَالَ أَكُنتِ تَخَافِينَ أَن يَحِيفَ اللّٰهُ عَلَيكِ وَرَسُولُه قُلتُ يَا رسولَ اللّٰه ظَنَنتُ أَنَّكَ أَتَيتَ بعضَ نِسائِكَ فَقَال إِنَّ اللّٰه تَبَارَكَ وَ تَعَالَى يَنزِلُ لَيلَةَ النصفِ مِن شَعبان إِلَى سَماءِ الدُّنيا فَيَغفِر لِأَكثَرَ مِن عَددِ شَعرِ غَنَمِ كلبٍ۔

(جامع ترمذی، صوم، باب ما جاء فی لیلۃ النصف من شعبان۔ (تحفہ ج۲ ص۵۲)

ترجمہ: امام ترمذی کہتے ہیں کہ ہم سے احمد بن منیع نے بیان کیا ان سے یزید بن ھارون نے ان سے حجاج بن ارطاۃ نے بیان کیا اور وہ روایت کرتے ہیں۔یحی بن ابی کثیر سے وہ عروہ سے اور وہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک رات میں۔نے رسول اللہ ﷺ کو (اپنے بستر پر) نہیں پایا تو میں نکلی (آپ کو تلاش کرنے) تو کیا دیکھتی ہوں کہ آپ بقیع میں ہیں۔آپ نے فرمایا: عائشہ کیا تم اس بات سے ڈرتی ہو کہ اللہ اور اس کے رسول تم پر ظلم کریں گے۔میں نے کہا: اللہ کے رسول میں یہ سمجھی کہ آپ اپنی کسی اور بیوی کے پاس چلے گئے ہیں۔

پھر آپ نے فرمایا: سنو: نصف شعبان کی رات کو اللہ تعالی آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور قبیلہ بنو کلب کی بکریوں کے بال کی گنتی سے زیادہ لوگوں کو بخشتا ہے۔

یہ تو ترجمہ ہوا۔ اس کے بعد امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی سند پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال ابو عیسی حدیث عائشہ لا نعرفہ الا من ھذا الوجہ من حدیث الحجاج و سمعت محمداً یقول یضعف ھذا الحدیث و قال یحی بن کثیر لم یسمع من عروۃ والحجاج لم یسمع من یحی بن ابی کثیر۔

ابو عیسی یعنی امام ترمذی کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ کی مذکورہ حدیث حجاج کے واسطے سے آئی ہے اور امام بخاری سے میں نے سنا وہ اس حدیث کو ضعیف کہتے تھے اس کی تین وجہ ہے۔

یحییٰ بن ابی کثیر نے عروۃ سے نہیں سنا ہے۔ اور حجاج نے یحی بن ابی کثیر سے نہیں سنا ہے۔ لہٰذا سند میں دو جگہ انقطاع ہے۔ تیسرا ضعف یہ ہے کہ حجاج مدلس راوی ہیں اور مدلس کا عنعنہ معتبر نہیں ہے اور یہاں حجاج ''عن'' سے روایت کر رہے ہیں، اور سماع کا ثبوت نہیں ہے لہٰذا ان تین وجہوں سے یہ حدیث قابل حجت نہیں ہے۔ آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جس روایت میں تین تین ضعف پایا جاتا ہو وہ کبھی قابل استدلال ہو سکتی ہے؟ پھر اگر آپ استدلال کرنے پر مصر ہیں تو مؤدبانہ گذارش ہے کہ نبی ﷺ کا اسوہ اختیار کیجئے۔

(۱) نبی ﷺ تنہا گئے تھے آپ جھنڈ بنا کر کیوں جاتے ہیں؟

(۲) نبی ﷺ تنہا گئے تھے حضرت عائشہ کو بھی نہیں پتہ چلا۔ آپ تیاری کر کے، چراغاں اور آتش بازی کے ذریعہ ہنگامہ کر کے کیوں جاتے ہیں؟

(۳) نبی ﷺ زندگی میں ایک بار گئے تھے آپ ہر سال کیوں جاتے ہیں؟

(۴) نبی ﷺ رات کے کسی حصہ میں گئے تھے آپ مغرب کے بعد فوراً کیوں

جاتے ہیں؟ پہلے آپ کو بتایا گیا ہے کہ زیارت قبور سنت ہے لہذا اگر آپ سال کے اور دنوں میں قبرستان جاتے ہیں اور مردوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں تو اس دن بھی جایئے آپ کو منع نہیں کیا جاتا لیکن واحد حاضر جمع غائب کی شکل اختیار کرنا اور پھر آمدورفت میں جماعت بندی اور چراغاں یہ ساری چیزیں اسوۂ رسول سے میل نہیں کھاتیں۔ ایک جائز چیز کو ہم نے اپنے طرز عمل سے ناجائز اور سنت کو بدعت بنادیا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیکیوں پر عمل کرنے کی توفیق دے اور بدعات وخرافات سے محفوظ رکھے۔ آمین

☆☆☆